

مدیر

نسیم سندیلوی

ماہنامہ

اضطراب لکھنؤ

علمی۔ ادبی۔ معاشرتی و اخلاقی رسالہ

جلد نمبر ۔ شمارہ نمبر

مدیر
نسیم سندیلوی۔ بی۔ اے۔ آنرز

چندہ سالانہ عگار — فی پرچہ ۳ر



جولائی سنہ ۴۰ء

اضطراب

جلد [illegible] | جولائی سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر [illegible]

ایڈیٹر [illegible]

ہم اور آپ

ان حضرات کا احسان مند ہوں جنہوں نے "اضطراب" کو اپنے بہترین مضامین سے تسکین دی اور اس میں علم و ادب کی روح پھونک کر میری ہمت افزائی فرمائی۔ میرے خیال میں میری پہلی کوشش نہایت درجہ کامیاب رہی۔ مگر اس کا سہرا ان محبان علم و ادب کے سر ہے جنہوں نے میری اس چیز کو کامیاب کرنے کی کوشش کی اور نمایاں معاونت فرمائی۔

ہر راہ کی پہلی منزل نہایت درجہ تشویش کن ہوتی ہے خصوصاً راہ ادب میں پہلا قدم امید و ناامیدی کی کشمکش کا سچا نمونہ ہے۔ امید ایسی کہ اس کی پرواز عرش اعلیٰ تک پہونچنے کے لیے بیتاب ہے اور ناامیدی یہ کہ میرے محبان علم و ادب کہیں پہلی ہی منزل پر ساتھ نہ چھوڑ دیں اور میں "اضطراب" کو دل کی گہرائیوں میں دبائے بے یار و مددگار رہ جاؤں۔

دراصل "اضطراب" کا مستقبل آپ ہی لوگوں کے ہاتھ ہے۔ آپ ہی لوگوں پر بھروسہ رکھتے ہوئے میں نے منزل مقصود کی طرف قدم اٹھانے کی ہمت کی۔ جہاں تک ممکن ہو سکا مشاہیر کی خدمت میں خود جا کر دست سوال دراز کیا بہتوں نے ہمت دلائی اور مدد کا وعدہ کیا چند حضرات نے راستہ کی دشواریاں سمجھائیں اور اکثر نے بوجہ مصروفیت معذرت چاہی مگر میں نے ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ امید و ناامیدی کو ساتھ لے کر میدان عمل میں قدم بڑھایا ؎

"ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم"

اس ماہنامہ کو سیاسیات سے بالکل الگ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ یہ سیاسی کشمکش سے بچ کر ادبی، معاشرتی، اخلاقی و اصلاحی خدمات انجام دے سکے۔

ہمارا ادبی معیار گر گیا ہے چند حیوانی خواہشات کو ابھارنے والے افسانوں اور مضامین میں الجھ کر علم و ادب سے کوسوں دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کو سلجھانے کے لیے میری واحد ناچیز ہستی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ یہ کام بغیر علم دوست حضرات کی توجہ کے سرانجام نہیں پا سکتا۔ افسانہ نویسی بھی ادب کا ایک بہت بڑا جزو ہے اور جو موثر خدمات ادب اردو کو اس کے ذریعہ سے پہونچ سکتے ہیں وہ نہایت زود اثر اور کارآمد ہیں۔ اگر ہم اپنے اخلاق و معاشرت کو چھوڑ کر خیالی دنیا کی سیر کرنے لگیں تو یہ کب تک اور کہاں تک۔ ہم کو چاہیے کہ ہم اپنی معاشرت اور اخلاق پر گہری نظر رکھیں تاکہ ہمارا ادبی معیار ذلت و رسوائی سے بچ کر ادب کی اگلی صف میں آ کھڑا ہو۔

اس اظہار کو رواج دینے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اخلاق و معاشرت کے پس پردہ بھاگ مَتی کا پٹارہ کھول دوں۔ سوسائٹی کی دلچسپی کی خاطر کوک شاستر کے ہر پہلو پر ایک رنگین تبصرہ پیش کر دوں۔ راز و نیاز کی داستان کو رات کی گہرائیوں میں پڑھنے اور لطف اٹھانے کا موقع دوں بلکہ میرا مقصد ہر مرد و عورت اور بوڑھے و بچے میں پاکیزہ و سچے جذبات کو ابھارنا ہے۔ ان سوئے ہوئے جذبات کو جو نفسیات کی اصلاح کر سکیں جو بوڑھوں کو جوان نہ بنا سکیں بلکہ ان کو دنیا کی نیرنگی و بے ثباتی کا پتہ بتائیں۔ جو ہمارے نوجوانوں میں جوانی کی یاد دلانے کے بجائے سماجی و اخلاقی روح پھونکیں۔ جو ہماری بہنوں کو سنیما گھروں، ریل گاڑی اور ہائڈ پارک کی سیر نہ کرائیں۔ بلکہ ان کے دلوں کو پاکیزہ محبت کے زیور سے آراستہ کریں۔ ان کی زندگی کے معیار کو بلند کریں اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ وہ صرف "عورت" نہیں بلکہ خدا کی وہ عظیم ترین مخلوق ہیں جن پر دنیا کا دار و مدار ہے۔

عریاں اشتہارات جو دماغی و اخلاقی پاکیزگی پر برا اثر ڈالتے ہیں اور جو شریف گھروں میں پہونچ کر نیک بیویوں پر بار خاطر گزرتے ہیں۔ ایسے بازاری اشتہارات بیدخل کر دیے گئے ہیں ان کو خارج کر کے مالی نقصان ضرور ہوگا لیکن مجھے کامل امید ہے کہ میں اس خسارہ کو پرچہ کی اشاعت اور خریداری بڑھا کر پورا کر سکوں گا۔ رسالہ کی ترتیب میں اس بات کی

ہماری کوشش کی گئی ہے کہ یہ خاندان کے تمام افراد کے لیے یکساں دلچسپ ہو۔ بہت سے گھرانے ایسے ہیں جو مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے الگ الگ رسالہ نہیں منگا سکتے۔ "اضطراب" مردوں میں ادبی ذوق۔ عورتوں میں حق گوئی اور دلعزیزی اور بچوں میں سچائی کی لہر دوڑا کر مقبولِ عام ہونے کی کوشش کرے گا ساتھ ہی ساتھ معلم اکثر اس کے صفحات جو خاص طور پر ترتیب دیے گئے ہیں معلومات میں اضافہ کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ پرچہ ہر طبقہ میں مقبول ہوگا۔

مشاہدات

امیر زادے تو زمین پر پیر ہی نہیں دھرتے۔ یہ غرور۔ یہ تکبر۔ یہ طرہ۔ الامان الحفیظ جیسے یہ حضرت آدم کی اولاد سے ہیں ہی نہیں۔ اینٹھے جاتے ہیں سیدھے قدم نہیں دھرتے بات بات میں خود غرضی۔ خودستائی۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی دنیا ہی الگ ہے۔ ننگوں بھوکوں کی بستی سے دور۔۔۔۔ بہت دور۔ ان کی راتوں کو تاروں کی جگہ بجلی کے قمقمے روشن کرتے ہیں۔ ان کی نیند فطری نہیں ہوتی بلکہ جام و سبو کا خواب ہوتا ہے۔

ایک صاحب چوڑی بازار سے گزر رہے تھے منہ سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے۔ پان کی گلوری گال میں دبائے۔ بال بنائے۔ آڑی ٹوپی لگائے۔ اٹھلاتے۔ اینٹھتے سنتے۔ ایک ہاتھ سے رومال سے سگاں ٹھ کے پوڑے۔ ساتوں سنگار کیے چلے جا رہے تھے۔ لوگ چلتے انھیں ایک نئی طرز سے دیکھتے اور وہ منہ پھیر لیتے۔ ان حضرت کی نگاہیں کوٹھوں کی سیر کر رہی تھیں اور دماغ سے میں کمائی ہوئی رقم کا تخمینہ کر رہا تھا۔ "دس ہزار کے روپے کے نوٹ پر تین دو ہزار کا نقصان ہوگا۔ منی جان کی سنہرے کورنگی ہار کی فرمائش کل پوری کی جا سکے گی اس وقت مجھے جاتے شرم نہ لگی میں تا بہ پیاس کے ساتھ فاتحانہ انداز سے بیٹھ سکوں گا۔۔۔۔"

سیٹھ جی پان کی دوکان پر کھڑے تھے تمباکو کی عادت تھی گزشتہ دو گھنٹے تک بیٹھا انتظار کرتے تھے سیٹھ جی کو آتے دیکھا تو دوکان سے ہٹ کر ننگی کو کھڑے ہو گئے۔

"چوڑی بازار کی سیر ہو رہی ہے۔ یہ گل چھرے اڑائے جا رہے ہیں۔۔" سیٹھ جی نے سوالیہ انداز میں نسیم کے سلام کے جواب میں کہا۔

"سیٹھ صاحب ابھی کام پر سے آ رہا ہوں تمباکو کھانے کو کھڑا ہو گیا تھا۔"

"اچھا تو پھر اب تمباکو ہی کھاتے رہیے کل حساب سمجھا دیجیے گا۔ چوڑی کی سیر کام سے اچھی ہے"

کاش کہ دنیا میں لوگ اپنے عیوب کو ہنر نہیں عیب سمجھتے اگر برائی کرتے تو اس کو برا سمجھتے اور کچھ نہیں تو تھوڑی دیر گردن نیچی کر کے اپنے افعال پر نادم ہی ہو لیتے۔ برائی کو اچھا سمجھنے والے کون ہیں؟ وہی اونچے اونچے محلوں میں رہنے والے جو خدا کے بندے نہیں بلکہ بندۂ زر ہیں۔ جو دوسروں کو ذلیل اور اپنے کو سب سے بڑھ چڑھ کر سمجھتے ہیں۔ جو غریب و شکستہ نازک دل رکھنے والی جانوں پر سیدھی اور ترچھی نگاہ ڈال کر اپنے نفسِ امارہ کو تسکین دیتے ہیں۔ اُن سے پوچھیے کہ اگر کوئی ان کی بہو اور بیٹیوں پر بُری نظر ڈالے تو شاید اس کی جان ہی لے لیں۔ کتوں سے نچوا دیں۔ اگر وہ "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کا کچھ بھی خوف کریں تو پھر انسان ہی کیوں نہ کہلائیں۔

کھاتے پیتے غریب پیٹ کے مارے راہ چلنے کو بدچلن آوارہ اور بدمعاش کہہ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں "وہ گھر میں آنے کے قابل نہیں۔ اس کو فوراً نکال دو۔ کہیں چوری نہ کروا دے۔ ڈاکہ نہ ڈلوا دے۔ بدمعاش کہیں کی۔" اگر کسی غریب کو ذرا گلی یا تلہ دیکھتے ہوئے دیکھ پاتے ہیں تو غنڈہ، شہدہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں۔ نوکری سے برطرف کر دیتے ہیں پیٹ کا مارا در بدر خاک چھانتا ہے کوئی روادار نہیں ہوتا۔ آپ رات بھر الو کی طرح گھومنے کو زیب دیتے پھریں سینما گھروں کی سیر کریں ناچ گھروں کو رونق دیں۔ شب کی تاریکیوں میں بدفعلیوں میں وقت گزاریں اور پھر بھی شریف زادے کہلائیں۔ ناک والے۔ یہ ہے دنیا اسی کو دنیا کہتے ہیں۔

وقار۔ عزت۔ رعب۔ دبدبہ یہ سب پیسہ کے دوسرے نام ہیں۔ غریب ضرورت سے مجبور ہو کر کنویں پر پانی بھرنے جائے، بازار سے سودا خرید لائے تو بدچلن آوارہ ہے۔ امیر زادے پارک، سینما اور ناچ گھروں میں اٹھکھیلیاں کریں تو راج دلارے۔

مل کی گرد اور حسن کی دیوی کہلائیں۔

وہ چیز جو خوب صورت ہو، نہ صرف ضرورت بھی جاتی ہے، افسوس انسان کو بات بات پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں، وہ بھی ... جائیں۔ ... غریبوں کے لیے ہیں۔ غریب ہی پابندیاں ... امیر انسان نہیں فرشتے ہیں ان کا احترام باوجود ان کی ... زندگی کے ضروری ہے۔

کیوں؟۔

کیا ہمارا تمدن اتنا گر گیا ہے۔ ہماری معاشرت اتنی بدل گئی ہے کہ پیسے کے فرق کے علاوہ زندگی کے قانون میں بھی نمایاں تبدیلی کرنی ہو گی۔ غریب کے لیے ہر چیز ناجائز قرار دی جائے گی اور امیر کو اس کی مرضی پر چھوڑ دینا ہو گا؟

السید ... ابوالقاسم

؟

نہ پیہم صبح تیرا اضطراب

[illegible] بے خودی سے شوق بے حجاب

[illegible] زندگی ہو

کیا ہے اب زندگی [illegible] عذاب

[illegible] نیند میں [illegible]

مجیب

رباعی

[illegible] اور انتخاب

[illegible] اندازہ [illegible] گلاب

باغ اور [illegible] مضطرب

شاید اسی خاطر [illegible] اضطراب

[illegible]

عشق سوچا کیا جواب ترا

عالیجناب سید احتشام حسین صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

یہ جمال اور یہ شباب ترا — دل سے ممکن نہیں جواب ترا

دیکھ کر روئے بے حجاب ترا — عشق سوچا کیا جواب ترا

بھر گئی کائنات نغموں سے — کیا کہیں چھڑ گیا رباب ترا؟

آ! حقیقت بھی سامنے آجائے — یوں تو دیکھا بہت سے خواب ترا

زہر کا گھونٹ بن گئی تھی شراب — ہائے اُس دن وہ اجتناب ترا!

پھٹ پڑی ہے بہار دُنیا پر — کیا اُٹھا گوشۂ نقاب ترا؟

ہائے در پردہ مہر کی وہ نظر — اور دکھانے کو وہ عتاب ترا

عشق وارفتہ سر کے نالوں پر — آج خود ہنس پڑا شباب ترا

دل میں شمعیں ہزار جل اُٹھیں — کیا تبسم تھا کامیاب ترا!

یہی کونین کو سنبھالے ہیں — میری دیوانگی شباب ترا

ڈوبتی روح کو سنبھال گیا
وقت رخصت وہ اضطراب ترا

ادب اور زندگی

جناب احمد علی صاحب پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

ادب زندگی کا آئینہ ہے یہ جملہ اب ادبی استعمال میں آچکا ہے لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا ادب واقعی زندگی کا عکس ہے؟ کیونکہ اور کیسے؟ یہ سوال ہیں جو ہمارے سامنے پیش آتے ہیں۔ اردو تنقید میں تو میں کہہ نہیں سکتا کہ اس قسم کی کوئی بحث ہوئی ہے یا نہیں — غالباً نہیں کیونکہ اردو میں جو کچھ تنقید ہے وہ یا تو دقیانوسی ہے یا سہل اور بے معنی۔ بہت سے نقاد ایسے ہیں جو اس بات کے ماننے پر قطعاً تیار نہ ہوں گے۔ لیکن مغرب کے نقاد اس مسئلہ پر کافی بحث کر رہے ہیں۔ وہاں دو قسم کے نقاد ہیں: ایک تو وہ جو موجودہ اقتصادی اور سیاسی نظام یعنی سرمایہ داری کے داعیوں اور ماننے والوں میں سے ہیں اور پرانی روایتی ادب اور تنقید کو اپنی دنیا میں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اس لیے وہ اس اسکول کو جو کارل مارکس کے فلسفہ پر اپنی تنقید اور ادب کو مبنی کرتا ہے ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔

دوسرا اسکول اُن لوگوں کا ہے جو اپنے تجربہ اور دنیا کی موجودہ رفتار کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ سرمایہ داری کے نظام میں اب گھن لگ چکا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ ہم کو اور پیچھے کی طرف کھینچتا ہے، اور کسی طرح ہمارے تمدن کو ترقی نہیں دے سکتا بلکہ مکمل تمدن کو مسمار کر دینے پر آمادہ ہے جیسا کہ فاشسٹ جرمنی میں تمدن کے خلاف موجودہ جہادت ظاہر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف ایک نئی اشتراکی سوسائٹی میں ہی ادب اور تمدن، بلکہ آرٹ اور ہماری زندگی پوری طرح سے پھل پھول سکتے ہیں۔ کیونکہ سوشلزم بجائے انسان کے اچھے تعلقات کو ختم کرنے یا کچلنے کے (جیسا کہ موجودہ سرمایہ داری نظام میں ہو رہا ہے جہاں مزدوروں کا گلا کاٹا جا رہا ہے اور معدودے چند رہے ہیں۔ انسان کی محنت اور دولت سے سارا عیش و آرام اٹھا رہے ہیں) زیادہ انسانیت پسند اور آزاد کر دیتا ہے۔

پہلے اسکول کے نقاد اپنی تنقید کو اپنے یعنی بورژوا ادب پر مبنی کرتے ہیں۔ لیکن یہ ادب صرف انسانیت کے ایک طبقہ دکھاتے ہیں طبقہ اور اس لیے زندگی کے صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سرمایہ داری نظام کا ادب بالکل مہمل اور خراب ہے، اور اسی طرح سے نقاد بھی خراب اور مہمل ہیں۔ نہیں۔ لیکن بورژوا ادب اور نقاد زندگی کے ایک اہم پہلو اور انسانیت کے بیشتر حصہ کو اپنی دنیا سے نکال دیتے ہیں اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کا نقطۂ نظر صرف ایک جماعت اور اس کے خیالات پر مبنی ہے، اور وہ جماعت متوسط طبقہ ہے۔ نقاد بجائے اس ادب میں اس جماعت کی موت کے احساس کے صرف اس کی اچھی باتوں پر نظر ڈالتے ہیں اور دوسری باتوں یعنی سرمایہ داری کی برائیوں پر جو اس ادب میں جھلکتی ہیں، بالکل غور نہیں کرتے۔

دوسرے اسکول کے نقاد سرمایہ داری نظام کے ادب کو مردہ تصور کرتے ہیں اور اس کے اندر موت کے جراثیم پاتے ہیں۔ اور یہ وہ مزدور جماعت کے ادب کو ترقی پسند قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس جماعت میں جان ہے، اور یہ ادب مظلوم انسانیت سے متعلق ہے۔ یہ اسکول زندگی اور سماج کو ایسی چیز تصور کرتا ہے جس میں ہر وقت تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ یہ لوگ اپنی تنقید میں سماج اور انسان پر اور بہ نسبت روح یا روحانیت کے مادہ پر زیادہ زور دیتے ہیں کیونکہ بغیر مادہ کے روحانیت وجود میں نہیں آسکتی۔ علاوہ بریں چونکہ دنیا کی ہر چیز میں زندہ رہنے کے لیے حرکت ضرور پائی جاتی ہے اس لیے وہ اس اصول پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ بہرحال یہ فلسفہ کا ایک مسئلہ ہے جس پر میں اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتا۔

اس وقت تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے۔

یہ ہم کو معلوم ہے کہ ادب کی بنیاد زندگی پر ہے۔ اور جیسی زندگی ایک قوم یا ملک کی ہوتی ہے ویسا ہی اُس کا ادب بھی ہوتا ہے۔ زندگی کے معنی محض جینا ہی نہیں ہیں۔ زندگی میں اور بہت سی باتیں شامل ہیں۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں، جو کچھ ہم سوچتے ہیں۔ جو کچھ ہم کرتے اور سوچتے ہیں زیادہ تر مبنی ہوتا ہے ہمارے ماحول پر۔ اور ہمارا ماحول خود ڈھلتا اور بنتا ہے ہمارے اقتصادی، سیاسی اور سماجی احساسات اور کیفیات سے۔ ہر زمانہ میں اُس زمانہ کے پیداوار کے طریقے ماحول پر اپنا اثر ڈالتے ہیں، اور اس کی شکل بدل دیتے ہیں۔ اس لیے پیداوار کے طریقے انسان کی زندگی پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔

ادب بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دراصل ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ چونکہ زندگی ماحول پر مبنی ہے اس لیے ادب بھی اُس خاص ماحول کا عکس ہوتا ہے —— یعنی ادب بھی پیداوار کے طریقوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا اور شکل بدلتا رہتا ہے۔

ہر زمانہ کے مسائل اور اس کی ضروریات اُس سے پہلے اور اُس کے بعد کے زمانہ سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر زمانہ کا ادب ایک خاص رنگ رکھتا ہے یعنی ادب کی صنعت ہمیشہ ایک سی نہیں رہ سکتی، کیونکہ صنعت نتیجہ ہے مصنف کے اُن احساسات کا جو زمانی روش پر مبنی ہیں اور روش ماحول سے ہوتی ہے۔ چنانچہ الف لیلہ اور قصہ چہار درویش اپنے زمانہ کا پورا اور مکمل عکس ہو سکتے تھے، اور اس کی صنعت صرف اسی قسم کی ہو سکتی تھی جیسی ہے۔ لیکن اب چونکہ ہمارے ماحول میں اُس زمانہ کی نسبت زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے، وہ ہرگز اس زمانہ کے صحیح ترجمان نہیں ہو سکتے۔ اب تو ہم یا تو ناول یا افسانہ یا اور اسی قسم کی صنعت کے ذریعہ اپنے زمانہ کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ لیکن ناول نویسی کی صنعت میں بھی بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ مولانا شرر کے تاریخی ناول اب ہمارے زمانہ کی ضرورت کے لیے نمونوں میں سے اب ظلوراً اور هلوز ناکے قصہ نہیں بلکہ ایک اور ہی قسم کی ناول نویسی کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ ناول نویسی جو ہماری زندگی کے مسائل کو پیش کرے اور نہ کہ اُن سے آنکھ چرائے اور تو ہم پرستی میں پناہ لے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آج کل تاریخی ناول بالکل نہیں لکھے جا سکتے۔ لیکن تاریخی ناول صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب قصہ ہماری زندگی کے لیے مفید ثابت ہو اور اُس کے کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالے۔

آج کل ہمارے مسائل بنیادی مسئلے نہیں ہیں بلکہ سرمایہ داری اور سامراجی زمانہ کے ہیں۔ اب جو جماعتیں اہمیت رکھتی ہیں وہ کھاتی پیتی، سرمایہ والی جماعتیں نہیں ہیں، بلکہ غریب انسان ہیں، مزدور اور کسان جو محنت اور مشقت سے روٹی کماتے ہیں، جن پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کی نہ صرف نگاہیں گڑی رہتی ہیں بلکہ جو ان کو مشینوں کی طرح استعمال کر کے دھن دولت جمع کرتے ہیں، صرف اپنے استعمال کے لیے نہیں بلکہ سرمایہ کو دوگنا اور چوگنا کرنے کے لیے اور غریب انسانوں کو غربت اور مصیبت میں سڑانے کے لیے۔

اس لیے ہمارے زمانہ میں جو ادب جان رکھ سکتا ہے وہ ایسا ادب نہیں ہوگا جو خوابوں یا تصوف میں پناہ لے، بلکہ وہ ادب جو زندگی سے آنکھیں ملانے کی ہمت رکھتا اور اس کے تمام اہم مسائل پر غور اور بحث کرے۔ اور دراصل وہ ادب جو خوابی ہے کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر الف لیلہ اُس زمانہ کے لوگوں کی زندگی کو ظاہر نہ کرتی تو وہ آج زندہ نہ رہتی۔ لیکن اس کتاب میں اُس زمانہ کے سماج کا پورا عکس ملتا ہے، اور یہ کتاب مرنے والی نہیں۔

ہمارے یہاں جو قصے اور کہانیاں آج کل زیادہ تر لکھے جا رہے ہیں حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے، اور نہ صرف بیکار اور بے معنی ہیں، بلکہ مردہ بھی۔ اور جب تک کہ ہم لوگ زندگی کے نزدیک کر اس کے بارے میں نہ لکھیں گے کبھی کوئی زندہ رہنے والا ادب پیدا نہیں کر سکتے۔

ایک طرف ہم سامراجی اور فیشزم کے بڑھتے ہوئے زور کو دیکھ رہے ہیں جو انسان کو ایک اندھیری کوٹھری میں بند رکھنا چاہتے ہیں جہاں تمدن اور علم اور آرٹ کی جھلک کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ دوسری طرف جنتا ہے جو اپنے حقوق کے لیے لڑائی پر آمادہ ہے، اور جس نے کم از کم روس میں تو جیت حاصل کر لی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فیشزم اور سامراج کو چونکہ اپنی موت کا احساس ہو گیا ہے، اس لیے وہ انسان کے دماغ کی بہترین پیداوار یعنی آرٹ، اور زندگی کے بہترین احساس یعنی تمدن کو ہم سے دور رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ کہیں ہم ان زندہ اور ترقی پسند چیزوں کی جھلک دیکھ لیں اور اُن کی طرف بڑھیں اور فیشزم اور سامراج کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیں۔

بحیثیت مصنف اور آرٹسٹ ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس چیز کا ساتھ نہ دیں جو موت کے گلے بھگ ہے بلکہ اس کا جس کے اندر زندگی کی موج لہریں لے رہی ہے۔ وہ جماعت جو اب تک پیروں کے نیچے کچلی جا رہی تھی لیکن جو اب بیدار ہو گئی ہے اور جس کے اندر زندگی کا پورا احساس ہو گیا ہے۔

اور جب تک ہم زندگی کی حرکت اور تغیر کی طاقت کو اس کے اندر کام کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے، جب تک کہ ہم زندگی کی نبض کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک ہم بھی اپنے وجود کا اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

ایک تقریر!

اُردو زبان

یوم اُردو کے موقعہ پر تیج بہادر سپرو کے ارشادات

ڈھائی سو برس گزرے جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے میل جول سے ایک ایسی مشترکہ زبان بنی جسے ہم اردو کہتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ آج یہ کہا جارہا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، ہندوؤں کی زبان تو ہندی ہے، بدنصیبی سے آج کل ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو ہندوؤں سے یہ کہتا ہے کہ انھیں صرف ہندی کو فروغ دینا اور ہندی ہی کی اشاعت کرنا چاہیے، میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کے لوگ ہندوستان میں ایک مشترک زبان میں تفریق کر کے کیا پائیں گے اس خراب ذہنیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زبان جس کو ہندو مسلمان سب ہی بولتے اور سمجھتے ہیں وہ مسلسل مشکل بنائی جارہی ہے اور روز بروز اس کی اصلی روح کا خون ہو رہا ہے اگر اردو زبان کو مسلمان صرف اپنی زبان کہیں تو یہ اُن کی سخت غلطی ہے اسی طرح اگر ہندو اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھیں تو یہ اُن کی ناواقفیت ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبہ میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

ہندی ایک بناوٹی اور مصنوعی زبان ہے

مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان کو سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کریں جو فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور ان کی آپس کی رواداریوں اور صدیوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔

لوگ مجھے جماعت سے بھٹکا ہوا ایک فرد کہتے ہیں، لیکن کوئی سمجھدار آدمی ایسے لوگوں کو اپنے آبا و اجداد کا سپوت نہیں کہہ سکتا جو اپنے سلف کی قربانیوں کو جان بوجھ کر بھلا سمجھیں اور اپنی پائی ہوئی ایک مقدس میراث کو سرِ بازار لٹا دیں، میرا یقین ہے کہ وہ زبان یعنی اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے، مٹائی نہیں جا سکتی، اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کے ترقی دینے میں کمی نہیں کی، اُردو ہمیشہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جائداد رہی ہے اور ہے، اگر ہندو اُردو کو تباہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنی ہی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں۔

سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ

ایک گروہ ہے جو اُردو زبان میں سنسکرت کے نامانوس اور نہ سمجھنے والے الفاظ بلا ضرورت ٹھونس رہا ہے۔ اور

دوسری طرف جو ایل طور پر عربی فارسی کے نئے نئے الفاظ زبان میں ہوتے جا رہے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مشترکہ قومی زبان کا تو ذکر ہی کیا آئندہ ہمارے ہاں [illegible] روزانہ زندگی میں معمولی بات چیت کرنے کے لیے بھی اپنے ساتھ ایک مترجم رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ میری نظروں سے [illegible] اور ہندی دونوں اخبارات گزرتے ہیں جن میں اب ایسے ایسے عجیب الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں [illegible] جن کو عوام کا ذکر ہی کیا ان الفاظ کو اس زبان کے پڑھے لکھے حضرات بھی بہ مشکل سمجھ سکتے ہیں [illegible] مستعمل الفاظ [illegible] جو ایک مشترکہ زبان کی ترکیب و ترتیب میں بالکل گھل مل گئے ہیں [illegible] اور کس طرح غیر مانوس اور اجنبی الفاظ کو مشترکہ زبان کی عبارت میں کھپانا ممکن ہو سکتا ہے جو لوگ اپنی طرف سے [illegible] اجنبی الفاظ لا لا کر اپنی زبان میں بھر رہے ہیں کوئی سمجھدار اور انصاف پسند [illegible] مشترکہ قومی زبان ان کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ ہماری زبان [illegible] سنسکرت اور عربی کے نامانوس الفاظ بھر رہے ہیں جنہیں ہماری زبان کسی طرح قبول نہیں کر سکتی تو آپ زبان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں بلکہ آپ اس کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے [illegible] زبان استعمال کرنا چاہتے ہیں جو دیہات میں عام طور پر بولی اور سمجھی جا سکتی ہے لیکن جبکہ ہر گاؤں اور قصبہ کی مقامی بولی [illegible] فرق ہے اور اسی طرح دیہاتی اور شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہے تو آپ کہاں تک ان کی تقلید کریں گے۔

زبان کا سوال ہندو مسلم سوال نہیں ہے

میں جو زبان بولتا ہوں۔ اسے میں نے کسی مولوی اور پنڈت سے نہیں سیکھا بلکہ وہ ہمارا پدری ترکہ ہے جس طرح باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں اسی طرح ہم بولتے ہیں، میں اس وقت بھی جو آپ کے درمیان موجود ہوں تو اس وجہ سے نہیں کہ میں آپ لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہوں اور نہ میں اس معاملہ کو صرف آپ کا معاملہ سمجھ کر آپ کا ساتھ دینے آیا ہوں، بلکہ میں اس لیے آیا ہوں کہ وہ ترکہ جو ہمارا پدری ترکہ ہے اُسے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے میں حصہ لوں بلکہ اُن چیزوں کا رد کروں جو اس کے پامال کرنے میں استعمال کی جا رہی ہیں یہ ہمارا حق ہے اور بہ حیثیت ہندوستانی کے ہمارا فرض ہے، ہمیں اس معاملہ میں ایک دوسرے کا لحاظ کرنا ہوگا ملک میں سیاسی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں مگر زبان کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر ہاتھ ڈالا جائے، یہ ضرور ہے کہ یہ زبان تمام صوبوں میں بولی اور سمجھی جانے کے لحاظ سے یکساں مرتبہ نہیں رکھتی اور نہ کسی زبان کے لیے ایسا ممکن ہے مگر پھر بھی ہر جگہ سمجھی جانے کی وجہ سے قومی زبان ہونے کا مرتبہ رکھتی ہے تو ایسی صورت میں کسی کا یہ کہنا کہ ہم سنسکرت الفاظ استعمال کریں گے کہاں تک مناسب اور حق بجانب ہو سکتا ہے اور ہمارے لیے یہ کہاں تک جائز ہے کہ ہم کسی کے کہنے سے اپنے ادب کو خراب کر لیں اور ہم سب کچھ کھو دینے کے بعد اُسے "ہندوستانی" زبان بھی کہیں۔

ہندوستانی کی اصطلاح دھوکے کی ٹٹی ہے

میں "ہندوستانی" کو ایک دھوکے کی ٹٹی سمجھتا ہوں جس کے ذریعہ یقیناً خود غرض لوگ اپنے خود ساختہ پیمانے سے زبان اور ادب کو مٹانا چاہتے ہیں۔ حضرات میں آپ کی کوشش میں ہر طریقہ سے شامل ہوں، اگر آپ بھی اپنی قومی زبان کی وراثت کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھیں اور اپنی قومی زبان "اُردو" کو اردو کہنے سے نہ ڈریں اور اعلان کے ساتھ کہیں کہ ہماری زبان "اردو" ہے اور اس کی عبارت کو ایسی سلیس بنائیں کہ اس کی اشاعت روز بروز بڑھتی جائے تو میں ہر حیثیت سے آپ کے ساتھ ہوں۔

اگر کوئی صاحب اپنی طرف سے عربی کے الفاظ قصداً استعمال کریں گے تو وہ اُردو کی خدمت نہ ہوگی، اگر ہندو بھائی اپنی قومی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بھر یں گے تو سمجھ لیں کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے اپنی قومی زبان کی

کی بنیاد کو ہلا رہے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ "اردو" روز بروز ترقی کرے آپ میں یہ اخلاقی جرأت ہو کہ آپ لفظ اردو کو استعمال کرنے میں نہ شرمائیں اور خواہ مخواہ اس کے بجائے لفظ "ہندوستانی" استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ یہ زبان ہمارے آبا و اجداد کا ایک ناقابل تقسیم مشترکہ اور مقدس ترکہ ہے جس کی نہ روح بدلی جاسکتی ہے نہ نام۔

ماخوذ از نیرنگ خیال سالنامہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

خاص "اضطراب" کے لیے

تلاش سکون

(از۔ ابو المعیات..... یکتا حقانی امروہوی)

مری نگاہ میں جلوے ہزار پنہاں تھے
تصورات حسیں صد ہزار رقصاں تھے

مرے دماغ میں لاکھوں تھے وہ خیال حسیں
کہ جنکے سامنے جھک جائے لاکھ بار جبیں

خدا گواہ کہ مجھ کو کوئی جنوں بھی نہ تھا
مگر مرے دل ہشیار کو سکوں بھی نہ تھا

فقط سکوں کی مجھکو تھی جستجو باقی
قرار دلکو ہو بس یہ تھی آرزو باقی

یکایک آپ کے جلووں میں کھو گئیں نظریں
سکوں نصیب ہوا مست ہو گئیں نظریں

خاص "اضطراب" کے لیے

دودھ کی لاج

از حضرت ماہر القادری حیدرآباد (دکن)

شاکر کے باپ کھاتے پیتے زمیندار تھے، گاؤں کی پنچایت کے سرپنچ، ضلع کلکٹری کے اسیسر، کچہری دربار میں اُن کی رسائی تھی، آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اُن کی بات [illegible] ــــ اور ہاں بات کیا مانتے تھے، ان کی مٹھی میں تھے۔ شاکر کی عمر مشکل سے چھ مہینہ کی ہوگی کہ اس کی ماں چل بسی۔ شاکر اپنے باپ کا اکلوتا بچہ تھا، ماں کے مرنے کے بعد شاکر کے باپ نے اپنے بیٹے بچہ کی ٹہل کے لیے ایک عورت کو نوکر رکھ لیا، اس نوکرانی کا نام وفاتن تھا۔ وفاتن کہنے کو تو ذات کی جلاہن تھی، مگر بیکڑوں شریف زادیوں سے اچھی، شاکر کو اس نے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا۔ شاکر کو مشکل سے چھ مہینے ماں کا دودھ پینا نصیب ہوا۔ اب وفاتن کا دودھ اُس کی نشو ونما کے کام آرہا تھا۔ وفاتن خود گیلے میں سوتی اور شاکر کو سوکھے میں سلاتی، اگر ماممتا، محبت اور ہمدردی کا نام ہے، تو وفاتن میں یہ سب باتیں پائی جاتی تھیں۔ وہ نوکرانی تھی اور پیٹ کی خاطر نوکری کرتی تھی، مگر قدرت نے شاکر کی ماں کی محبت اُس کے سینہ میں بھردی تھی، وفاتن کا لڑکا خیراتی شاکر سے عمر میں ڈیڑھ سال بڑا تھا، اور وہ بھی ماں کے ساتھ شاکر کے باپ شیخ جی کے گھر میں رہتا تھا۔

وفاتن نے اپنی نیک چلنی، دیانت داری اور ہمدردی کی بدولت شیخ جی کی نگاہوں میں اعتبار قائم کر لیا تھا، گھر کا سارا کاروبار وفاتن کے ہاتھوں پر ہوتا، اور بعض کاموں میں تو شیخ جی اُس سے مشورہ بھی لیتے۔ وفاتن سب کچھ اختیار اور اعتبار رکھنے کے باوجود شیخ جی کے حکم اور مرضی کا جیتہ نکالے [illegible] نہ توڑتی ــ ایسی وفادار نوکرانیاں قسمت والوں کو ہی ملتی ہیں۔

شاکر نے ہوش سنبھالا تو وفاتن کی ہمدردی اور محبت کے چشمے کو اپنے لیے بہتا ہوا پایا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، تو شاکر بھی وفاتن سے ماں کی طرح محبت کرتا تھا۔ ایک دفعہ وفاتن اپنے کسی رشتہ دار کی شادی میں کہیں باہر چلی گئی تو شاکر نے وہ بیل مچائے کہ آسمان سر پر اُٹھالیا۔ محبت تعلقات کا نام ہے، اور یہاں تعلقات اور محبت دونوں ایک دوسرے میں سموئے جا رہے تھے۔ خیراتی، وفاتن کا اپنا بچہ تھا، مگر وہ شاکر کو اُس سے کچھ بڑھ کر ہی سمجھتی تھی، ایک مرتبہ شاکر نے خیراتی کے بدن پر کلی کردی، جاڑے کی رُت تھی، ٹھنڈا پانی بدن پر تیر کی طرح جا کر لگا، خیراتی نے شاکر کے گھونسا رسید کیا شاکر رونے لگا، وفاتن شاکر کے رونے کی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئی۔

"میاں! کیا ہوا کیوں رو رہے ہو" ــ وفاتن نے شاکر کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"خیراتی نے مارا" ــــــــ شاکر نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔

"تو نے میاں کو کیوں مارا" ــــــ وفاتن خیراتی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"شاکر میاں نے میرے اوپر کلی کردی تھی" ــ خیراتی نے جواب دیا۔

"کلی ہی تو کردی تھی، کوئی بندوق تو نہیں ماردی تھی" یہ کہتے ہوئے وفاتن نے خیراتی کو پکڑ کر جو مارا ہے تو چھٹی کا دودھ یاد دلادیا، شاکر نازک مزاج تھا، بات بات پر مچل جاتا، وفاتن خوشی کے ساتھ اُس کے ناز اُٹھاتی۔

ایک دفعہ باورچی خانے میں وفاتن چائے کا پانی گرم کر رہی تھی، پانی خوب گرم ہوگیا، تو وفاتن چائے کی کیتلی چولھے سے اُتارنے لگی، شاکر باورچی خانہ میں بیٹھا ہوا تھا، تیز طبیعت تھا، اتنی دیر اُس سے بھلا کب بیٹھا جاتا، اُس نے گیند اچھالا، گیند روشندان سے

اضطراب

ٹھوکر کھا کر چائے کی کیتلی پر گری اور پوری کی پوری کیتلی وفاتن کے ہاتھ پر الٹ گئی۔ کھولتا ہوا تیز پانی جو ہاتھ پر گرا تو وفاتن کے منہ سے بے ساختہ دہائے کا غل نکلا۔ شاکر یہ حالت دیکھ کر بھاگ گیا۔ شاکر کے باپ شیخ جی، دالان میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے، وفاتن کی آواز سن کر باورچی خانہ میں آئے، انھوں نے دیکھا کہ وفاتن ہاتھ پکڑے ہوئے بیٹھی ہے۔

"وفاتن کیا ہوا، خیر تو ہے"۔ شیخ جی نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں کیتلی اتارنے میں مجھ سے پانی گر گیا"۔ وفاتن نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

اس واقعہ سے شاکر کے ساتھ، وفاتن کی ہمدردی اور محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شاکر پانچ سال کا ہوا تو اس کے ماموں شاکر کو اپنے ہمراہ لے گئے، گاؤں میں پڑھنے پڑھانے کا انتظام نہ تھا، شاکر کے ماموں کا لے جانا اسی غرض سے تھا۔ تیز مزاج بچے عام طور پر ذہین ہوتے ہیں، شاکر نے پڑھنے کی طرف جو توجہ دی تو اپنے ہم سبق بچوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ زمانہ کو کروٹ بدلتے کیا دیر لگتی ہے، جب شاکر کالج میں پہونچا تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا، زمینداری کی دیکھ بھال ماموں ہی کرنے لگے کیونکہ اب ماموں ہی شاکر کے سب کچھ تھے۔

کالج کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد، شاکر ڈپٹی کلکٹری کے مقابلہ میں شامل ہوا اور اول آیا، ٹریننگ کے بعد وہ مستقل ڈپٹی کلکٹر ہو گیا، ماموں ہی کی بیٹی سے شادی ہو گئی، اور شاکر ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ شاکر سے سب لوگ خوش تھے، حاکموں اور افسروں سے رعایا عام طور پر خوش نہیں رہتی، لیکن شاکر نے رعایا کے دلوں کو بھی موہ لیا تھا وہ ایک فرض شناس افسر، اور رعایا کا ہمدرد تھا۔

وفاتن اور اس کا بیٹا گاؤں میں دکھ اور مصیبت کی زندگی بسر کر رہے تھے، وفاتن اب بہت بوڑھی ہو گئی تھی وہ خود دوسروں کی ٹہل اور خدمت کی محتاج تھی، خیراتی نے محنت مزدوری کر کے تھوڑا بہت جمع کیا تھا، سو وہ گاؤں کے جواری چوروں کی نذر ہو گیا۔ ماں اور بیٹے دونوں بہت پریشان تھے۔ خیراتی کو خبر لگی کہ شاکر کسی ضلع میں ڈپٹی کلکٹر ہے، اس نے اس بات کا ماں سے ذکر کیا، وفاتن نے کہا کہ چلو شاکر میاں کے پاس چلیں، گاؤں کے لوگوں نے سمجھایا کہ اس بڑھیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے، بھلا ڈپٹی صاحب اس سے مل سکیں گے! ۲

وفاتن نے کہا کچھ بھی ہو، میں شاکر میاں کو ایک دفعہ دیکھ کر رہوں گی، اگر وہ میرے دودھ کا بھی پاس نہ کریں گے، تو بہت سے بہت یہی دھتکار دیں گے، مگر میں ان کو دیکھ تو لوں گی۔

وفاتن اور خیراتی شہر میں آئے اور شاکر کی کوٹھی کا پتہ لگاتے ہوئے وہاں پہونچے، شاکر اپنی کوٹھی کے ہال میں بیٹھا ہوا دوستوں کے ساتھ برج کھیل رہا تھا، چپراسیوں نے ان کو سختی کے ساتھ روکا۔

"ہم شاکر میاں سے ملنا چاہتے ہیں"۔ خیراتی نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"سرکار نہیں کہتا، نام لیتا ہے صاحب کا! ابے کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔ چپراسی نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو سرکار سے ملا دیجیے، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی"۔ خیراتی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ منہ اور مسور کی دال، ذرا آپ کی شکل تو دیکھیے، ڈپٹی صاحب بہادر سے ملنا چاہتے ہیں"۔ چپراسی دوسرے چپراسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، صاحب ہم ڈپٹی صاحب سے ملنے کے لیے ان کے وطن سے آئے ہیں، وہ ہمیں جانتے ہیں، آپ ہمیں ان تک پہونچا تو دیجیے"۔

خیراتی نے ذرا زور سے کہا، چپراسی دو خیراتی میں ذرا تیزی کے ساتھ گفتگو ہونے لگی، شاکر نے یہ آوازیں سنیں تو چپراسی کو آواز دی کہ یہ کیا شور ہو رہا ہے، چپراسی نے حاضر ہو کر کہا کہ ایک گاؤں کا آدمی کہتا ہے کہ میں سرکار کے وطن کا رہنے والا ہوں اور سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔

"میرے وطن کا آدمی" شاکر نے تاش کے پتوں کو میز پر رکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔ بڑھیا وفاتن اور شکستہ حال خیراتی دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ شاکر نے ان دونوں کو غور سے دیکھا۔ اس کا دماغ ابھی معلومات کو ترتیب دے رہا تھا کہ وفاتن نے بڑھ کر کہا۔

"شاکر میاں، میں تمھاری وفاتن ہوں، کیا مجھے بھول گئے"۔

شاکر نے بڑھ کر وفاتن کے پیر چوم لیے اور خیراتی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ ان کو اپنے گھر لے گیا، اور دنیا کو دودھ کا حق ادا کر کے دکھا دیا۔

خاص اضطراب کیلئے

بالکل نئی

غزل

(از حضرت بہزاد لکھنوی، آل انڈیا ریڈیو دہلی)

یاد آتی ہے وہ صورت زیبا کئی دن سے
دل میں ہے مرے حشر سا برپا کئی دن سے

روکے نہ رکیں گے یہ کبھی اشکِ محبت
مجبور ہے مجبورِ تمنّا کئی دن سے

بے کار سی ہے لذّتِ تسکینِ تصور
کچھ اور ہے آنکھوں کا تقاضا کئی دن سے

شاید دلِ مایوس ہے مانوسِ شبِ غم
ہے بند شب و روز کا رونا کئی دن سے

اب تک تو طلب دل کی تھی اب دین کی طلب ہے
بدلا ہے ان آنکھوں کا اشارا کئی دن سے

جس درد سے ہوتی نہیں تا عمر رہائی
وہ درد مرے دل میں ہے پیدا کئی دن سے

اس در کی قسم اب ہوا احساس جبیں کو
ہاں اب تو میں کرتا نہیں سجدا کئی دن سے

اے جانِ دو عالم تری تنویر کے صدقے
بےچین سی رہتی ہے یہ دنیا کئی دن سے

اس دردِ محبت کی قسم چین نہیں ہے
دیکھا جو نہیں ہے ترا جلوہ کئی دن سے

کیا جانیے کیا بات ہے کیا سوچ ہے کیا فکر
بہزاد حزیں کچھ نہیں لکھتا کئی دن سے

فلم اسٹار

از حضرت شوکت تھانوی

اسکولوں کے نابالغ لڑکے ہوں یا کالجوں کے والدین ناخدا بے علم، پروفیسر ہوں یا پولیس آفیسر، ایڈیٹر ہوں یا لیڈر، وکیل ہوں یا بیرسٹر، شربت کی دوکان رکھتے ہوں یا پان بیچتے ہوں، یکہ والے ہوں یا کار چلانے والے، بیکار ہوں یا برسر روزگار، غرضیکہ خواہ کیسے ہی بلند ہوں یا کیسے ہی پست مگر سب حسب حیثیت اور حسب توفیق ایک سرے سے فلمی جنون میں مبتلا نظر آتے ہیں اور پردۂ سیمیں کی حسین پرچھائیوں پر مرمٹنے کی وبا آپ کے ہندوستان میں ماشاء اللہ روز افزوں ترقی پر ہے۔ کالجوں کے ہوسٹل کے کمروں میں جہاں پہلے تاریخی ہستیوں کی تصاویر اور دلفریب مناظر کے مرقعے نظر آتے تھے اب ان کی جگہ فلمی ممثلات کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ مصور اخبارات انھیں تصاویر سے مزین کیے جاتے ہیں۔ سیاسی اخبارات تک میں ایک آدھ کالم ان ہی فلمی مباحث کے لیے مخصوص پایا جاتا ہے۔ پان والوں کی دکانیں اور ہوٹل ان ہی سینما کی تصاویر سے سجائے جاتے ہیں اور ہر بلند سے بلند اور پست سے پست سوسائٹی میں یہی مباحث زیر بحث رہتے ہیں کہ کس فلم میں کس ایکٹر یا ایکٹرس نے کیسا کام کیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ فلمی دیوانگی اس قدر عالمگیر ہو چکی ہے کہ اب ہندوستان بھی اس سے محفوظ نہیں ہے بلکہ فاقوں کی مصیبت اور تن ڈھانکنے کی فکر کے باوجود جس کو دیکھیے وہ اس مرض میں مبتلا نظر آتا ہے اور اس فلمی جنون کی بڑھتی ہوئی رفتار بتا رہی ہے کہ جو اب تک محفوظ ہیں ان کو بھی آج نہ سہی کل اس مرض میں مبتلا ہونا ہے اور کسی نہ کسی پرچھائیں کے لیے سر دھننا اور ٹھنڈی سانسیں بھرنا ہیں۔

شوکت میں جانتا ہوں مآل حیات کو
مرنا پڑے گا ایک ستمگار کے لیے

واللہ کمال تو یہ ہے کہ راستہ میں کسی دیہاتی کا کان پکڑ کر پوچھیے کہ "منٹگمری کون جاتا ہے؟" تو وہ آپ کا منہ اس طرح دیکھنے لگے گا کہ گویا آپ کسی اور زبان میں بات کر رہے ہیں، اگر آپ اس سے پوچھیں کہ "فلاں ایکٹر کون ہے" تو وہ آپ کو اس ایکٹر کے حوالے سے اس کے متعلق بیان دے گا کہ آپ خود حیرت سے اس کا منہ دیکھیں۔ ممکن ہے کہ کسی بچہ کو اپنی ماں کا نام نہ معلوم ہو مگر فلمی ایکٹرس سے وہ ضرور واقف ہوگا۔ سر تیج بہادر سپرو کو جاننا ہر ایک کے لیے اتنا ضروری نہیں ہے جس قدر کہ فلم ایکٹرس سے واقف ہونا۔ مسز سروجنی نائیڈو کے متعلق کسی ان پڑھ سے کچھ پوچھیے تو وہ نہایت معصومیت کے ساتھ کہے گا کہ "ان صاحب کی دوکان کا پتہ بتائیے اور راستہ بتا دیں" لیکن ایک بچہ کو ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت کسی کے لیے نہیں ہے سب ان کے متعلق اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ وہ خود اپنے متعلق غائبانہ جانتی ہوں گی۔ حتیٰ کہ اگر شوکت تھانوی کے جاننے والے باوصف اس ریڈیو نوازی کے شاید چند ہی ہوں گے مگر گھٹیا قسم کے فلم ایکٹروں سے بھی بچہ بچہ واقف ہے۔ یہ در اصل ثبوت ہے اس بات کا کہ پردۂ سیمیں کی پرچھائیوں نے ہندوستان پر مسلط ہو کر اپنا جادو کچھ اس طرح جگا دیا ہے کہ ان کے مقابلہ میں کسی کی دال نہیں گل سکتی۔

ان تمام واقعات کے بعد واللہ قائل ہونا پڑتا ہے ہندوستانیوں کے اس بھولے پن کا جس کے ماتحت وہ پردۂ سیمیں کو مفروضہ ماحول کو واقعات کی ایک دنیا جانتے ہیں اور تمثیل کو حقیقت سمجھ کر واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اکثر اوقات مثلاً ایک حسین پرچھائیں کی صورت میں پردۂ سیمیں پر ان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہے اس کو فن تمثیل کے کمالات فسانہ کا پلاٹ اور کردار، ڈائرکٹر کی ہدایات، مصور کی مہارت اور اسٹیج کا ماحول خود اس کی اصلیت سے کس قدر بیگانہ بنا دیتا ہے کالا منہ گورا کر دیا جاتا ہے چندھی آنکھوں کو غزال کہا جاتا ہے، قدرتی چہرہ کو تندرست بنا کر پیش کیا جاتا ہے، بیڈھنگی چال کو

ست بندی کیا جاتا ہے۔ دونوں آنکھوں میں انجانے بھرے جاتے ہیں موٹے موٹے نیلے نیلے ہونٹوں پر پانی نے رقصاں کیے جاتے ہیں مختصر یہ کہ کبھی جو نسا
گندم فروشی سے کام لیا جاتا ہے تو کبھی گندم نما جو فروشی کی ضرورت پیش آتی ہے آپ کو کیا معلوم کہ جس کا فرہ کو آپ پردہ سیمین پر ایک غارت گر
دوشیزہ کی صورت میں دیکھ رہے ہیں وہ کتنے بچوں کی ماں اور کتنے نواسوں کی نانی ہے جس سرخ و سفید رنگ والی نازنین
پر آپ کا نفس فریفتہ ہو رہا ہے وہ کتنی مرتبہ کی بنا رکھی ہے جس نقرئی آواز کے لوچ پر آپ کی روح وجد میں آ رہی ہے وہ در اصل کیسی کرخت
ہے سامعہ پاش آواز ہے جن نوالی آنکھوں کا آپ شکار ہو رہے ہیں وہ در اصل مشاطگی کے بغیر آنکھیں بھی معلوم ہوتی ہیں یا نہیں آپ
تو اس کو اصلیت سمجھتے ہیں جو کچھ آپ پردہ سیمین پر دیکھتے ہیں حالانکہ وہ اصلیت سے کوسوں دور ایک بہروپ ہوتا ہے اور آپ اس بہروپ کے
دیوانے ہیں۔

آپ کو نہیں معلوم کہ [illegible] بر درست اہر فلسفہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے وہ علم سے کتنا بیگانہ ہوتا ہے آپ جس کو پردہ
سیمین پر [illegible] دیکھتے ہیں وہ فلم کمپنی کا ایک ادنیٰ ملازم ہوتا ہے آپ جس کو شاہزادی جانتے ہیں اگر وہ واقعی شاہزادی ہوتی تو اس کی جوتی
کو کیا غرض پڑی تھی کہ چند ٹکوں کے لیے شاہزادی کا بہروپ بنا کر آپ کے سامنے پیش ہوتی آپ سنیما کی دیوار پر جو بچا ئیں کو ہائی کورٹ کا
ایک فاضل جج دیکھتے ہیں وہ بیچارہ تعزیرات ہند تو خواب میں بھی دیکھنے سے قاصر ہے اور قانون سے اتنا بیگانہ کہ شاید خود اس کا بھی کبھی
چالان نہ ہوا ہو۔ آپ جس عورت کی وفا شعاری کے قائل ہو جاتے ہیں آپ کو نہیں معلوم کہ وہ واقعات کی دنیا میں کیسی بے وفا ہوتی ہے
جس کے ایثار کا ایثار قابل قدر ثابت ہوتا ہے وہ ایثار ہے۔ جس اس غریب پر تہمت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا قصہ مختصر یہ کہ آپ اکثر
فلمی اداکاروں کی خلوت اور جلوت میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور اس تخیلی ماحول کو واقعاتی دنیا سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے
لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر آپ نے اس تمثیل کا اثر قبول کیا ہے تو یہ تمثیل کا کمال ہے مگر اس کے ساتھ اس کو بھی تسلیم کر لیجیے کہ اس طرح خود
آپ کی سادہ لوحی اس شخص کی طرح مسلم کہی جائے گی جو بیداری کے بعد بھی اپنے خواب پر نہ ہنسے بلکہ خواب میں جو کچھ دیکھا ہے اس کو بیداری
کے واقعات میں شامل کرنے اور نتائج کا منتظر رہے۔

در اصل ایک فلمی اداکار کی زندگی عجیب و غریب ہوتی ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ ہے اسی صورت اور انہیں
حالات کے ساتھ آپ کی نگاہوں کے سامنے پردہ سیمین پر آ جائے ورنہ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک اداکار نہایت متقی پرہیزگار ہے
پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے تیسوں روزے رکھتا ہے عورت کو دیکھ کر استغفر اللہ کہتا ہے اور شراب کے ذکر پر اس طرح منہ بناتا ہے کہ
گویا کسی نے اس کے منہ میں ایلوا انڈیل دی مگر اس کو ایک نہایت بدمست شرابی ایک حد سے گزرے ہوئے عیاش ایک قابل ملامت
اوباش اور ایک نہایت ناپاک کیرکٹر کے انسان کی طرح پردہ سیمین پر آپ پھر اس طرح دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی اس کی پاک بازی کے متعلق قسم
بھی کھائے تو آپ یقین نہ کریں اس طرح ایک کم خرچ بالانشین طبقہ کی مغلانی آپ کو عصمت و عفت کی دیوی بنی ہوئی نظر آتی ہے ایسی پاکباز
کہ آپ اس کی پاکبازی کی قسم کھائیں ایسی پاک دامن کہ آپ وضو کر کے اس کے دامن پر کھڑے ہو جائیں نماز پڑھنے کے لیے بلکہ ع

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اسی طرح ضرورت شعری کی طرح ضرورت فلمی کے اعتبار سے بعض اوقات ایک عورت کو اپنے حقیقی شوہر کے ساتھ فلم میں
اس طرح کام کرنا پڑتا ہے کہ شوہر بنا ہوا ہے بھائی اور آپ اس کی ہمشیرہ عزیزہ کی طرح اداکاری فرما رہی ہیں یا ڈائرکٹر نے اس کو
مناسب سمجھا کہ بیوی ماں کا کیرکٹر اچھا پیش کرے گی اور شوہر میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ نہایت سعادتمند بیٹا بن جائے لہذا ایسا
بھی ہوتا ہے کہ بیوی کو آپ ماں سمجھیں اور شوہر کو بیٹا جانیں مگر یہ دونوں میاں بیوی تھے میاں بیوی ہیں اور اگر بوجوہ طلاق کی نوبت
نہ آئی تو میاں بیوی رہیں گے مگر ان کی خلوت سے یہ جلوت کس قدر جدا گانہ ہے کہ یہاں وہ ماں بیٹے ہیں اصلیت اس تمثیل کے بعد کیسی
منقلب ہو گئی مگر وہ خود اس دقتی اور مفروضہ انقلاب کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی حالانکہ ہم :
آپ اگر اس قسم کا خواب بھی دیکھیں تو گھبرا کر آنکھ کھل جائے۔

ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ طالب و مطلوب قسم کے ایکٹر اور ایکٹرس کو ڈائرکٹر نے مذاقاً نہیں بلکہ نہایت نیک نیتی اور ایمانداری

کے ساتھ بہن بھائی کی تمثیل کے لیے منتخب کیا لہذا وہ اس صورت سے آپ کے سامنے پیش ہوں گے اور اسوقت اگر کوئی آپ کے کان میں اصل واقعہ کہدے تو آپ دانتوں کے نیچے انگلی دباکر یہی کہیں گے کہ بری بات ہے کسی پر اس قسم کا الزام لگانا بھلا کہیں ایسا بھی ہوا ہے" یا یہ کہ در اصل حقیقی بہن بھائی کو ڈائرکٹر نے زن وشو یا طالب ومطلوب کا کیرکٹر دیدیا تو وہ اس تمثیل کو اس طرح پیش کریں گے کہ پھر کوئی قسم آپکو یقین نہ دلاسکے گی کہ یہ بھائی بہن ہیں مگر ان تمام حالات میں خطرہ اول یہ ہے کہ آپ معاف کیجیے گا ذرا بدھو ضرور ہوں اور اگر آپ ان تمام حالات سے باخبر ہوے تو آپ خود ان دیوانوں پر ہنستے ہوں گے جو دیوار کی پرچھائیوں سے سر پھوڑتے ہیں ان کی تیر نظر کے گھائل نظر کتے ہیں ان کے لیے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں اور ان کی تصویر کو کلیجہ سے لگائے پھرتے ہیں حالانکہ وہ اگر بغیر فلمی تشکیل اور بجائے اس افسانوی ماحول کے ان کو ان کی اصل شکل وصورت میں روزمرہ کی گھریلو زندگی میں دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ سکیں کہ یہ وہی ہیں جنکی تصویر رہزن تمکین ہوش ثابت ہوئی تھی اور یہ وہی ہیں جن کی موہنی صورت آنکھوں میں سمائی اور دل میں بسی ہوئی ہے۔

بالکل اسی طرح آج کل کے فلمی مجنون اس خبط میں بھی مبتلا نظر آتے ہیں کہ اسکول یا کالج چھوڑنے تک جب سرکاری نوکری ملے یا چولھے میں جائے تجارت میں کامیابی ہو یا نہ ہو وکالت چلے یا مفلوج ہو جائے لیکن اگر کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے تو یہ گویا ان کی معراج ہے آجکل کے نوجوان طالب علموں کی بہت بڑی اکثریت وہ ہے جو شب و روز اس دھن میں نظر آتی ہیں کہ اگر ہم یوں بھاندیں تو اس ایکٹر کی ادا پیدا ہوتی ہے اور اگر یوں ہنسیں تو بالکل وہ اداکار معلوم ہوتے ہیں اگر اس طرح سنجیدہ بن کر گفتگو کریں تو شاید کسی ایسے اداکار کو بھی رشک پیدا ہو جائے اور اگر یوں آنکھیں پھیر کر گال پھلالیں تو ایک مضحک اداکار بھی مزاحیہ اداکاری چھوڑ دے یہ طالب علم اپنی سوسائٹی میں یہی نقالیاں کرتے ہیں اسکے بعد تنہائی میں آئینہ کے سامنے اپنی اداکاری کی داد خود ہی دیتے ہیں اپنی چال بھول گئے ہیں اور کسی ایکٹر کی چال چلنا سیکھ لی ہے اپنی ہنسی کی از دانستہ چھوڑ کر کسی فلم اسٹار کی ہنسی ہنستے ہیں گفتگو کرتے ہیں تو فلمی مکالمہ کا مزا آتا ہے مختصر یہ کہ سوتے میں بھی شاید وہ فلستان ہی کی سیر کرتے ہوں گے اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں سنیما دیکھ دیکھ کر اور فلمی رسائل کا مطالعہ کر کر کے فیل ہوتے ہیں اور جب یونیورسٹی سے پاس ہو کر یا اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے فیل ہو کر تعلیمی اداروں سے نکلتے ہیں تو چھوٹتے ہی فلم کمپنیوں میں پہونچتے ہیں اور وہاں در در ٹھوکر کھاتے ہیں قصہ در اصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک فلم اسٹار سے زیادہ شاندار زندگی کسی اور کی ہوتی ہی نہیں وہ پردہ سیمین کے خوشگوار واقعات کو فلم اسٹار کی نجی زندگی سمجھتے ہیں جس میں سوائے دلچسپیوں کے اور کچھ ہے ہی نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی ایک قطرہ کی طرح اگر اس دریا میں شامل ہو گئے تو جن خواب وخیال کی پریوں کو محض پرچھائیوں کی صورت میں دیکھ رہے ہیں ان کے جلوؤں میں خود ہی گھرے ہوے نظر آئیں گے ان کی زندگیاں ہماری ہوں گی بات کی لطافتیں ہماری ہوں گی اور ہماری زندگی جس کا اب کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا وہاں پہنچکر بنکر دوسروں کے لیے قابل رشک ثابت ہوگی حالانکہ جب وہ ایک فلم اسٹار بن کر دیکھیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ وہ کیا ہیں اور ان کی زندگی کیونکر تماشا بنی ہوئی ہے زندگی کی تمام تلخیاں ان کو وہاں بھی موجود ملیں گی کلفتوں سے ان کو وہاں بھی نجات حاصل نہ ہوگی اور وہی زندگی جو آج ان کے لیے رشک کے قابل بنی ہوئی ہے بلائے جان بن کر رہ جائے گی۔

وہ اندازہ کریں گے کہ ڈائرکٹر کی ماتحتی کیا چیز ہے ان کو معلوم ہوگا کہ جن فلمی ستاروں کے قرب کا ذوق ان کو کشاں کشاں کھینچ کر یہاں لایا ہے ان کی حکومت کیسی تکلیف دہ ہے وہ کہیں گے کہ اگر وہ فلم اسٹار نہ بنتے تو دنیا کے ایک کارآمد انسان ہو سکتے تھے اور ان کو احساس ہوگا کہ انھوں نے اپنے لیے جو راستہ تلاش کیا ہے وہ در اصل ان کے لیے نہ تھا ان کی وہ تمام اداکاری کی مہارت جو طالب علمی کے زمانہ میں ان کے لیے مایہ صد ناز تھی یہاں آکر ان کا اداکارانہ جہل ثابت ہوگی وہ سپر وجشنک آرزو میں جان دیں گے اور ان کو درباں سے زیادہ کوئی کام نہ ملے گا وہ کالج کی ڈگری دکھائیں گے اور ڈائرکٹر کہے گا کہ ناچ دکھاؤ وہ انگریزی میں غصہ کریں گے اور ڈائرکٹر کہے گا کہ ہندوستانی زبان میں مکالمہ بولو وہ اپنی عالی خاندانی کا سکہ بٹھانا چاہیں گے اور ہیروئین کہے گی کہ میری خوشامد کرو ان کا دل رو رہا ہوگا مگر وہ پردہ سیمین پر ہنستے ہوے نظر آئیں گے ان کی اچھی خاصی آنکھیں ہوں گی مگر وہ کانے بنا کر پیش کیے جائیں گے وہ نظرتاً نہایت شریف ہوں گے مگر ان کو حد درجہ کا بدمعاش بنکر اس طرح آنا پڑے گا کہ چار آنہ والے خوب جی کھول کر گالیاں دیں گے وہ نہایت عالی نسب ہی سہی مگر پردہ سیمین پر بھنگی بنے ہوے نظر آئیں گے وہ اس خیال سے فلم کمپنی میں آئے تھے کہ اپنی مردانگی کا جادو چلائیں گے مگر ان کو اس صورت

17

میں پیش کیا جائے گا کہ عورتوں کو صرف ان ہی سے نہیں مردوں کی جنس سے نفرت ہو جائے گی نہ بھی ان کی ہنسی ہوگی نہ رونا ان کا رونا بلکہ وہ تو از کرنے اسٹاروں پر اس طرح چلتے ہوئے نظر آئیں گے جس طرح مداری کی لکڑی پر بندر ناچتا ہے اور آخر کار اس تمام زندگی کا آخری تجربہ ان کو یہ حاصل ہوگا کہ وہ ایک تماشا بن کر رہ گئے ہیں اور ان کی زندگی از سرتاپا سوائے بہروپ کے اور کچھ نہیں ہے اگر ایسی ہی ان میں فلمی قابلیت ہوئی تو شاید مرکھپ کر مشہور ایکٹروں میں شامل ہو جائیں ۔ کامیابی کی جو امیدیں ہوتی ہیں وہ بغیر فلم اسٹار بنے ہوئے بھی پوری ہو سکتی تھیں یا ممکن تھا کہ وہ اگر فلم اسٹار نہ بنتے تو کوئی نامی گرامی مصنف کوئی مقنن کوئی تاریخی لیڈر یا کوئی اہم شخصیت بن جاتے اور اس کے بعد یہ فلم والے ان کو اس طرح حیرت سے دیکھتے جس طرح وہ خود ان فلم والوں کو دیکھتے ہیں بہرحال چونکہ انھوں نے واقعاتی دنیا پر افسانوی دنیا کو ترجیح دی ہے اندازہ ہے کہ ہمیشہ ایک نقال ہی رہیں گے اور آخر کار کچھ دنوں کے بعد خود اپنے متعلق بھی یہ شبہ ہو جائے گا کہ ہم اصلی ہیں یا نقلی بعد غور کرنے کے بعد وہ اپنے کو غالباً نقلی ہی پائیں گے ۔

ہماری سوسائٹی

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

حوصلے سرنگوں، امیدیں شل
آرزو، بار یاس سے بوجھل

نشہ ۔ بجھتا ہوا سا ایک شرار
کیف ۔ گرتی ہوئی سی اک دیوار

ہر لطیفے کی تہہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

شرم سے آب آب جولانی
ہر ہنسی ۔ شرمسار کھسیانی

خال و خط پر دھواں بناوٹ کا
کرب بالقصد مسکراہٹ کا

ہندوستانی موسیقی

(محترمہ عطیہ بیگم کے قلم سے)

ہندوستانی موسیقی کے علاوہ چند ہی مضامین اور ایسے ہوں گے جو اس قدر تاریکی اور گمنامی میں پوشیدہ رہے۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے لیے مواد کی کمی یا کال نہیں ہے۔ عہد خیالی اور گزشتہ انسانوں میں چالیس صدیوں کے بڑے وقفوں میں اس بات کی کوششیں کی گئیں کہ اس مواد کو جمع کیا جائے، ترتیب دی جائے۔ موجودہ عمل کو باقاعدہ اصول پر چلایا جائے۔ اور موجودہ اصولوں کو یکجا کیا جائے۔ لیکن ذوق و شوق کی کمی کی وجہ سے عہد گزشتہ کے علم کی ساری دولت اب گرد و غبار کے انبار میں دبی پڑی ہے جب تک کوئی انسانی قوتوں سے بالاتر قوت اس کو از سر نو پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گی اس وقت تک اس علم کے متعلق ہماری معلومات ہمیشہ ناقص اور غیر مسلسل رہیں گی۔

ہندوستانی موسیقی کا علم اتنا پرانا ہے کہ اگر ہم اس کی اصلیت و ابتدا کا سہرا ابتدائی دیوتا کے سر باندھیں تو مبالغہ نہ ہوگا اس کے تاریخی حالات معلوم کرنے کے لیے یورپ کے موجودہ اندازہ لگانے کے قاعدے کی رو سے اور سنسکرت کو چار مختلف دور میں تقسیم کرنا ہوگا۔

(۱) عہد سنگرہ از سنہ [illegible] تا سنہ [illegible] ق

(۲) عہد چاناماز سنہ [illegible] ق تا سنہ [illegible] ق

(۳) عہد برہمنا از سنہ [illegible] ق تا سنہ [illegible] ق

(۴) عہد سوترا از سنہ [illegible] ق تا سنہ [illegible] ق

ہمیں ایک ایسے گزشتہ زمانے میں لے جاتا ہے جہاں ممکن ہے کہ یہ معلوم ہو کہ وہ بہت ہی پرانا ہے لیکن اس سے یہ صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں موسیقی نہ صرف موجود تھی بلکہ اس نے ایک اعلیٰ معیار حاصل کر لیا تھا اور راگوں کا یہ قول جو کہ اس علم کا لازمی اصول ہے اور موسیقی کے برہما رس کے نتائج پر وید جاننے والے رشی عمل کرتے تھے اس لیے آریا سب سے پہلی قوم ہے جس نے اس ہنر کو تقریباً پانچ ہزار برس قبل پیدا کیا تھا اور اختراعات اور ایجادات اس زمانہ کے "سام وید" یعنی نظمیں ہم کو رگ وید کا ایک جز ہے اور جو قربانی کے وقت پڑھا جاتا تھا اس کے اوزان کی شکل وہ خود اپنے آپ وید دوں کے منتروں کے گانے بجانے کا قاعدہ سام منتر میں دیا ہوا ہے دور حاضر کی موسیقی کی خوبیاں اور نکات موجود ہیں، راگوں کے سرگم باقاعدہ دیے ہوتے ہیں، جس سے وزن کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے گانے کا بھی طریقہ لکھا ہوا ہے۔

اُدگاتری کو (سام گانے والا پجاری) جو کہ قربانی کے احکام پورے کرنے والا ہے اپنی آواز سریلی اور موثر ہونے کی دعا کرتا ہے اور اس کو اوگنیا صاف ستھری اور سادی آواز سے راگوں کے سرگم سیکھنے دو اور پھر اسی اوگنیا سے جس میں راگوں کا جز خوب موجود ہے ارت وگ کی رسوم ادا کرو" یہ ایک مستند قول ہے۔

سام وید میں بتایا ہے "سام منتر" ایک رسالہ ہے اور سات بابوں پر مشتمل ہے جس میں وید گیت جاننے کے طریقے بتائے گئے ہیں

منفرد حرکات اور آوازوں کے سروں، راگوں اور رنگوں کی بھرنے کے اصول بنائے گئے ہیں، موسیقی اور وید وں کی تعلیم کو لازم و ملزوم بتایا گیا ہے اور عبارت سے کہ "طرح الگ نہیں کی جاسکتی۔" ویدوں کی نظمیں گائی جاتی تھیں، "اپ ویدوں" سے اس کو ایک ہنر بنادیا اور رشیوں منیوں نے جو کہ پشت تھے اور قابل لوگ ہوا کرتے تھے، اس کو اپنی تعلیم میں داخل کرلیا۔

اسی وجہ سے گاندھرو وید کو عظمت و بزرگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو کس نے اور کب تصنیف یا تالیف کیا یہ خود ایک راز ہے۔ حالانکہ علم موسیقی پر سارے پرانی کتابوں کا انحصار کمل طور سے یا جزوی اعتبار سے جہاں تک فن اصطلاحات کا تعلق ہے گاندھرو وید پر ہی ہے۔

گاندھرو وید سام وید وں کی تالیف سے پیشتر اس بات کا صحیح سراغ ملتا ہے کہ آزاد اور طبعی اور رجحانات دنیائے موسیقی میں کارفرما تھے، اس کے بعد ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے جبکہ وہ رجحانات جو اقص و مغول تصور کر لیے گئے تھے، اُن کو دھرم شاستر کی رو سے پھر مفید اور کارآمد ثابت کیا گیا۔ یہ دھرم شاستر مذہب کی متبرک کتابوں کے نام ہیں جن کو رشی و منی لوگوں نے تالیف کیا ہے۔

اب وید کے عہد میں موسیقی نے فنون لطیفہ کی حیثیت اختیار کرلی، برہمنوں کے زمانہ سے صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ عہد گزشتہ میں صرف راگ راگنیوں کے سُر کا استعمال ہوتا تھا یا اُن کی آواز وں کی باقاعدہ علمی طریقہ سے تحقیق کی جاتی تھی، جب تک کہ ہم اس سے قبل کے زمانہ میں موسیقی کا ارتقا تصور نہ کریں یہ بات ناقابل فہم معلوم ہوگی۔

عہد برہمن کا اور اپنشد کا ادب و علم نا فہم اشارات اور کنایات میں پوشیدہ ہے جن سے اس زمانہ کے بند مذہب کی روحانیت کی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جب اشعار کو وہ جامہ جس سے مذہبیت اور روحانیت کا دھوکا ہوتا ہے، اتر جاتا ہے تب سروں اور راگوں سے ان کا براہ راست تعلق واضح طور پر ظاہر ہوجاتا ہے، موسیقی کے "سرجن" اور "گرم" وغیرہ اور راگ کی لطیف ساخت سروں کا شمار ترتیب اور رد و بدل اور ان کے دھیمے بنائے ہیں۔ ان میں ایسے گانے ہیں جن کا بعض سے کوئی سروکار و تعلق نہیں ہے اور باقاعدہ جن اور رنگوں کا تعلق ان نام دیوتاؤں کی نسبت سے ہے۔

"چیندوگیہ" اور دوسری "اپانشید" میں باوجود تمام چیزوں کو معدوم کرنے کے یہ بات صاف کہی گئی ہے کہ ویدوں کے پڑھنے میں بہت ہی زیادہ معنی خیز اور فوق الفطرت "اوم" کو ضرور پڑھنا چاہیے، ویسے "اوم" ہے کیا؟ یہ سب پر چھایا ہوا ہے، سب سے زیادہ اہم ہے (سب سے زیادہ جاذب) اور سب سے زیادہ پاک و متبرک ہے۔

رگ "تمام گفتگو کا ماحصل ہے اور "سام" "رگ" کا یعنی سانس ہے "رگ" اور "سام" مل کر "میتھون" یعنی جوڑا بنتا ہے "اوگیتا"، "سوارہ" ہے (یعنی صاف ستھری اور سادی آواز) اور "اوگیتا" تمام ماحصلوں کا ماحصل ہے۔

"اوم" "اوگیتا" ہے جو سب سے زیادہ بزرگ و برتر اور سب سے زیادہ قابل پرستش ہے، اس کی آواز دل کے اندر مع اپنے ساتوں سروں کے گونجا کرتی ہے، جو کہ خاموشی میں بھی موجود ہے، بزرگ و برتر ہے، اور پوشیدہ بھی ہے "برہمن" (یعنی قابل لوگ) بھی غیر مٹا اور ناقابل امتیاز اسی طرح ہوتے جاتے ہیں، جس طرح شہد میں مختلف پھولوں کی مہک و خوشبوئیں معدوم ہوجاتی ہیں اور وہاں اُن کو دائمی حفاظت اور "حیات ابدی" حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح "اوگیتا" اور اس کی مختصر آوازیں "اوم" موسیقی الفاظ اور راگوں کی ایک ترتیب ہے، گوتم بدھ کے عہد کی تمام تصانیف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موسیقی باجے، گانے اور ناچ سب جز و زندگی تھے، زندگی میں اختیار کرنے والے اخلاقیات کے اعلےٰ اصولوں کی تشبیہات ہمیشہ دوران گفتگو میں سروں اور راگوں سے دی جاتی تھیں۔

ساتویں سے انیسویں صدی تک اس مضمون پر بہترین کتابیں دستیاب ہوتی ہیں، یہ ایک قابل تعریف بات ہے کہ مستقل مکانات اور پرامن حکومت کی غیر موجودگی میں بھی "پنڈتوں" نے اپنی زندگیاں، غیر فانی تاریخ مرتب کرنے میں اور عہد تاریخ سے پیشتر کی موسیقی کو آنے والی صدیوں سے وصل کرنے میں صرف کردیں۔

بادشاہ خود علم موسیقی کے ماہر اور قدر دان اور مربی ہوتے تھے اور یہ شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کا ایک لازمی جز تصور

کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شاہی عورتیں اور شہزادیاں بھی سنگیت یعنی ناچ گانا اور بھاؤ بتانا خود اپنے سنگیت شالا (یعنی خانہ رقص و سرود) میں جو کہ خاص طور پر اسی مقصد کے لیے تیار کیے جاتے تھے اور محلوں سے ملحق ہوتے تھے، سیکھا کرتی تھیں۔

یگانہ عصر و بے نظیر یعنی فن موسیقی، (جو بعد میں سارے دنیا پر اثر کرنے کے لیے مخصوص تھا) عہد "پینینی" جو کہ لسانیات کا ماہر تھا، سے قبل ہی، راگوں کا ایک باقاعدہ طریقہ مشرق میں معلوم کر لیا گیا تھا۔ اس کے ایک عرصہ کے بعد اسی اصول پر ایرانیوں، یونانیوں، عربوں اور سب سے بعد میں انگریزوں نے بھی اپنے اپنے اصول اور قواعد مرتب کیے، جب "بہرام گور" نے جو کہ ایران کا بادشاہ تھا، ہندوستانی گویوں کے کمالات کو سنا تو اس نے ان کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔

تقریباً دس ہزار "سوختیں" (یعنی معمولی گویے)، ہند کے بادشاہ "شنا نکا" نے ایران بھیجے وہاں بہرام گور کی کشادہ دلی سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ان کو سلطنت میں داخل ہونے کی بخوشی اجازت دی گئی۔

جس وقت یونان کے مشہور نامی شہرہ آفاق بربط نواز (یعنی چنگ بجانے والے)، نے راگوں میں "اسے" اور "دای" داخل کی اور یعنی عورت نے "نیا" داخل کر کے دوہرے سروں کا سرگم سات سو سال قبل مسیح مکمل کیا تھا، اس سے پہلے ہندو دوہرے سروں کے سرگم ہندوستان میں مکمل کر چکے تھے۔ یہ سکندر اعظم ہی تھا جو دریائے سندھ کے کنارے سے اپنے ساتھ راگوں کے سرگم اپنے وطن لے گیا تھا اور تاریخی اعتبار سے یونانی ہی وہ پہلی قوم ہے جس نے پرانی دنیا میں سب سے پہلے "مرچن" یعنی چوتھائی سرگم علم سرگم چلائے۔

ہندوؤں کا علم موسیقی کا باوا آدم، کہا جا سکتا ہے، رفتہ رفتہ ایران میں داخل ہونے لگا، اس کے بعد یونان میں پھر عرب میں اور وہاں سے وہ پھر ہندوستان دیس لایا گیا اس طرح اس کو پھر پرانے طرز پر لایا گیا اور وہی آج ہندوستانی موسیقی ہے ایک ہزار سال گذر گئے کہ مسلمانوں کے آغاز سے ہندوؤں کی تمام تخلیق، ترقی مسدود ہو گئی، لیکن انجام کار فاتح بادشاہوں نے ہندوؤں کے علم موسیقی کو ایک اعلیٰ فن ہی تصور کر کے اختیار نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے زور آور اور تاکیدی حمایت اور راہ و رسم سے اصلی موسیقی کے کچھ خد و خال بھی تبدیل کر دیے، جنوبی ہند باہر کے اثرات سے محفوظ رہا اور خونی جنگوں نے آریوں کے جذبات اور احساسات کے مواد کو ضائع نہیں ہونے دیا اور شاستروں کی روایات کو قائم و برقرار رکھا ہے وہ بہت ہی صحیح ہے اس لیے اس کو بتدریج کتابوں سے با قاعدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شمالی ہند میں بڑی گڑبڑ ہو گئی موسیقی کو موجودہ دو اقسام میں تقسیم کر دیا گیا، ہندوستانی یعنی شمالی اور کرناٹکی یعنی جنوبی یہی دو اسکول صدیوں اس ملک میں رائج اور قائم رہے ہیں اور خاص فرق ان کے درمیان آزاد "شدھ" یا ابتدائی سرگم میں پایا جاتا ہے، ہندوستانی کا انحصار "بلاول" کے سرگم پر ہے، اور کرناٹکی کا دارومدار "کنکنگی" کے سرگم پر ہے، ان دونوں میں سے شمالی موسیقی کی لطافت، کشش و جاذبیت کا اس موجودہ بگڑی ہوئی حالت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مورخ مینادر پاس "کے مشہور دور حکومت میں اصلاحات اور فنون لطیفہ کو عروج کمال پر پہونچانے میں بہت ہی پرجوش کوشش کی گئی، اسی وجہ سے اس دور کی لاتعداد ہر قسم کی شاندار یادگاریں۔ بہادر، شریف، پرشوکت اور شاندار قوم کی جس نے فتح کیا حکومت کی ترقی کی اور جس نے دائمی برقرار رہنے والی شان و شوکت حاصل کی برقرار ہیں، اٹھارھویں صدی کے آخری نصف حصہ میں مسلمانوں کا تنزل ہو چلا تھا اور ملک پر انگریزوں کا اثر بڑھتا جا رہا تھا اور تمام ملکی صنعت و حرفت تباہ ہو چلی تھی، موسیقی بھی آہستہ مگر یقینی تباہی کے نتیجہ میں آ گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کا بہترین یگانہ صرف نام کو باقی رہ گیا ہے۔

فنی اعتبار سے ہندوستانی موسیقی نہایت ہی عمدہ اور باقاعدہ طور پر مکمل ہے، جہاں تک سروں اور راگوں کا تعلق ہے جس میں پورے بائیس راگ ہیں، اس لیے سروں کو ان کی اصلی حالت میں باقاعدہ ادا کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہیں ہے جس کے لیے سالہا سال کی محنت و کاوش درکار ہے اس مختلف اقسام (قسمت) میں پورے دو سو مختلف راگ ہیں اور قاعدہ کی رو سے وہ دن اور رات کو پنے اپنے وقت و محل کے لحاظ سے گائے جاتے ہیں، راگوں اور سروں کا اتار چڑھاؤ علم الحساب کی رو سے بہترین

باقاعدہ ہے۔ یہ راگ یعنی سُر ہنگل میں ہوا کی سنسناہٹ ستاروں کی رفتار پانی کی روانی اور چڑیوں کے زمزموں اور جھونکوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔
عہد گزشتہ کے قانون ساز فطرت کو نظر غائر سے مطالعہ کرنے والے طلبا ہوتے تھے انھوں نے آوازوں کے پوشیدہ رازوں کو
کھول کر منظر عام پر سب کے سامنے پیش کیا۔ اور انھوں نے بعض صاف اور نمایاں آوازوں کو باقاعدہ وقت و موسم کے لحاظ
سے ترتیب دے کر ان کو طبیعت کے مطابق بنا دیا۔

مغربی اور ہندوستانی موسیقی میں دو نمایاں فرق پائے جاتے ہیں۔ اول الذکر تو بالکل ایک کل کی مانند صرف ایک ہی چیز
ہوا کرتی ہے جو اس سے پہلے کوئی پیدا کر چکا ہے مگر اس میں اس غریب اُستاد کو اپنی انفرادیت دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ بس کل کی مانند
ایک ہی چیز کو دہراتا رہتا ہے لیکن ہندوستانی گویا راگ کے ڈھانچہ کو لے کر اس میں تاؤس مختلف الانواع تبدیلیاں پیدا کرتا ہے اسمیں
نئی طرح کی تفریق اور رنگینی بھی پیدا کرتا ہے اس کو خود اپنی ذہانت اور قابلیت کے اظہار کا موقع ملتا ہے اور گانے کے دوران میں وہ اسی
وقت نئی نئی الاپیں اور اتار چڑھاؤ پیدا کر کے اپنی انفرادیت ظاہر کر سکتا ہے۔

یہی حال تال اور سُر کا ہے۔ مغربی نغمے میں برابر اتار چڑھاؤ کے لحاظ سے صرف ایک ہی قسم کی تال استعمال ہوتی ہے، جب کہ
ہندوستانی میں مختلف سروں کے اعتبار سے کئی قسم کی تال اور لے ہوتی ہے جس میں گویّے کو ایک بہترین اتار چڑھاؤ، لطافت و دلکشی
پیدا کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے بس اس سے کہ تم ایک سُر یا راگ سے لطف اندوز ہو سکو وہ فوراً دوسرے پر پہونچ جاتا ہے اور اس طرح
اس نے نہایت ہی لطیف دلکشی اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک انجان اور ناواقف شخص کے لیے سروں کا یہ اتار چڑھاؤ نہ حرکت
لطافت اور تانوں میں یکی دلکشی لامعنی و فضول معلوم ہوتی ہے اور مشکل سے قابل سماعت تصور کی جاتی ہے۔ وہ محض نغمہ میں
ایک ... روانی چاہتا ہے جو ایک دوسرے میں جذب ہوتی چلی جائے اور اس کو "فردوس گوش" بنا دے۔

(ترجمہ) اثر فتح پوری

ماخوذ از سالنامہ نیرنگ خیال جنوری ۱۹۲۹ء

انعامی سوال

"ایک آدمی ایک کتاب کی تین جلدیں خریدتا اور ان کو اپنی الماری میں رکھتا ہے ہر کتاب میں سرورق کے علاوہ تین سو
صفحہ ہیں۔ ایک کیڑا پہلی جلد کے پہلے صفحہ سے لے کر تیسری جلد کے آخری صفحہ تک ایک سوراخ کر دیتا ہے۔ بتاؤ
کیڑے نے کتنے صفحہ اور کتنے سرورق کاٹے"

اس سوال کا صحیح جواب دینے والے حضرات کی خدمت میں حضرت نسیم سندیلوی کے افسانوں کے مجموعہ
"آغاز خیال" کی ایک کاپی جس کی قیمت آٹھ آنہ ہے مفت پیش کی جائے گی۔ اس سوال کا جواب صرف وہی حضرات
دے سکتے ہیں جو "اضطراب" کے خریدار ہیں۔ جواب پر نمبر خریداری لکھنا ضروری ہے۔ ایک خریدار صرف ایک
جواب بھیج سکتا ہے۔ محصول ڈاک کے لیے تین پیسہ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔ تمام جوابات ۲۸ جولائی تک پہونچ
جانے چاہییں۔ اس سوال کا جواب اگست کے پرچہ میں شائع ہوگا۔

منیجر ماہنامہ "اضطراب"
نمبر ۲ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

ساقی

(از حضرت مجذوب انسپکٹر آف اسکولس بنارس ڈویژن)

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

مجھے ہر شے ہے ساقی جب سے ہے تو دلنشیں ساقی
شجر ساقی حجر ساقی فلک ساقی زمیں ساقی

تری محفل میں کیا انوار ہیں اے مہ جبیں ساقی
اتر آیا زمیں پر آج کیا عرش بریں ساقی

یہیں سے پاؤں نگاہ نعمت دنیا و دیں ساقی
کہیں کیوں جاؤں تیرے میکدے میں کیا نہیں ساقی

ترے رندوں پہ سارے کھل گئے اسرار دیں ساقی
ہو علم الیقیں عین الیقیں حق الیقیں ساقی

یہاں تو محتسب ہر وقت ہے اب دلنشیں ساقی
جہاں گردن جھکا کر بیٹھ جاؤں میں وہیں ساقی

زبردستی لگا دی آج بوتل منہ سے ساقی نے
میں کہتا ہی رہا ہاں ہاں نہیں ساقی نہیں ساقی

عجب ہے تیرے میخانے کا اے پیر مغاں عالم
کہیں ساغر کہیں مے کش کہیں مینا کہیں ساقی

کہاں سے مجکو پہونچایا کہاں پیر مغاں تو نے
مرا میخانہ اب لاہوت ہے روح الامیں ساقی

نہ چھیڑ اے محتسب میں ہوں مے وحدت کا متوالا
میں وہ میخوار ہوں جسکے ہیں ختم المرسلیں ساقی

وہی باتیں تو مجذوب اپنی بڑ میں بھی سناتا ہے
ذرا سنبھلے ہوئے لفظوں میں جو تو نے کہیں ساقی

خودکشی

(نسیم سندیلوی)

یہ مانا کہ خودکشی حرام ہے۔ ملک کے قانون سے جرم۔
لیکن ...؟

ایک انسان جو اپنی بساط بھر اپنی قوت بازو پر بھروسہ کیے ہوئے رات دن کی مشقت سے فصل بوتا ہے [illegible] کاشت۔ لہلہاتی ہوئی سرسبز کھیتی کی آبیاری کرتا ہے۔ اپنا آرام اپنا سکون فصل کی امید دل پر قربان کرتا ہے لیکن اس پر بھی پیداوار اس کی اپنی مزدوری کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ اس کو لگان کی ادائگی کے لیے قرض لینا پڑتا ہے۔ دو چار جانور جو اس کی [illegible] مہاجن نے کہاں [illegible] قرض کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ایک دو چھپری اور ایک ٹوٹی پھوٹی [illegible] اس کی اپنی تھی سو وہ بھی دوسرے کو سونپ دینا ہوگی۔ جس نے عمر اس بات کی متقاضی ہے [illegible] زندگی بسر [illegible] تکالیف کی [illegible] ٹوٹنے لگ گئے ۔۔۔ چلتے ساحل کے دھندلے امکانات [illegible] لکھنا چاہتا [illegible] نیا خیال [illegible] ایک وقت کی [illegible] زندگی مسترد آتی ہے وہ [illegible] خواہشات [illegible] اضطراب کو اور زیادہ بیتاب کرتے ہیں۔ [illegible] زمین نکال لیتا ہے۔ مہاجن نے جھونپڑی نیلام کرادی [illegible] تلاش معاش کی فکر میں اپنے بازوؤں کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے شہر کا رخ کرتا ہے مزدوری مل جاتی [illegible] لیکن شہر میں اس کی طرح سینکڑوں آوارہ پھرتے ہیں جنھیں رات کو سونے کے لیے زمین تک نہیں ملتی۔ اللہ رے انسان کے لیے مرنے کے بعد قبر کے لیے تو دو گز زمین مل جاتی ہے لیکن زندگی میں [illegible] بال بچے والے اُسے غنڈہ سمجھ کر کام پر نہیں لگاتے دوسرے تیسرے چار چھ پیسے مزدوری سے مل جاتے ہیں وہ [illegible] پیٹ پالتا ہے۔ رات میں جاڑے کی شدت سے بچنے کے لیے سبزی منڈی [illegible] آگ جلا کر تاپتا ہے [illegible] پولیس کی نظریں اس پر پڑ چکی ہیں۔ قریب کی دوکان میں نقب لگتی ہے بیچارہ جسے آج کئی دن سے کام نہیں ملا۔ جو محنت کا پیسہ کھاتا چاہتا تھا اس وقت پیٹ پر پتھر باندھے ایک کونہ میں لاغر پڑا ہے۔ [illegible] ایک اس کے بازو ہی اس کے حامی تھے سو آج وہ بھی جواب دے گئے۔ وہ ہر چیز گوارا کر سکتا تھا لیکن خودداری پر حرف غلط۔ بیجا الزام۔ بدنامی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ کیا وہ پولیس کے ہاتھوں ذلت کی بے گناہ موت مرے یا کنوئیں میں گر کر جان دے؟

اس کی آنکھوں میں ایک روشنی سی پیدا ہوتی ہے وہ لڑکھڑاتا اٹھتا ہے سہارا لیتے ہوئے کنوئیں کی جگت تک جاتا ہے۔۔ کنوئیں کا پانی کچھ دیر بے چین رہ کر پھر برابر ہو جاتا ہے۔۔۔ آواز کچھ دیر کے لیے گونج کر خاموش ہو جاتی ہے۔۔۔

کیا یہ خودکشی ہے؟ سڑک کے کنارے ایک اپاہج گرد و غبار میں اٹی بیٹھی ہے۔ اس کی نگاہیں ہر راہ گیر پر گڑ جاتی ہیں۔ وہ ان سے خدا کی راہ پر بھیک مانگتی ہے۔ وہ گڑگڑاتی ہے۔ اپنے دودھ پیتے بچے کا جسے وہ سینے سے چمٹائے ہے۔ واسطہ دیتی ہے

اس کے لاغر جسم میں صرف چند ہڈیاں اور کھال باقی رہ گئی ہیں چیتھڑوں سے زیادہ خاک راہ اس کی ستر پوشی کرتی ہے خوش پوشاک انسان اُس سے نگاہ بچا کر نکلتے ہیں۔ سواری پر چلنے والے اس غریب کو ایک شہری لعنت تصور کرتے ہیں۔ کچھ راہ چلتے دور سے پیسہ اس کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ بھکارن پیسہ اُٹھا لیتی ہے اور بہتر دن دعائیں دیتی ہے۔ شام تک جو دو چار پیسے اُسے ملتے ہیں وہ کسی خونچہ والے کو دے کر اس سے وہ چیز لیتی ہے جو وزن میں سب سے زیادہ ہو۔ گرمیوں میں دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے وہ ایک درخت کی سوکھی ٹہنی زمین پر گاڑ لیتی ہے جس پر ایک پھٹا ہوا کپڑا سائبان کا کام دیتا ہے اور جس کا سایہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ بچہ کو بچا سکے۔ اُسے اپنی فکر نہیں ہے۔ وہ اس بچے کے لیے یہ سب کرتی ہے۔ اس کی امید اس کی آشا صرف یہ بچہ ہے۔

بچہ بیمار پڑا ماں اس قابل نہیں کہ اُسے اسپتال پہونچائے لاچار ہر شخص سے التجا کرتی ہے ان کے سامنے گڑگڑاتی ہے لیکن انسانیت میں اتنا رحم کہاں امیر امیر دن کے ہمدرد بنتے ہیں۔ غریب اپنی انفرادیت جدا کھوئے ہوئے ہیں اُن میں کوئی منظم جماعت نہیں جو آڑے دنوں ان کے کام آئے۔ راہ چلتے سفید پوش ایک میلے کچیلے بچہ کو کس طرح چھو سکتے تھے؟۔

کچھ دنوں سے وہ خاموش ہے اس کی گود خالی ہے اُس نے پیسہ مانگنا بھی بند کر دیا ہے۔ وہ تمام دن خاموش پڑی رہتی ہے۔ وہ کوڑا جسے وہ پہلے ہاتھ سے اکثر ذرا پرے ہٹا دیتی تھی اب اس کے چاروں اور دن سے بالکل قریب جمع ہو رہا ہے اگر کبھی کوئی اس کی طرف پیسہ پھینک بھی دیتا ہے تو وہ نہیں اُٹھاتی۔ اس کی ایک امید تھی سو جاتی رہی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا ننھا بچہ بڑا ہو کر ضعیفی میں اس کی لاٹھی پکڑے گا...... سہارا ٹوٹ گیا اب اُسے کس کی سوت مرنا ہے وہ جانتی ہے کہ ایک دن اس کی زبان بھی لکنت کرنے لگے گی تب وہ بھوکوں مرے گی پھر کیوں نہ وہ جلدی ہی اپنے ننھے بچے سے جا ملے۔ اُس نے اپنے آپ کو موت کے آغوش میں دیدیا...

وہ بھوکوں مر گئی۔

کیا اُس نے خودکشی کی؟

ایک نوجوان بیوہ جس نے کبھی اپنے سوامی کی شکل نہیں دیکھی جس کا سہاگ صرف ایک رات کا تھا۔ پہلے دن سہاگن تھی سب اسکو شگون نیک سمجھتے تھے۔ کنواری لڑکیاں اُسکے گرد گھیرا باندھے تھیں سب ہی اس کا گھونگھٹ اُٹھا کر شکل دیکھنے کے لیے بیتاب تھیں دوسرے دن اس کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دی گئیں۔ سرخ لباس اُتار لیا گیا سسرال والے اُسے ایک منٹ اپنی پناہ میں رکھنے کے روادار نہ رہے وہ اُلٹے پاؤں میکے واپس کر دی گئی۔ ماں باپ نے کچھ دنوں اُسے بوجھ سمجھ کر رکھا گھر بار کا تمام کام پیسنا پانی بھرنا۔ جھاڑو دینا اُس کے سپرد کر دیا گیا۔ اسی مکان میں وہ ضد میں کیا کرتی تھی اب اسی چھت کے نیچے نوکرانی کا کام کرتی ہے۔

جوان بیوہ---- سماج---- رسوائی---

وہ پانی بھرنے جاتی محلہ والے اُسے کنکھیوں سے دیکھتے۔ راہ چلتے آوازے کستے۔ دو ایک بدنامیاں دامن کبھی گاگری سے ٹکرا جاتے۔ لوگوں کی اُس پر انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ ماں باپ نے عزت بچانے کے لیے غریب کو ودھوا آشرم بھیجدیا۔

وہ کچھ دنوں آرام سے رہی تمام دن کام کرتی رات کو جو کچھ مل جاتا کھا کر کوٹھری میں پڑ رہتی۔ وہاں مذہب کے پیشواؤں کی نظر اس پر پڑی۔ سر بازار جو بیوہ کی امانت کا بیڑا اٹھاتے ہیں آشرم کی جان۔ دیواری میں انھیں بھی نظر ہوا کے شرم نہیں آتی بیچاری کو عصمت بچانے کے لالے پڑ گئے۔ انکار پر اُسے مشکل کام دیا جانے لگا اُس پر سختی کی جانے لگی نت نئے مظالم ٹوٹتے اور وہ خاموش رہتی۔ اُس نے ہم قفس سے فریاد چاہی وہ اس نادانی پر ہنس دیں۔ اُن کا اپنا یہ دھاک ہو چکا تھا وہ ہر ایک کو اپنا سا بنانا چاہتی تھیں۔

سورج ڈوب رہا تھا افق پر لالی پھیلی ہوئی تھی آشرم کے پچھلے حصہ میں ایک نوجوان عورت ساکت پڑی تھی سفید ساڑی خون سے لال رنگ گئی تھی شاید کہ آج پھر شب عروسی کا انتظار تھا۔

کیا یہ خودکشی تھی؟

دنیا!

حضرت ماہرالقادری حیدرآباد دکن)

مورکھ اور بٹ مار ہے دنیا — جھوٹوں کا دربار ہے دنیا

ہار کو دنیا جیت کہے ہے — جواری کی سی ہار ہے دنیا

کون کسی کا غم کھاتا ہے — کہنے کو غمخوار ہے دنیا

وقت پڑے تو کام نہ آئے — لکڑی کی تلوار ہے دنیا

پیتل، سونا بن جاتی ہے — دھوکے کا بیوپار ہے دنیا

امیدوں کی عمر ہی کتنی! — دو دن کی پھلوار ہے دنیا

دل میں کپٹ اور میٹھی باتیں — کتنی دنیادار ہے دنیا

تو دنیا کو سمجھا کیا ہے!

بابا! کس کی یار ہے دنیا

ماں جایا

محترمہ شفیق بانو صاحبہ

نیم کے پیڑ میں جھولا پڑا ہے اور برسات کی ٹھنڈی ہوائیں روح میں تازگی پیدا کر رہی ہیں۔ محمودہ اور اس کی سہیلی صغریٰ جھولا جھول رہی ہیں۔ دفعتاً محمودہ کو خیال آگیا کہ وہ میکے کی سرزمین میں نہیں بلکہ سسرال میں ہے۔ فوراً خیالات نے پلٹا کھایا نہ جانے کیا کیا باتیں یاد آنے لگیں دل بھر آنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس نے اپنا خیال اپنے اس بھائی کی طرف دوڑایا جس کو اس نے بڑی محبت سے بچپن سے پالا تھا اور جو بیاہ جیسا اس نے ہی کا مرنا تک بھلا دیا تھا۔

"لیکن میرا اچھا بھیا تو مجھے کبھی نہ بھول سکے گا" اس خیال سے فوراً خوشی سے گیت کا رخ بدل دیا۔ لہرا لہرا کر ساون کا یہ گیت گانے لگی۔

نیم کی نبولی پکی ساون بھی کبھی آوے گا
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

آنکھوں سے رنج اور خوشی کے ملے جلے آنسو گر پڑے۔ صغریٰ نے کہا "ہائیں محمودہ تم بالکل پگلی ہو ہنستے ہنستے رو کیوں پڑیں؟"

"نہیں تو ـــ کہاں؟ تمہیں تو خواہ مخواہ کا وہم ہو گیا ہے جب دیکھو تب یہی پوچھتی رہتی ہو۔ یوں ہی میری آنکھوں سے کبھی کبھی پانی آنے لگتا ہے۔ میری آنکھیں کچھ کمزور ہیں"

"محمودہ جھوٹ اور پھر مجھ سے ـــ سچ بتاؤ ـــ تمہیں میری قسم کیا بات ہے؟"

"تم تو سر ہو جاتی ہو۔ کوئی بات ہو تو بتاؤں۔ یوں ہی دل گھبرا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں ـــ بھائی اور بھیا یاد آرہے ہیں۔ چھوٹا بھیا تو بہت ہی یاد آرہا ہے"

"تو یہ کون سی بڑی بات ہے تم گھر دو بلا بھیجو"

"چھوٹے بھیا کو تو میں نے بارہا کہہ بھیجا لکھا پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ رہا تو ہیں ہمارا وہاں جانے کی یہ بات ہے کہ میں خود سے بغیر بلائے نہیں جاتی جب سب بلائیں گے تو جاؤں گی ایسے تو سسرال میں بات بگڑ جاتی ہوگی"

کچھ روز بعد محمودہ کو میکے سے بلاوا آیا اور وہ چلی گئی۔ بہت آؤ بھگت رہی میز پر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ بیچ بیچ میں بھاوج کہتی گئی "چھوٹے بھیا دیکھنا یہ قورمہ کی پلیٹ محمودہ کے سامنے رکھو اور یہ حلوہ کسی پرچ میں۔ اور ہاں بھول گئی یہ سیب کی ترکاری بھی مدد ـــ تو بہن محمودہ! یہیں تمہارا گھر ہے تکلف کیا تو چل بھی کھاؤ ـــ تھوڑا اور کھاؤ نا ـــ" غرض سب کھلاتے رہے اور محمودہ "بس! بس!" کرتی رہی۔

جتنے دن بھی محمودہ میکے میں رہی سب جان چھڑکتے رہے۔ خاص کر چھوٹے بھیا تو ہر وقت بس گلے میں باہیں ڈالے "میری محمودہ میری بہن۔ میری پیاری اچھی آپی" گویا یہی کرتے تھے۔ اس کے بعد محمودہ سسرال واپس گئی لیکن ہر مہینہ چھوٹے بھیا کو طرح طرح کی چیزیں پارسل کرتی رہی ـــ ماں کا غم بھیا کے خیال نے دل سے مٹا دیا۔

ایک زمانے تک محمودہ پھولوں کی طرح رہی۔ انقلاب نے کروٹ لی اور محمودہ کے سر کا "تاج" لٹ گیا یعنی بیوگی نے اپنا غمگین آنچل سر پر ڈالا۔ شوہر کے اچانک مرنے سے اس کے دماغ پر بہت برا اثر پڑا۔ سسرال والوں نے دنیا میں جو کرتے ہیں وہی کیا یعنی اس کے سایہ کو بھی منحوس سمجھنے لگے۔ اس کا وجود منحوس خیال کیا جانے لگا۔ اس کی اگلی پچھلی باتوں کا ذرا ذرا سی غلطیوں کا بدلہ اس سے لینے لگے۔ ایسے موقع پر محمودہ کو پھر چھوٹے بھیا کی یاد آئی اور میکہ پہونچی۔ چھوٹے بھیا کی شادی ہو چکی تھی گود میں ہنستا کھیلتا ایک بچہ

ہی تھا۔ سارا گھر محمودہ کے ناخواندہ مہماں بن کر آنے سے کچھ چپ سا ہو گیا۔ محمودہ تو رو دیکھ کر چھوٹے بھیا کے گھر چلی گئی، پر بچی کچھ حیرت سے ہو گئے۔ روئے تو سب لیکن یہی کہہ کر کہ "ہائے اب کیا ہوگا ـــ کیسے زندگی گزرے گی۔ کیونکر گزارہ ہوگا" لیکن کسی نے نہیں کہا کہ محمودہ کا دل کس طرح ہاتھوں میں رکھنا چاہیے۔ ایک تو صدمہ اور پہ سے یہ سلوک۔ محمودہ کا دل مایوس ہو گیا اور وہ شام کو نڈھال ہو کر پڑ گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ ہو گیا ـــ چھوٹے بھیا کی ساس بھی بھیا ہی کے پاس رہتی تھیں اور بیٹی کا گھر گویا اُن کا ٹھکانہ تھا۔ انہیں محمودہ کا ہمیشہ کے لیے یہاں آ جانا سب سے ناگوار تھا۔ اول دن سے [illegible] تھا۔ کچھ کہنے سننے کا موقع تلاش کر رہی تھیں۔ ایک دن بیٹی سے الگ داماد سے باتیں کرتے کرتے بولیں "دیکھو بیٹا بہت ماننا ایک بات کہوں تمہاری بہن کی حالت اچھی نہیں۔ خود بخود بیٹھے بیٹھے بڑبڑایا کرتی ہیں۔ اگر نہیں کھاتیں تو سارا سارا دن نہیں کھاتیں اور جب کھانے بیٹھ جاتی ہیں تو پھر کھاتی ہی چلی جاتی ہیں۔ بچہ والا گھر ہے تم کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھاؤ، تو دیوانوں کا سا عالم ہے اللہ نہ کرے زیادہ ہو گیا تو سارے گھر کا ناک میں دم ہو جائے گا تم تو جانتے ہی ہو شمسہ کی عادت کو۔ کتنی دکھی ہے۔ تمہارے خوف سے ماں باپ سے بول تک نہیں کرتی لیکن میری بچی [illegible] رہ گئی ہے دن بدن پیلی ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے تو یہ غم کھائے جا رہا ہے۔ پھول سا بچہ [illegible] دودھ تو خشک ہو گیا فکر کے مارے۔ تمہیں اللہ بچائے [illegible] رہنا سہنا ایک گھر میں تو بہتر نہیں ہو سکتا ـــ [illegible] آگے کیا ہوگا۔" یہ کہہ کر [illegible] چھوٹے بھیا تو بس ختم ہو گئے۔ بیوی کی مظلومیت، بچے کی ممتا کا جوش لہریں لینے لگا۔ ساس کی بات دل میں پھانس بن کر رہ گئی اور ایسے قائل ہوئے کہ بولے "ہاں امی جان میری تو خود فکر کے مارے جان جلی میں پڑی رہتی ہے، اور سوچتا رہتا ہوں کہ کیا کروں، دیکھیے میرے ساتھ سب نے دھوکا کیا، [illegible] بھی مزے میں رہیں جنھوں نے بیاں سے چھوٹتے ہی صاف انکار کر دیا۔ یہ گھر ہے سرائے نہیں ہمیں اپنا ہی گزارہ کرنا مشکل ہے۔ بڑے بھیا نے بھی اول دن سے برتن الگ کر دیے تھے اور ساتھ کھانا پینا کو منع کر دیا۔ بیوی اور بچوں سے بھی منع کر دیا۔ ایک میں ہی فالتو تھا نظر آیا جو میری جان کو کبھی ختم نہ ہونے والی مصیبت لگا دی۔ دنیا میں خود غرضی کا دور دورہ ہے سوائے مطلب کے کوئی بات نہیں کرتا۔ میری تنخواہ بھی تو ایک سو [illegible] ہی [illegible] روپے [illegible]"

داماد کو بھڑکا کر ساس [illegible] کی طرح ہاں میں ہاں ملاتی رہیں اور بیوی بھی دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی اور سوا روپیہ کی نیاز دربار پیر [illegible] دل میں بولی۔

شام کا وقت تھا چھوٹے بھیا دفتر سے آئے بچے کے لیے پھل اور مٹھائی لائے تھے لا کر پلنگ پر ڈال دیے۔ محمودہ کے فرشتوں کو بھی ان کا [illegible] کی خبر نہ تھی، وہ بچاری تو دن بھر بچے کے کپڑے دھونے میں لگی رہتی۔ گھر کی جھاڑو دینے میں۔ برتن دھونے میں۔ اور دوپہر کو کپڑے سینے میں۔ یہ جو کام یہ ماں بیٹیاں دے دیتیں۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر یہ پھل اٹھا پلیٹ میں رکھ دیے بس اُن میں پھوٹ لگ گئی یا سانپ سونگھ گیا۔ ساس نے بیٹی اور بچے کو نہ کھانے دیے اور داماد سے بھی منع کر دیا چکنی چپڑی باتیں بنا کر۔ محمودہ کے زخمی دل پر اس طرح عمل کا بڑا گہرا اثر پڑا اور وہ ایک کونے میں جا کر رونے لگی۔ سسکیوں اور آہوں کی آواز نے چھوٹے بھیا کو متوجہ کیا اور وہ چراغ پا ہو کر پہونچ گئے۔ بھرے بیٹھے تو تھے ہی ایک ہی سانس میں ہزاروں باتیں سنا ڈالیں۔

"دیکھو بی، تم اگر میری بہن نہ ہوتیں تو تمہاری اس مکاری پہ سڑک پر کھڑا کر دیتا آخر بات ہی کیا ہوئی! صبح رونا۔ شام رونا۔ رات کو رونا جب دیکھو نحوست پھیلانا۔ میں یہ بالکل پسند نہیں کرتا۔ میری زندگی تو مصیبت بن گئی دن بھر دفتر میں مروں اور شام کو تمہاری شکل دیکھ کر خون کھولے۔ آخر کیا میں ہی رہ گیا ہوں اور بھی تو بھائی ہیں۔ دشمن تو نہیں۔ اُن پر بھی تو تمہارا رکھنا اور خرچ اٹھانا فرض ہے۔ میں ہی اکیلا کہاں تک جان کھپاؤں۔ ٹھیک سے آدمی بن کر رہنا ہے تو رہو نہیں تو چلتی پھرتی نظر آؤ۔ میں تو تمہارے اس مذاق سے عاجز آ گیا۔"

محمودہ چھوٹے بھیا کے منہ سے ایسی باتیں سن کر سکتہ میں آ گئی۔ روتے ہوئے بولی۔

"بھیا تم بھی مجھ بدنصیب کو دھتکارنے لگے یہ باتیں اور تم؟ آخر میرا قصور کیا؟ میں تو تم سے کچھ بھی شکایت نہیں کرتی نہ کچھ کہتی ہوں۔"

"کھو گئی گیا؟ سارا گھر تو تمہاری خدمت میں لگا رہتا ہے اوپر سے تمہارے نخرے ـــــ خیر میں زیادہ بات بڑھانا نہیں چاہتا دنیا میں بہت سی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں تمہاری طرح پاگل پن نہیں دکھلاتیں۔"

"بھیا میرے دل کا دکھ تو سمجھو۔ تم نے بھی ہمدردی چھوڑ دی تو کیا ہوگا۔ میں نے تو تمہیں اولاد کی طرح بچپن سے رکھا اور سمجھا۔ جو بھی خدمت بن پڑی کرتی رہی۔ آج میرے اوپر وقت پڑا تو تم منہ پھیرنے لگے۔ بھاوج بھی الٹی سیدھی ہر وقت سناتی ہیں اور تمہاری ساس بھی۔ ظاہر ہے کہ میں بہن ہوں میرا بھی کچھ حق ہے۔"

"بس برائی کرنی شروع کر دی۔ میری بیوی جیسی ہے میں خوب جانتا ہوں وہ تمہیں آدھی بات بھی نہیں کہتی اس قدر مسکین ہے اور تم کہ میں حیران ہوں۔ بچہ کو رلا کر سارا کام کرتی رہتی ہے۔ رہ گئی ساس تو وہ بھی میری ماں سے بڑھ کر شفیق ہیں ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ہمدردی کر ہی نہیں سکتا۔ چاند پر خاک ڈالنے سے نہیں پڑتی میں اپنی بیوی اور ساس کی برائی نہیں سن سکتا۔"

محمودہ روتی رہی اور ایسی دردناک آہوں کے ساتھ کہ کلیجہ منہ کو آتا لیکن بھیا کا دل ٹس سے مس نہ ہوا۔ غصہ سے آگے بڑھے اور ہاتھ پکڑ کر کہا "اس کان سنو چاہے اُس کان یہ مکاری میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے گھر سے اپنا بوریا بستر لے جاؤ اور دوسرے بھائیوں کا بھی کچھ دن مزہ چکھو وہ لوگ شاید تمہیں پھولوں کی طرح رکھیں۔"

یہ جملہ طنز سے کہا اور روتی ہوئی محمودہ کو گھسیٹتے ہوئے دروازہ تک لا کر چھوڑ دیا اور دھکا دے کر دروازہ بند کر لیا۔ ساس بہو بیوی یہ منظر دیکھتی رہیں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں کہ چلو جھگڑا ختم ہوا یا دُبھر آئے کا خرچہ کم ہو گیا۔ ساس کھنکی کی طرح اٹھی اور کہا۔

"اے بیٹا ایسا غصہ نہیں کرتے تم تو فخر ادارہ ہو اور سمجھدار یوں تمہیں کہنا لازم نہیں تھا۔ باہر سب سے جا کر وہ میرا اور بچی کا بھی نام بدنام کرے گی اپنے کرتوت کچھ نہ بتلائے گی۔"

"چھوٹے بھیا بات ٹالنے کی غرض سے بولے۔ اوہو ابھی آپ رہنے دیجیے میں اپنے معاملات کو خوب سمجھتا ہوں۔ اپنی اچھی خاصی زندگی کو آخر کیوں محمودہ کو رکھ کر عذاب بنا لوں۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ باز آیا ایسی ہمدردی سے۔"

رات کے دس گیارہ کا عمل۔ بیکس مصیبت زدہ محمودہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی ہر قدم پر ٹھوکر کھا کر گرتی تھی اور کہتی تھی۔

"ہائے بھیا تم نے بھی مجھے مکار سمجھا۔ مجھ کو نہ سمجھا۔ بدنصیب نہ جانا۔ اُسے وہ دن یاد آئے جب جھولے پر بھی انہیں کمبخت بھائیوں کی یاد دل کو مسوستی تھی۔ ساون کا گیت بھیا کی یاد میں گاتی تھی۔

"جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا۔"

آج رکھنے اور بلانے کے بدلے گھر سے نکالا تھا۔ محمودہ کو یہ بات بھی یاد آئی کہ اپنے اچھے حال میں شوہر سے چھپا چھپا کر کتنی بار چھوٹے بھیا کے اچھے اچھے کپڑے بنائے ـــــ بچے کو سی کر بھیجے اور جب ضرورت پڑی دو ڈھائی سو روپیہ چپکے سے دے دیا۔ آج اس کا یہ بدلا تھا۔ انہیں خیالات میں آنسو بہاتی چلی جا رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ راستہ سے ناواقف۔ کبھی کبھی بجلی چمک کر راستہ بتا دیتی تھی۔ آج بھی برسات کا سماں تھا لیکن نہ وہ جھولا تھا نہ وہ جذبات تھے!! آنکھوں سے آج بھی آنسو نکل رہے تھے۔ لیکن اُن سے اُس کی جھلک غائب ہو چکی تھی یاس کا رنگ غالب آ چکا تھا۔ دفعتاً اُسے عہد گذشتہ کی وہ گھڑی یاد آئی اور وہ گنگنانے لگی۔

"جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا"

لیکن آج اس گانے سے دل پر برچھی سی لگی۔ ایک دفعہ کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گری اور گر کر جسم لہولہان ہو گیا۔ سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ آنکھیں غشی اور موت کی کشمکش سلجھا رہی تھیں!!

زبان لڑکھڑا چکی تھی لیکن درد بھرے الفاظ فضا میں تاریک برسات کی رات میں گونج رہے تھے۔

"جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا"

"ایک خط کا جواب"

جناب مسعود اختر۔ جمال صاحب

سمجھتی ہو کیا تم؟ نہ یاد آؤں گا میں — تمہارا ہی احساس بن جاؤں گا میں

کبھی جب تمہیں مضطرب پاؤں گا میں — سکوں بن کے دل میں اتر آؤں گا میں

ابھی تک محبت فسانہ ہے لیکن، — اسے اک حقیقت بنا جاؤں گا میں

یہ ممکن ہے مجکو زمانہ بھلا دے — مگر تم کو ہر لحظہ یاد آؤں گا میں

سنو گی تم اکثر مرے دل کی دھڑکن — فضاؤں میں یوں جذب ہو جاؤں گا میں

سکون بخش۔ پر کیف راتوں میں اکثر — تمہیں یاد آؤں گا۔ تڑپاؤں گا میں

تمہارے تخیل میں رہ کر ہمیشہ — جہاں جاؤ گی تم۔ وہاں جاؤں گا میں

کبھی مجھ سے رنگیں تبسم کی دنیا — کبھی آنسوؤں میں نظر آؤں گا میں

کبھی گیت غم کے سناؤں گا تم کو — خوشی کے ترانے کبھی گاؤں گا میں

کبھی چاندنی بن کے آؤں گا دل میں — کبھی موج بنکر گزر جاؤں گا میں

کبھی رنگ و بو کی حسیں وادیوں میں — تمہیں حسن بن کر نظر آؤں گا میں

جو گھبراؤ گی تم ہجوم طرب میں — تصور میں یاد آ کے بہلاؤں گا میں

ہواؤں کی خاموش سرگوشیوں میں — تمہیں رازِ دل آ کے سمجھاؤں گا میں

نگاہوں میں چھا جائے گا گیت رنگیں — وہ سے آبشاروں سے چھلکاؤں گا میں
دہونے سے میرے کمی کچھ نہ ہو گی — محبت کی دنیا بسا جاؤں گا میں
چراغِ نفس بجھ رہا ہے تو کیا غم
جمالِ نظر بن کے۔ چھا جاؤں گا میں

ادب لطیف :-

بھول

تنویر فاطمہ

تم سے بھول ہوئی ——— میں جانتی ہوں ——— زندگی بھی تو ایک بھول ہے ——— دنیا ——— محبت ——— وعدہ ——— وفا ——— اور نہ جانے کیا کیا ———

یہ سب بھول ہی ہیں نا ——— ؟

دنیا میں انسان صدا کی بھول ہے ——— دل میں محبت انسان کی بھول ——— تم جو چاہو کہہ لو ——— لیکن میں تو اسے بھول نہیں کہوں گی ——— تم نے محبت کی ——— جب تم پہ چھائے تھے ——— تمہارے تصورات پر پریم کا آنچل تھا ——— اس وقت۔ اس وقت تو تم اسے حقیقت جان رہے تھے ——— محبت کے سہانے سپنے تھے۔ تم نے بارہا محبت کے ابدی ہونے کا اقرار کیا تھا۔ مجھ سے بھی محبت کا اصرار ہوتا تھا۔

اور آج ———

آج جب میں محبت کی صرف حامی ہی نہیں بلکہ پجارن ہوں ——— جب مجھے محبت کی تلاش ہے۔ جب تم نے کھلے ہوئے پھولوں کو روند کر پھینک دیا ——— آج جب مجھے تمہارے بغیر یہ دنیا ——— ساری دنیا سونی معلوم ہوتی ہے ——— میں جانتی ہوں کہ تمہارے بغیر میرا رہنا دشوار ہے ——— میں تم بن اکیلی ہوں ———

تب ———

تب تم کہہ رہے ہو کہ تم سے بھول ہوئی ———

محبت بھول ہے ——— آج تم اسے بھول سمجھ رہے ہو ——— سہانے سپنے سے تعبیر کرتے ہو۔ کل میں اسے بھول سمجھی تھی

کیا محبت سچ مچ بھول ہے ——— ؟

ہاں

شفیق بانو

تمہیں تعجب ہے ——— کیوں؟ ——— انسان ہوں پتھر تو نہیں ——— پیاسے کو اگر پانی پیاس کے بعد ملے تو بیکار ہی ہوگا نا ——— ؟

ناکامی ——— صبر اور ضبط حد سے گذر جائے ——— زندگی کا نہ کوئی مقصود ہو ——— نہ دن کا ——— نہ رات کا ——— دل میں احساس ہی احساس باقی رہ گیا ہو تو آخر پھر خاموش کیسے رہوں۔

دیوانہ نے پتھر مارا ——— سب نے کہدیا۔ دیوانہ ہے ——— یہ نہ سوچا کہ دیوانے نے کیوں ایسا کیا ——— ؟

وہ بکتا رہا۔ کسی نے نہ سنا ——— کسی نے نہ سمجھا ———

اسے دیوانہ بنایا کس نے ——— ؟ یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ——— اسکے دل۔ دماغ کی بربادی کا اثر لینے والا کوئی نہیں ——— ہنستے سب ہیں۔

میں جب چیخ چیخ کر روتی ہوں تو مجھے بھی تم پاگل سمجھتی ہو ——— میرے زخموں کو نہیں دیکھیں کہ کتنے گہرے ہو چکے ——— !!

ہاں ——— تو تم مجھے دیوانہ سمجھتی ہو ——— دیوانہ کو کس نے سمجھا ہے ——— ؟

لیکن میں ———

میں دنیا کو سمجھ کر ہی دیوانی ہوئی ہوں ——— اور آج میرا سمجھنے والا کوئی نہیں ——— !!!

ادب کثیف۔

از حاجی لق لق

آؤ — پریتم آؤ!
بجلی کی ٹھنڈی روشنی۔
پنکھے کی سو ہوا۔
نلکے کا صاف شفاف پانی۔
گملوں کے خوش رنگ پھول۔
دیواروں پر سبز پلستر۔
ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔
ایسے میں بھی نہ آؤ — تو لعنت ہے۔

آؤ — پریتم آؤ!
جنگ یورپ کی باتیں۔
میں تمھیں پریم چند کا افسانہ سناؤں۔
اور تم کیرم کھیلو۔
راز محبت۔
ساز ہارمونیم۔
دنیا سے دور — نشاط انگیز ہیں۔
آتے ہو یا میں گنڈیریاں چوس لوں۔

آؤ — پریتم آؤ!
ریڈیو کی سحر آفریں نغمہ آفرینیاں۔
ملٹ کی بھینی بھینی خوشبو۔
خوابوں کی دنیا۔
برمائے سگار۔
نیا فرنیچر۔
سول اینڈ ملٹری گزٹ۔
ایسے میں بھی نہ آؤ — تو جہنم میں جاؤ۔

آؤ — پریتم آؤ۔
ٹیرگیس سنے کیے آؤ۔
تاکہ میں آنسو بہاؤں۔
اور تم میرا فوٹو کھینچ لو۔
تمھارا انتظار اخبار سے بھی زیادہ ہے۔
تمھاری طلب سگرٹ سے بھی بڑھ کر ہے۔
اس لیے اب آ ہی جاؤ۔

"پہلام فسواں"

[illegible]

بے خبر

جناب طارق صاحب

(۱)

[illegible] چھوڑ دیا [illegible] کے لیے تو بانوے شہر سے دور گاؤں میں جو گاؤں کی کسی بستی میں رہنا کیا کم عجیب وہ جگہ کہ [illegible] بوسیدہ [illegible] کے رستے [illegible] اوائل جاہلیت کی یادگار [illegible] کا نمونہ — جہاں نہ ہوا کا گزر نہ صفائی کا اہتمام۔

شاید [illegible] آج ہوتے ہیئے وسیع ہو، شاداب باغ اور چکور کے لیے دلکش دیہات دنیا [illegible] پریشان کن نہیں ہو سکتی [illegible] کی آبادی۔ چنانچہ ٹھاکر [illegible] سنگھ آئی سی ایس کا دماغی توازن صحیح نہ رہا۔ جب [illegible] کے ساتھ ایک [illegible] پیار نہ ہو گئی۔

ٹھاکر صاحب [illegible] کے بعد مجبور ہے [illegible] کو یاد کر جس کو ان کی [illegible] ہونے کا فخر حاصل تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ [illegible] اور راجہ تھے۔ [illegible] ان داتا بھوں نے کبھی [illegible] دنیا تو کیا اپنے "خدا خانہ" میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہ دی تھی۔ [illegible] راجہ جنہوں نے کبھی [illegible] کی [illegible] پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔

بہر حال ان داتا آئے اور بڑی شان و شکوہ سے ساتھ آئے۔ موٹر، گھوڑوں، خیموں، [illegible]، بندوقوں اور چپراسیوں کے ساتھ۔ [illegible] سر اٹھائے ہوئے۔ حقارت سے جھونپڑوں کو دیکھتے ہوئے۔ نفرت سے ہر سلام کرنے والے کی طرف منہ پھیرتے ہوئے۔

مگر اپنا مکان دیکھ کر تو ان جذبات میں ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا۔ بے چینی بڑھ گئی اور اتنی کہ حواس باختہ ہو گئے۔ غیظ و غضب غالب ہو گیا [illegible] کے اندر اندر شاید ہی کوئی ملازم بچا ہو جس پر گالیاں نہ پڑی ہوں اور کوئی گھر والا ایسا ہو جو معمولی ڈانٹ ڈپٹ سے بچ گیا ہو۔

گاؤں کا معاملہ تھا ورنہ شاید ایک منٹ بھی وہ اس مکان میں نہ ٹھہرتے۔ کوئی کوٹھی کرائے پر لے لیتے یا عالیشان عمارت۔ مجبوراً سامان کوٹھڑیوں میں بھر دیا گیا۔ اور ہال میں تکیہ لگا کر راجہ جی بیٹھ گئے۔ پجاری آتے تھے اور دور ہی سے اپنے خدا کی زیارت کر جاتے تھے کیونکہ اتنی مجال کب تھی کہ پیر چھوتے۔

اسی طرح آٹھ دن گذر گئے۔ اب ان داتا کو قصر کی ضرورت نے ضرورت سے زیادہ بے چین کر دیا۔ راج معمار۔ مزدور [illegible] خدائی میں تھے لیکن ایک عالیشان کوٹھی کے لئے وسیع زمین کا مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن تھا۔ گاؤں کے بیچ میں مکان اور مکان کے چاروں طرف گھنی آبادی زمین بڑھائی جائے تو کدھر اور کیونکر؟ یہی فکر تھی جس میں گاؤں کا مالک ڈوبا رہتا تھا۔ ایک دن سوچتے سوچتے وہ چونک پڑے۔ بہت آسان ترکیب ان کے ذہن میں آگئی تھی۔

"کیوں نہ پڑوسی کسانوں کے مکان خالی کرا لئے جائیں۔ اور اس طرح شاندار کوٹھی کے لئے پائیں باغ کا انتظام بھی ہو جائے" لیکن [illegible] یہاں وہ جھجکے کیونکہ جیسوں ایسے مقدموں کا فیصلہ خود انہوں نے کاشتکاروں کے حق میں کیا تھا جنہیں زمیندار کاشتکار کی اراضی پر زبردستی قابض ہونا چاہتے تھے۔ پھر وہ پھر سوچنے لگے "کیوں نہ اپنے اثر سے کام لیا جائے"، اب چھتری کا خون رگوں میں جوش مارنے لگا۔ تالاب کے کنارے کی زمین کیا بری ہے کسان اپنے گھر وہاں بنا لیں۔ ... بلکہ گھر کیا تھا ن ... میں تکلیف

اٹھائیں۔ ان جانوروں کی خاطر... بد ذات چمار چوہڑے اور پاسی...... اِں پہلے سیدھی طرح کہا جائے اور نہ مانیں تو؟..... تو.... طاقت سے منوائے جائیں...... بالکل ٹھیک " اور انہیں نیند کے جھونکے آنے لگے۔ تکیہ سرہانے رکھا اور سو گئے اسطرح کہ شیطان اطمینان کی شکل میں انکے پیر دبا رہا تھا۔

---

(۲)

"ہاں تو بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی کوٹھی بنوانا ہے اور یہاں زمین ہے کم تو تم لوگ سب آس پاس والے اپنی اپنی بکھری ہمیں دیدو" ٹھاکر صاحب نے حاکمانہ انداز میں ہمیں پر زور دیتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کرنے لگے

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ وہ جو اپنے مالک کے بلانے پر بڑی خوشی خوشی درشن کرنے اور پاؤں چھونے آئے تھے سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے جیسے پوچھتے تھے " دیکھا خوشی کا انجام؟"

"ہاں کیا کہتے ہو" ٹھاکر صاحب نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پھر کہا "سوچ وچار کا ہے کا" گویا یہ ایک بالکل معمولی مطالبہ تھا۔ اور تھا بھی انکے نزدیک ایسا ہی۔ ان کی بڑی بڑی خوفناک آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں " دیا نہ دو گے ہو گا یہی" بوڑھے جھینگر نے ایک دفعہ مڑ کر مجمع پر نگاہ ڈالی یہ دیکھنے کے لئے کہ کون جواب دیتا ہے۔ مگر سب خاموش تھے اور کسی جواب دینے والے کے منتظر ایک نوجوان نے جھینگر کی فتوئی کھینچتے ہوئے کہا " چچا جو تم کہو"

اس نے پھر مشورہ کے طور پر ایک نگاہ ڈالی سب آنکھوں آنکھوں میں یہی فقرہ دہرا رہے تھے۔

" دو یا نہ دو ہوگا یہی"

تاہم جھینگر اتنی جلد ایسی ناقابل برداشت قربانی کی تائید میں نہ تھا۔ اس نے چپکے سے قریب والے کے کان میں کہا " پھر سوچ لو"

اور پھر سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کسی نے مدھم آواز میں کہا " دو یا نہ دو ہو گا یہی" اور کھلی ہوئی آنکھوں نے خاص قسم کی حرکت سے اسکی تائید کی۔

لیکن اس فقرے پر بھمن سے نہ رہا گیا جو ایک قومی جماعت کا ممبر اور رضا کار تھا۔ اس نے اکثر نیتاؤں کو یہ کہتے سنا تھا کہ ایکا کٹھن سے کٹھن بپتا کا سامنا کر سکتا ہے۔ اپنے چپکے سے کہا " ہم سب ایکا کریں، کیونکہ یہ بھی کوئی معمولی ظلم نہ تھا۔ "چپ" نہیں تو پچھتاؤ گے" کچھ بوڑھوں نے اشاروں اشاروں میں اسکو سمجھایا مگر ساتھ ہی بعض نظریں اسے حمایت کرتی ہوئی معلوم ہوئیں اور وہ اور جری ہو گیا۔

کاہے کو چپ رہوں " اس نے قدرے بلند آواز میں کہا " ہم پٹ ایسے ہی سکتے ہیں"

" ابے چپ رہ یار" فتو نے اسکا ہاتھ دباتے ہوئے کہا " کاہے کو چاند منڈوائے گا"...

لیکن ابھی اس کا فقرہ پورا نہ ہوا تھا کہ زمیندار کی ہونکتی ہوئی آواز سے سب چونک پڑے کیونکہ اس نے بھمن کا آخری فقرہ سن لیا تھا " کیا پٹ سکتے ہو" اس نے طنز آمیز لہجہ میں کہا اور ایک بھیانک قہقہہ لگایا " سیدھی طرح دیدو تو اوہ گاؤں خالی کر کے دو تو زمین دینا ضرور پڑے گی...... ہم اپنی زمین ہوتے کسی کے بنے تھوڑا ہی جائینگے"

" مگر مالک پھر ہم لوگ کہاں جائیں" جھینگر نے درد بھری آواز میں کہا۔

" پرلوک" بھمن نے جلکر طعن کے طور پر ذرا اونچی آواز میں نعرہ کہا۔ کیونکہ ایکا جیسی نعمت سے ان لوگوں نے انکار کر دیا تھا۔

ٹھاکر صاحب ایسے جملوں کے عادی کہاں " رگ چھتریت" بھڑک اٹھی " تیری بھمن چمار کی"...... اور انہوں نے گالیوں کا ایک انبار لگا دیا۔

سمن نے اکثر سنا تھا کہ گالیاں دینا جرم ہے - اور قانون گالی دینے والے کو سخت سزا دیتا ہے - اُسکے پاس اسکی ایک نظیر بھی موجود تھی - قریب ہی کے موضع کے زمیندار نے جب اسکے "ان داتا" کے ضلعدار کو برا بھلا کہا تھا تو تین مہینہ کے لئے سرکاری مکان میں جانا پڑا تھا - بلکہ اس مقدمہ میں خود اسکے باپ نے بھی شہادت دی تھی - اُس نے سوچا - ٹھاکر صاحب کے مقابلہ میں قانون میری طرف ہے اور گواہیاں موجود ...... میں کاہے کو دبوں - اور اس خیال نے اسکی ہمت بڑھائی " بس ٹھاکر جی اب گالی نہ "

اب کسی میں طاقت تھی جو ان داتا کی برق غضب کو گرنے سے روکتی - کیا دیکھ رہا ہے - لے تو اسکی خبر - انہوں نے غصہ سے کانپتے ہوئے سپاہی کو حکم دیا

"سمن لمبے لیتا ذرا بہ بھولا ہوا تھا - دبتا تو کیوں اور ڈرتا تو کس لئے - کون مائی کا لال مارتا ہے دیکھیں تو منہ "

یہ کہتا ہوا وہ مقابلہ کے لئے اٹھنے کو تھا کہ پیٹھ پر ایک لاٹھی پڑی -

اُس نے پھر سر اٹھانا چاہا کہ دوسری شانہ پر پڑی - پھر متواتر تیسری - چوتھی اور پانچویں یہانتک کہ خون فوارہ کی طرح سے اچھلنے لگا - اور وہ بیہوش ہو گیا -

بھیکو سے ضبط نہ ہو سکا جلدی سے اندھیر نگری کے راجہ کے پیر پکڑ لئے " اب جانے دو سرکار مر جائیگا بچہ ہے حضور - چھمائی کرو (معافی) ..... ہم سب تمہاری اچھا کرنے پر تیار ہیں "

"اچھا پھر جاؤ " سرکار نے رحم کھاتے ہوئے فرمایا " ڈال آؤ اسے باہر " جلادی حکم صادر ہوا - اور آزاد خیال کسان کی زندہ لاش فوراً باہر پھینکدی گئی -

گاؤں کا راجہ بپھرے ہوئے شیر کیطرح تھوڑی دیر ٹہلا کیا - جب دماغ میں حواسوں نے ذرا گذر پایا تو پھر دیہاتیوں کیطرف متوجہ ہوا - اب اُس نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ تم اپنا مکان دوگے یا نہیں بلکہ کسی اہم مقدمہ کے فیصلہ کی طرح اُن کے سر چھپانے کے جھونپڑوں کا فیصلہ بھی سنا دیا " کلو کو بیس - نتھو کو اٹھارہ - جھنگر کو بائیس - کھمی کو پندرہ - فتو کو دس روپیہ دو میرا مکان بنانے کو دینے چاہئینگے ..... آج ہی سے اپنی اپنی کٹھریاں چھوڑنے کا بندوبست کرو ...

.. کیا کہتے ہو ؟ " اُس نے گرجتے ہوئے پوچھا - "جو حکم مالک کا " جھنگر نے سمن کے انجام سے لرز کر جواب دیا اور سب نے اسکی تائید کی " اچھا جاؤ " ٹھاکر صاحب نے جواب سے مطمئن ہو کر اسطرح حکم دیا گویا عدالت برخواست کر رہے ہیں - اور یہ حکم سنتے ہی سب جلدی سے باہر آ گئے -

غریب سمن دنیا و مافیہا سے بے خبر راستہ میں پڑا تھا - خون نکل کر بہا اور بہہ کر جم گیا تھا - پیٹھ کی کھال کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی - زخموں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں - دانت بالکل بھنچے اور باہر نکلے ہوئے تھے مگر جانے والوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اٹھا کر اسکے گھر پہنچانا تو کیا ایک نظر دیکھ ہی لیتا -

جب ٹھاکر صاحب ذرا حواسوں میں آئے تو کسی خاص جذبہ کے ماتحت ...... شاید قانونی دفعہ کے خیال سے خود ہی زخمی کو اٹھا لیجانے کا حکم دیا - پاس پڑوس والے ڈر تے ڈرتے آگے اور آدھ مرے سمن کو چارپائی پر ڈال کر اسکے گھر لے گئے - اس کی عورت پہلے ہی بیچین تھی دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - شاید وہ سپاہیوں کو گالی کوسنے بھی دیتی کہ جھنگر نے منع کر دیا " چپ رہ ..... ہم نے پہلے ہی اسے منا (منع) کیا تھا ..... نہیں مانا آکھر (آخر) سجا پائی (سزا پائی) اب جلدی سے بیدجی کو بلا کر دکھا "

اور مریض گاؤں کے بڑے بید کے سپرد کر دیا گیا بید نے کچھ مرہم - کچھ بوٹیاں کچھ عرق استعمال کرائے - جب کہیں دوسرے دن ہوش آیا - وہ بھی ایسا کہ نہ آنے کے برابر - جب آنکھیں کھولتا روتا اور مسلسل روتا یہانتک کہ پھر بیہوش ہو جاتا پھر لگے پولیس اور عدالت کے منظر دکھائی دینے اور وہ اپنے ردیائی منصف سے ٹھاکر صاحب کے مقابلہ میں انصاف

۳۲

طلب کرتا۔ یہاں تک کہ ایک بیساختہ قہقہہ ثابت کر دیتا کہ وہ انصاف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی حالت میں ایک مہینہ گذر گیا۔ سکھر کی لٹیا تھالی تک بک گئی۔ اگر ٹھاکر صاحب کی طرف سے چاندی کے دس چمکدار سکے معاملہ ختم کر دینے کی شرط پر اس کی بیوی کو نہ دے دئے جاتے۔ تو شاید موت کی بھیانک تاریکی کب کی اسے اپنے دامن میں سلا چکی ہوتی۔ بہر طور وہ اب بھی زندہ تھا اور رو بصحت۔ البتہ صحت کے ساتھ ایک دوسری بیماری ضرور ترقی کر رہی تھی یعنی ضد اور چڑچڑا پن۔

ایک دن جب وہ تیل اور مرچ پڑی ترکاری کھانے کی ضد کر رہا تھا راجہ صاحب کا سپاہی آگیا اور پھر مکان کا مطالبہ کیا کیونکہ ٹھاکر صاحب کی کوٹھی بغیر اسکا مکان ملائے ہوئے بن نہ سکتی تھی۔

"ہاں ہاں..... دی بکھری میں نے...... مجھے اچھا ہونے دو پھر ادالت (عدالت) بکھری دلائیگی" اس نے تیقن آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ اور حقیقتاً اسکا ارادہ تھا کہ اچھا ہوتے ہی پولیس اور عدالت سے انصاف طلب کریگا۔

یہ بات سن کر عورت کانپ گئی اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا "کاہے بکتے ہو.... پھر وہی گت بنواؤگے کیا؟"

"چپ رہ ...... تو کیا جانے..... اب بولی تو ایسی لاٹھی مارونگا کہ گھی (مغز) بہہ جائیگا۔" "کھیر تمہاری کھوپڑی (خیر تمہاری خوشی)" یہ کہکر وہ بھی چپ ہو گئی سبھن نے سپاہی اور پاس پڑوس والوں کو بے نقط سنانی شروع کر دی۔

عورت سپاہی کے پیروں پر گر پڑی "تم ان کی بات کا برا نہ مانو...... میں دونگی بکھری تمہیں بس جرا (ذرا) یہ اچھے ہو جائیں..... انکا ماگہ (دماغ) ٹھیک نہیں بیدجی کہتے ہیں آدھے پاگل ہیں.... آدھے"۔ اس نے روتے ہوئے التجا کی۔

"پاگل بتاتی ہے مجھے .... سسری".... اور یہ کہتے ہوئے چارپائی کے پاس سے پتھر کا بانٹ اٹھا کر غریب عورت کے کھینچ مارا۔ وہ اتفاق سے پیٹھ پر پڑا ورنہ مفلسی میں آٹا گیلا ہونے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ خود تو بے دست و پا پڑا ہی تھا اس کا سہارا بھی نہ رہتا جو دوسروں کا آٹا چکی کر کے جیسے تیسے علاج معالجہ کر رہی تھی۔

وہ پھر سپاہی پر بڑبڑانے لگا "جا یہاں سے۔ بڑا آیا ٹھاکر کا سپھیر نکر (سفیر بنکر) نہیں تو..... نہیں تو....؟" یہ کہکر اس نے دوسرا بانٹ اٹھانا چاہا۔

اگر چہ اسی ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو بغیر چوٹ کھائے نہ بچتا۔ بیمار سمجھ کر یا کسی اور خیال سے کوئی سزا تو نہ دی البتہ غصہ میں اٹھکر چلا گیا اس یقین کے ساتھ کہ سبھن کی ہانڈی سے سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا۔

سبھن روز بروز اچھا ہوتا گیا یہاں تک کہ پہلی بارش کے بعد اس نے اپنے کھیتوں کو جوتنا بونا شروع کیا۔ ہل چلاتے وقت وہ ہمیشہ یہی سوچا کرتا تھا کہ فصل کاٹتے ہی میں ٹھاکر صاحب پر مقدمہ دائر کر دونگا۔

ایک دو دوستوں نے اسے منع بھی کیا کہ اگر گاؤں میں رہنا ہے تو ٹھاکر صاحب کو ان داتا جانو اپنی مٹی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔ مگر ایک اٹل نہیں، تھی جسکے سوا سمجھانے والوں نے کبھی کوئی دوسرا جواب نہ پایا۔

دو مہینے اور گذر گئے اور فصل تیاری کے قریب پہنچ گئی۔ وہ جب کھیت پر جاتا تو خوشی سے پھولے نہ سماتا اسلئے نہیں کہ اب کھانے کو روٹی کی آسانی ہو جائیگی بلکہ اس لئے کہ اسے بیچکر وہ اپنی انصاف کی بھوک بجھائیگا۔

ایک دن جب وہ اپنے مکا کے کھیت پر بیٹھا کالیداس کا ایک گیت گانے میں مگن تھا پولیس کی ایک جماعت نے اسکو گھیر لیا ہتھکڑیاں کھنکیں اور آنکھ جھپکتے ہی اسکے ہاتھوں میں پڑ گئیں" ....

"آکھر میری کھتا" (آخر میری خطا) اس نے ایک کانسٹبل سے معصومانہ انداز میں پوچھا۔ "خطا" تھانیدار نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا" ڈاکو..... چور.... بدمعاش..... خطا جیل میں معلوم ہو گی"۔

لیکن ان کی باتوں سے اسکو معلوم ہوا کہ ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں اسکی گرفتاری ہوئی ہے۔

گاؤں گاؤں خبر ہو گئی کہ سبھن کے گھر سے پستول برآمد ہوا ہے مگر یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ کیسے؟

پولیس نے اسی دن اس کا چالان کر دیا اور عدالت میں مقدمہ چلنے لگا۔ بیانات ہوئے شہادتیں گزریں ان کی انجمن والا چاچا اور کاکا کہا کرتا تھا۔ ان کی تن کی درستی پر اسے پورا بھروسا اور کامل اعتماد تھا۔
لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود نا کچھ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ انصاف ہوتا ہے کیا نہیں۔ اور اس وقت تک اس یقین نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اس کے کانوں نے حکم سزا اور آنکھوں نے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری نہ دیکھ لی۔

---

(۳)

ٹھاکر صاحب نے جہاں زمیناں بسو دیاں کھلنے لگیں۔ گھروں کی جگہ میدان اور میدان کی جگہ اینٹ کے چٹوں اور گارے چونے کا ڈھیر تھا۔ جا بجا عمارتی مسالہ کے لیے گڑھے کھدے ہوئے تھے اور دو دو آنہ والے لاتعداد مزدور نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آ جا رہے تھے۔
معصوم مکان مزدور بھی کی بیوی بھی ٹھاکر صاحب کی اقبال مندی کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کی عورت روتی کلپتی بچوں کو لے کر اپنے میلے میں گئی تھی کیونکہ بھین کے بعد نہانی کون جس کے سہارے اودھیپور میں رہتی۔ اور اگر کوئی رکھتا بھی تو کیسے کھاتا تو خود بھی گھر سے بے گھر ہوتا۔ ہر کھیدا نے اسے سر پر ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ مختصر یہ کہ وہ وطن سے بے وطن کھیت پات کی مالک سے بھکارن ہو گئی۔ اور قریب کے گاؤں میں بھائی کے جاورچ کے گزران پر گذر بسر کرنے لگی۔
ادھر ٹھاکر صاحب خوشی اور لا انتہا خوشی کے اتھاہ سمندر میں ہر وقت غوطے کھایا کرتے تھے۔ ان کا دل مسرت سے لبریز اور دماغ افسانہ لات سے معمور تھا کیونکہ دوستوں کی آمد رفت سے بہت پہلے ان کا قصر تیار ہوا جا رہا تھا۔
تعمیر شروع ہوئے دو ماہ گذر چکے تھے۔ راج معمار ضرورت سے زیادہ مزدور بے حساب تھے۔ ایک مہینہ کے اندر اندر کام ختم ہو جانے کی پوری امید تھی۔ بلکہ اس سے کچھ پہلے کیونکہ دیکھ بھال نگرانی راجہ صاحب بنفس نفیس کرتے تھے۔ بڑی سختی اور کڑائی ہے۔ مثلاً سب مزدور ایک ساتھ بیٹھ کر نہیں پی سکتے ایک ایک اور الگ الگ۔ دوپہر کی چھٹی دو گھنٹہ کے بجائے ایک گھنٹہ کر دی گئی تھی۔ اکثر جب کوئی ڈاٹ وغیرہ نامکمل رہ جاتی تو سات آٹھ بجے رات تک گیس کی روشنی میں کام ہوا کرتا۔ اور عدم تعمیل کی صورت میں سزا۔ وہی لاتوں تھپڑوں اور گھونسوں کی سزا ملتی۔
پچھلے بیس بیس سال کی باتیں کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں آیندہ ایک ماہ گزرتے کیا دیر لگتی چٹکی بجاتے گزر گیا اور اپنے بعد گردے اور رکن نصف گاؤں میں سنہری گنبدوں اور بڑی بڑی محرابوں والی ایک تاریخی یادگار چھوڑ گیا جو مستقبل قریب میں "راج محل" کہلانے والا تھا اور جس کے تذکرہ کے ساتھ منحوس بھین کا واقعہ دبی دبی زبان میں ضرور دہرایا جاتا تھا۔
جب کوٹھی تعمیر ہو گئی تو راج ماتا کی رائے ہوئی کہ نئے مکان میں منتقل ہونے سے قبل کتھا ہونی ضروری ہے تاکہ نحوس کا جھگڑا نہ رہے۔
"ننھے ننھے بچے آ گئے ہیں۔۔۔ موئے چار پاسیوں کے گھر نہ جانے کون بھوت بلا رہتی ہو کتھا ضرور کر دو" ٹھکرائن نے رائے پیش کی۔
"ہاں اچھا ہے" راجہ نے جواب دیا "ساتھ ہی ضلع کے حکام۔ پولیس اور معززوں کی دعوت بھی کر دیں۔ ایک پنت دو کاج ہو جائیں گے سب سے میل ملاقات بھی بڑھ جائے گی اور فرض بھی ادا ہو جائے گا۔"
دن تاریخ طے ہو کر پھر ڈنر اور رقص کے لوازمات پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ سجاوٹ بناوٹ اہتمام و انتظام پر بحث ہوئی اور جملہ معاملات طے ہو گئے۔
تیسرے چوتھے دن دعوتی رقعے بھی رئیسوں خان بہادروں، اور حاکموں کے منظور نظر مصور ہاتھوں میں پہونچ گئے۔
برسات کے ایک مبارک دن دعوت نے عملی صورت اختیار کر لی۔ گیس لیمپوں جھاڑوں اور فانوسوں سے محل بقعہ نور بنا دیا گیا اور ہال کوہ طور۔

عالیشان پھاٹکوں اور راستوں کی دو رویہ سبز رنگ کی قناتوں سے گاؤں دلہن کی طرح آراستہ کر دیا گیا۔ صحن میں ۸ بجے کے بعد صد ہا میزیں لگا دی گئیں جن کے آس پاس خانساماں اور بیرے سفید سفید پوشاکیں پہنے ادھر سے اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔
پہلے کتھا ہوئی اور جب وہ ختم ہو گئی تو کھانا شروع ہوا اور وہ بھی ۱۰ بجے رات کو بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ لوگ ٹھاکر صاحب کو مبارکباد دے دے کر رخصت ہونے لگے۔

قابل دید بات یہ تھی کہ "راجہ صاحب" کی شان جبروت آج کہیں نام کو بھی نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ اس کی جگہ کچھ انکسار کچھ فروتنی نے لی تھی۔ جس سے وہ ہنس کر اور مسکرا کر حکام سے کچھ دب کر ملتا رہا۔
یہ موثر دکھاوا ختم غرض ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ پھیلا ہوا سامان سمٹ سمٹا کر اپنی اپنی جگہ پہنچ گیا۔ دو گھنٹہ کے بعد گھر کے اندر ٹھاکر صاحب ان کے بیوی بچے اور نوکر چاکر تھے اور باہر برسات کی ہلکی ہلکی پھوار۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا عجیب کیف و سرور پیدا کر رہی تھی۔ سب سو گئے۔

اب بادل بڑھنے لگے اور چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ بادل بری طرح گرجنے لگا۔ گویا کوئی افسانوی دیو تھا جو بجلی کی جھلاتی ہوئی تلوار لیے مظلوموں کی حمایت میں ظالموں سے جنگ کرنے آ پہنچا تھا۔ بجلی کی کڑک بھی بڑھ گئی اور اتنی بڑھ گئی کہ بچے چونک چونک پڑتے تھے جن گھروں میں چراغ نہ تھا ان میں مائیں ایسی روشنی میں صورت دیکھ کر بچوں کو کلیجے سے چمٹا لیتیں۔
ذرا دیر میں ہوائیں بھی تیز و تند ہو گئیں اتنی کہ چھپر اڑنے اور دانت بجنے لگے۔ پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔
لیکن ٹھاکر صاحب اور ان کے متعلقین دن بھر کے تھکے ہارے پریشان اس تمام آفت سے بے خبر بلند چھتوں کے نیچے میٹھی نیند سو رہے تھے۔
ٹھیک ۲ بجے بجلی کی کڑک یا شاید کسی اور وجہ سے رانی ماں کی آنکھ کھل گئی انھوں نے ٹھاکر صاحب کو جگایا۔
"میں نے ایک سپنا دیکھا ہے،" انھوں نے ٹھاکر صاحب کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔
"جانے بھی دو ۔۔۔ صبح کہنا" ٹھاکر صاحب نے اوں آں کرتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں نہیں سنو تو" ٹھکرائن نے اصرار کیا۔ وہ کچھ خوفزدہ سی تھیں۔ "میں نے دیکھا کہ باہر دالان میں تم کھڑے ہو اور تمہارے پاس ایک میلا کچیلا دیہاتی جس کے سر سے خون بہہ رہا ہے اور ہزاروں مکھیاں منہ پر بھنبھنا رہی ہیں۔ ہاتھ پیر اور منہ بھی زخمی ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور شاید تم ہی نے اس کو مارا ہے۔"
"اونہہ سب خیال ہے ۔۔۔ تمہارے بھی ان باتوں کو کہیں اس کا خیال آ گیا ہوگا ۔۔۔ وہی بھمن کا" ٹھاکر صاحب نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔
"ابھی اور بھی ہے"۔ رانی ماں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے کہا "تم اس حالت میں بھی اس پر خفا ہو رہے ہو کہ ایک دم سے وہ گر گیا اور شاید مر گیا" یہ کہتے ہوئے انھیں خوف سے جھرجھری سی آ گئی۔
پھر میں نے دوبارہ دیکھا کہ تم برآمدہ میں کرسی میز ڈالے بیٹھے ہوئے کسی خوشی کے رقعے لکھ رہے ہو۔ پانی برس رہا ہے اور بجلی چمک رہی ہے۔ یکایک ایک تڑاقا ہوا اور بجلی برآمدہ پر گری۔ برآمدہ کرسی میز اور ایشور نہ کرے تم"۔ یہ کہتے ہوئے وحشت سے وہ خاموش ہو گئیں۔
"یہ سب تمہارا وہم ہے۔ بھمن پر میں نے ظلم ہی کون سا کیا ہے جو ایشور کو ناگوار ہو ۔۔۔ اپنی کوٹھی کے لیے زمین ہی تو لی ہے اور کیا کیا ۔۔۔ بے ایمان کو سمجھایا معاوضہ دیا نا تا تب میں نے زمینداری والی چال کھیلی ۔۔۔ اب جیل بھگت رہا ہے کمبخت۔"
یہ فقرہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ بجلی تڑپی بڑی بھمنی کے ساتھ مظلوم کا بدلہ لینے کے لیے تڑپی اور موت بن کر اسی لمحہ قصر پر گری اور قصر بے خبر ٹھاکر پر اس طرح کہ سب کے ساتھ اسے بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔
راج محل ابھی "راج محل" کے نام سے مشہور بھی نہ ہونے پایا تھا کہ تاریخی کھنڈر بن گیا۔

آغاز خیال کا مطالعہ کیجیے (مختصر افسانہ) مصنف نسیم سندیلوی۔

مجھکو بدنام نہ کر میرے خیال کے مالک

جناب سلیم صاحب صدیقی

میں تو چشم بد دنیا میں فسانہ بن کر جانے والا۔ میرے وعدے جھوٹے۔ میری محبت جھوٹی۔ مطلبی — میں تمہاری نگاہ میں کیا کچھ نہیں۔ میری نیم باز نگاہیں تو دام فریب میں پھنسا دیتی ہیں۔ میرا ہر لفظ محبت کا تیر ہے۔ گرز ہر میں بجھا ہوا۔ میرا ہر پیمان سر میں لیتا ہوا دل کی گہرائیوں میں تلاطم پیدا کرتا ہے گرتا پڑتا۔ میرا ہر نغمہ محبت کا ایک راگ ہے جو تمام کائنات کو زیر و زبر کرتا ہوا ایک وحشی طوفان کی طرح گزر جاتا ہے۔ یہ سب ٹھیک سہی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کیا ہو!

تم میرے دل کی دنیا برباد کر جانے والی فرشتہ۔ تم میرے دل کی گہرائیوں میں اتر کر فریب دینے والی ہو۔ تمہارے تیر شوخ دل کے کلیجے کر رکھتے ہیں۔ محبت کی شراب کا لبریز جام بھر رہو۔ ہوتا ہے پھر بھی تمہاری دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے پاتی ہے۔ وہی بھولی بھالی صورت والی معصومیت کی دیوی ہو۔

یہ نیم باز آنکھیں۔ یہ ابروئے خم دار۔ یہ غنچہ دہنی۔ یہ پھولوں سے بھی نازک رخسار۔ یہ صراحی دار گردن۔ یہ گوری کلائیاں۔ یہ کبک دری کی چال۔ پھر بھی معصوم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تم جب پھولوں سے کھیلتی ہوئی شراب جوانی سے مخمور ہو کر خرام ناز فرماتی ہو تو ہزاروں دل پامال ہو جاتے ہیں۔ زاہد خشک میں جان پڑ جاتی ہے۔ خانقاہوں کی دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے۔ شراب محبت کے دور چلنے لگتے ہیں۔ اور تم اسی مخمور و نیم باز آنکھوں سے بیخود بناتی۔ اٹھلاتی۔ بجاتی بجلیاں گراتی مسکراتی اور حشر برپا کرتی ہوئی گزر جاتی ہو۔

دست حنائی میں گلابی جام مخمور آنکھیں۔ ناز و ادا کرشمہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لب نازک میں ہلکی سی جنبش۔ ۔ ۔ ۔ پھر یہ شکایت کہ میں بدمست ہوں۔ ۔ ۔ ۔ جہاں حسن کی تمام رنگینیاں یک جا ہوں بھلا کون انسان ہے جو بچ کر نکل جائے۔

حسن و عشق۔ محبت و ناز۔ نیم شبی۔ اور شمع و پروانہ۔ جام بے خودی و مدہوشی۔ یہ کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سے شمع حسن کی کشش ہر پروانہ کو گرویدہ کر کے جل مرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ہی بتاؤ کہ بے وفا ہم ہیں یا تم۔

لطیفے

ایک بخیل آدمی نے نوکر سے ایک پیسہ کا دہی منگایا۔ جب وہ کھانے بیٹھا تو اس کا چہرہ دہی میں مکھی دیکھ کر غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اس نے نوکر کو بلا کر مکھی دکھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں جی تم دہی دیکھ کر نہیں لائے۔ اندھے ہو گئے ہو۔ اس میں مکھی کیسی؟" نوکر نے مودبانہ جواب دیا "حضور نے ایک پیسہ کا تو دہی منگایا تھا۔ اس میں مکھی نکلتی تو کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے"

عذرا آفندی

دو دوست اختر اور جمال بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اختر نے پوچھا۔

"بھائی جمال تم نے فلسفہ میں کیا پڑھا ہے؟"

جمال: "میں ایک کو دو ثابت کر سکتا ہوں مثلاً اس انڈے ہی کو لو"

اختر: "وہ کیسے؟" جمال: "ایک انڈا اور ایک انڈے کی ماہیت"

اختر (انڈا منہ میں رکھتے ہوئے) "اچھا تو میں نے انڈا کھا لیا اب تم اس کی ماہیت کھا لو"

مہر ضیا

ماں

از محترمہ سعیدہ وجاہت علی

افراد ڈرامہ

مادام کوشا ۔ الفنسو کی ماں
مادام کیری ۔ مادام کوشا کی دوست
نومش ۔۔۔ الفنسو کی منگیتر

پہلا منظر

وقت ۔ آٹھ بجے صبح ۔ مقام ۔ مادام کوشا کا بیٹھکہ

بڑھی مادام کوشا اپنی سبز اونی چادر میں لپٹی صوفہ کی ایک گہری کرسی میں دھنسی بیٹھی ہے اور کروشیا بن رہی ہے ۔ بائیں جانب کرسی پر مادام کیری بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے ۔

مادام کیری :۔ "فرانکو کی فوجیں بڑھتی ہی چلی آتی ہیں ۔ ہم لوگ روز بروز خطرہ سے قریب ہوتے جاتے ہیں ۔"

مادام کوشا :۔ "کیا اب ہم خطرہ میں ہیں ؟ ہمارے بہزادہ دل اور دلاکھوں نوجوان آنے والی آزادی اور جمہوریت کی اینٹ بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن اب تک ہم سامراج کا سر نہیں کچل سکے ہیں ۔"

مادام کیری :۔ "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ فرانکو کامیاب ہو جائے گا ۔"

مادام کوشا :۔ "اسپین کا گرم خون زیادہ دنوں تک غلامی نہیں برداشت کر سکتا ۔"

مادام کیری :۔ "مجھے تو اب اپنے شہر کی بھی خیر نہیں معلوم ہوتی سیلان کی وادی کے آگے پھر ہمارا ہی شہر پڑتا ہے ۔"

مادام کوشا :۔ "لیکن سیلان کی وادی میں ہمارے مزدوروں کا بہت مستحکم مورچہ ہے ۔ وہ پیچھے نہیں ہٹائے جا سکتے ۔"

مادام کیری :۔ "اور اگر وہ پیچھے ہٹ گئے ؟"

مادام کوشا :۔ "تو شہر کے باہر ہم اسپینی عورتوں کا مورچہ ہوگا ۔"

مادام کیری :۔ "ہمارا ؟"

مادام کوشا :۔ "اور کیا ؟ کیا تاریخ میں یہ لکھا جائے گا کہ جس وقت فسطائی درندے اسپین کی مقدس سرزمین کو روند رہے تھے اور آزادی کے پرستاروں کے خون سے زمین کا چپہ چپہ سرخ تھا اسپین کی عورتیں گھروں میں بیٹھی ہوئی کروشیا بن رہی تھیں ؟"

مادام کیری :۔ "الفنسو کی کچھ خبر نہیں معلوم ہوئی ۔ خدا کرے اس کا بال بیکا نہ ہو ۔"

مادام کوشا: وہ آگے کو کہہ رہا تھا لیکن میں نے اسے صاف صاف لکھ دیا کہ مجھ پر بھی ان سے زیادہ اسپین کی ماں کا فرض ہے۔"
مادام کیری: تم سنگدل ہو گئی ہو۔ مادام! میری نوشش اسے بری طرح یاد کر رہی ہے۔"
مادام کوشا: آہ بکیاس! یہ اکلوتا نوجوان لڑکے کو نہیں یاد کرتی! کیا وہ میرے مرحوم شوہر کی جیتی جاگتی تصویر نہیں؟ اپنا ہاتھ لاؤ مادام میرے سینے پر رکھ کر دیکھو اس کی جدائی میں وہ کیسا پھڑک رہا ہے! لیکن اس وقت جب دنیا کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن باب لکھا جا رہا ہے جب ہمارے تمہارے ایسے کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جا رہا ہے کیا ہم اپنی چھوٹی چھوٹی محبتوں اور خود غرضیوں کو بھی نہیں بھلا سکتے؟ میرا بچہ مزدوروں کا سرخ جھنڈا تھامے ہوئے دنیا کے سارے مزدوروں کا سر اونچا کر رہا ہے۔ وہ اپنے خون سے اپنے ملک کی آزادی کو سینچ رہا ہے۔ میں ایک بہادر لڑکے کی مغرور ماں ہوں۔"

مادام کیری: تم مادام! یہ نہیں ہو سکتی۔"
(نوشش دوڑتی ہوئی آتی ہے اور ایک صوفے پر گر کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے)۔
نوشش: میرا دل ٹوٹ گیا!"
(مادام کوشا سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے اور کاغذ کا پرچہ ہاتھ سے رکھ دیتی ہے۔ مادام کیری نوشش کے پاس لپک جاتی ہے)۔
مادام کیری: کیا ہوا میری جان!"
مادام کوشا: بولو بچی نوشش!"
نوشش: (دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے) کیلو کی جنگ میں لفنشا مارا گیا!"
مادام کیری: (بے ہوش ہو کر بیٹھ جاتی ہے)۔
مادام کوشا: میرا بچہ! (بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے)۔

دوسرا منظر

(سیلان کے مورچے پر مزدوروں نے فرانکو کی فوج کو پیچھے دھکیل دیا۔ سارے شہر میں جشن منایا جا رہا ہے۔ ایک سڑک پر مزدوروں کی فوج کا جلوس نکل رہا ہے۔ آگے آگے سرخ جھنڈا ہے۔ دور دور تک تماشائی قطار در قطار کھڑے ہیں اور تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ رومال ہلا رہے ہیں۔ نعرے لگا رہے ہیں اور پھول برسا رہے ہیں۔
مادام کوشا فٹ پاتھ کے ایک کونے پر سیاہ لباس پہنے رومال ہلا رہی ہے۔ وفور جوش سے اس کے آنسو بہہ رہے ہیں)
مجمع نعرے لگاتا ہے۔

مزدور! زندہ باد!! جمہور اسپین! زندہ باد!! دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ!! فاتح سیلان! مبارک ہو!

(نوشش اور مادام کیری دوڑتی ہوئی مادام کوشا کے پاس آتی ہیں)
نوشش: خالہ جلدی چلو۔ دوسری طرف سڑک پر شہیدوں کے جنازے نکل رہے ہیں۔"
مادام کوشا: مجھے یہ سرخ جھنڈا دیکھنے دو۔"
نوشش: کیا تم الفنشا کا جنازہ بھی نہ دیکھو گی۔"
مادام کوشا: میں اُسے اس سرخ جھنڈے میں دیکھ رہی ہوں۔"
نوشش اور مادام کیری جھلاتی ہوئی بھاگتی ہیں۔ سرخ جھنڈا لہراتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ سارا مجمع چیخ پڑتا ہے۔

انقلاب زندہ باد!!

مادام کوشا لپک کر جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

(پردہ)

خدا

(از حضرت نشتر سندیلوی)

میں اوس کا ہوں جو صحرا کو بھی دریائے رواں کردے
فلک کو جو زمیں کردے، زمیں کو آسماں کردے

جو وہ چاہے بھرے گلشن کو تاراج خزاں کردے
کرم کردے تو شاخ خشک کو بھی گلفشاں کردے

جو وہ چاہے تو اہل کارواں کو گم نشاں کردے
جو وہ چاہے تو بچھڑوں کو شریک کارواں کردے

جو وہ چاہے تو ہوں غفلت میں بھی آثار بیداری
جو وہ چاہے تو بیداری کو بھی خواب گراں کردے

جو وہ چاہے تو برسے آتش سیال یخ ہو کر
جو وہ چاہے تو آب سرد کو آتش فشاں کردے

جو وہ چاہے تو بخشے آب حیواں برباراں کو
زمین شور کو چاہے چمن زار جناں کردے

جو وہ چاہے تو ناممکن کو ممکن کرکے دکھلادے
جو وہ چاہے تو برگ کاہ کو کوہ گراں کردے

جو وہ چاہے فضا بدلے ہوا کے ایک جھونکے میں
جو وہ چاہے تو پل بھر میں منقلب رنگ جہاں کردے

جو وہ چاہے بتادے راز قدرت ذرے ذرے کو
جو وہ چاہے شجر کے پتے پتے کو زباں کردے

ہر اک ذرہ جہاں کا تابع فرمان قدرت ہے
ارے غافل ترا ہر شکوۂ مجبوری شکایت ہے

علوِ اکثریہ

فی الجملہ معلومات

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ اقوام متحدہ کب قائم ہوئی اور اس کا کیا کام ہے؟

یو۔ صلح نامہ در سان فرانسسکو ۱ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کو لیگ اقوام قائم ہوئی۔ اس کی غرض جیسا کہ اس کے قرارنامہ کی تمہید میں ہے بین الاقوامی آسودگی اور صلح کی ضمانت ہے۔

۲۔ سنگ رازتیا (Rosetta Stone) کیا ہے؟

سنگ رازتیا ۱۷۹۹ء میں دریائے نیل کے کنارے کی ایک پرانی مسلمان بستی رازتیا میں دریافت کیا گیا۔ اس پتھر پر قدیم مصریوں کی تحریر میں حروف کی جگہ تصویریں بنائی جاتی تھیں نقش کی ہوئی ہیں جو ہمیں پرانی مصری تہذیب کا پتہ دیتی ہیں۔

۳۔ دورانِ خون کیسے ہوتا ہے؟

خون قلب کے بائیں جانب سے شریانوں میں ہوتا ہوا تمام جسم کا دورہ کرتا ہے۔ یہ صاف خون ہوتا ہے۔ جسم میں دورہ کے بعد خون گندہ ہو جاتا ہے۔ خون کی غذائیں قواء میں جذب ہو جاتی ہیں۔ جس کے بعد رگوں کے ذریعہ سے یہی خون دل کی دائیں جانب واپس آتا ہے۔ یہاں سے خون پھیپھڑوں میں جاتا ہے۔ پھیپھڑوں سے صاف ہو کر خون دل کی بائیں جانب آتا ہے جہاں سے پھر اسی طرح دورہ شروع کرتا ہے۔

۴۔ ہٹلر جرمن نہیں ہے۔

ہٹلر آسٹریا کے خاندان ہالڈوبرٹیل (Holdwertel) سے ہے۔ ہٹلر کا باپ الوئیس ہٹلر (Hitler Aloi) ... اس کی تیسری بیوی کلارا پولز (Klara Polza) سے جو اس کی دور کی بہن بھی شادی کے چار سال بعد شہر براناؤ (Braunau) میں ۲۰ اپریل ۱۸۸۹ء میں ایڈالف ہٹلر پیدا ہوا۔

۵۔ کینچوا کیا مفید کام کرتا ہے؟

کینچوا ہونا زمین کی زرخیزی کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ (۱) کینچوا زمین کی تہہ سے اچھی مٹی اوپر لاتا ہے جو ایک اچھے ہل چلانے کا کام دیتی ہے۔ (۲) کینچوے کے بنائے ہوئے سوراخوں سے پانی زمین کے اندر جذب ہوتا ہے جس سے کھیتی میں مدد ملتی ہے۔ اور جب اوپر کی سطح خشک ہو جاتی ہے اس وقت بھی زمین کے اندر نمی باقی رہتی ہے۔ (۳) کینچوے کی عادت ہوتی ہے کہ وہ پتیاں اور دوسری اسی قسم کی چیزیں زمین کے اندر جمع کرتا ہے جو بعد میں سڑ کر اچھی کھاد کا کام دیتی ہیں۔

۶۔ کبیر پنتھی اور کبیر پنتھ کیا ہے؟

۱۴۴۰ء کی ایک سہانی صبح کو تالاب کے کنارے نیرو نامی جلاہے نے ایک بچہ پڑا پایا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی نیرو نے اس بچہ کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔ راما نند کی مرضی کے خلاف وہ ان کے چیلے ہوئے اور بڑے ہو کر کبیر کہلائے۔ بچپن میں انھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو صدمہ پہونچایا۔ مسلمان ان سے اس لیے ناخوش ہوئے کہ انھوں نے خدا کے ہندی نام رکھے۔ ہندو ناراض تھے کہ اچھوت ہو کر انھوں نے جنیؤ پہنا۔ بنارس میں ان کا رہنا دشوار ہو گیا۔

سکندر لودھی نے فرمان شاہی سے انھیں بنارس چھوڑنے کا حکم دیا۔ انھوں نے گورکھپور کے ایک موضع میں رہ کر اپنے خیالات لوگوں میں مشتہر کیے۔ کبیر نے ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔ ان کے انتقال کے کئی سو سال بعد ان کے شاگردوں نے ان کی یاد تازہ رکھنے کو اور ان کے سبق کو عام کرنے کے لیے بنارس میں ایک درسگاہ قائم کی جس کو کبیر مٹھ کہتے ہیں۔ کبیر کے پیرو کبیر پنتھی کہلائے۔ کبیر بت پرستی سے متنفر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بتوں میں جان نہیں یہ ہمارے بنائے ہوئے پتھر کے کھلونے ہیں نجات نہیں دلا سکتے۔ ان کی پوجا سے سکون نہیں لہٰذا ان کی پوجا بیکار ہے۔ پھر بھی کبیر ہندو تھے۔

- دن اور رات ہمیشہ برابر کیوں نہیں ہوتے؟ جب ہندوستان میں موسم سرما ہوتا ہے تو جنوبی افریقہ میں گرمی کیوں پڑتی ہے؟

زمین اپنے گردشی محور پر ساڑھے چھیاسٹھ ڈگری جھکی ہوئی ہے۔ زمین اپنے محور پر اور ساتھ ہی سورج کے گرد ایک بالکل صورت میں گھومتی ہے۔ ۲۱ جون کو جب وہ سورج کے سامنے ذرا سی اٹھی ہوتی ہے تو ساڑھے تیئیس ڈگری شمالی مقامات پر دوپہر کے وقت سورج بالکل سر پر ہوتا ہے۔ اسی طرح ۲۱ دسمبر کو جب دنیا ذرا سی سورج کی دوسری طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے تو ساڑھے تیئیس ڈگری جنوبی مقامات پر سورج سر پر ہوتا ہے۔ یعنی جب خط استویٰ کا شمالی حصہ سورج کی طرف جھکا ہوتا ہے تو وہاں موسم گرما ہوتا ہے۔ اور جب جنوبی حصہ سورج کی طرف مائل ہوتا ہے تو خط استویٰ کے جنوبی مقامات میں گرمی رہتی ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں یعنی بیک وقت خط استویٰ کے شمالی اور جنوبی دونوں حصے سورج کی طرف جھکے ہوئے نہیں ہو سکتے اس لیے جب خط استویٰ کے شمال میں گرمی ہوتی ہے تو جنوب میں سردی اور اسی طرح جب جنوبی مقامات پر گرمی کا موسم ہوتا ہے تو شمالی مقامات پر سردی کا۔ ۲۱ مارچ اور ۲۳ ستمبر کو آفتاب بالکل خط استویٰ کے سامنے ہوتا ہے جسے ہم نقطۂ اعتدال لیل و نہار کہتے ہیں۔ ان دو تاریخوں میں دن اور رات برابر ہوتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ دن بڑھنا اور رات گھٹنا شروع ہوتی ہے۔ ۲۱ دسمبر سے ۲۱ جون تک شمالی کرہ میں دن بڑھتا جاتا ہے اور رات چھوٹی ہوتی جاتی ہے اور جنوبی کرہ میں رات بڑھتی اور دن چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح جب شمالی کرہ میں دن بڑے ہوتے ہیں تو جنوبی کرہ میں راتیں بڑی۔

- ترکی کا صدر۔ ولایت کا وزیر اعظم۔ ہندوستان کا وائسرائے روس کا ڈکٹیٹر اور امریکہ کا صدر کون ہے؟

عصمت انونو ترکی کے صدر ہیں۔ چرچل ولایت کے وزیر اعظم۔ لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے وائسرائے، اسٹیلن روس کا ڈکٹیٹر اور امریکہ کے صدر روزویلٹ ہیں۔

اُردو ادب

کیا آپ کو معلوم ہے؟

- مثنوی گلزار نسیم۔ مثنوی زہر عشق۔ قصہ گل بکاؤلی۔ اخلاق ہندی۔ طوطا کہانی۔ سنگاسن بتیسی اور علم الاخلاق کے مصنف کون ہیں؟

یوں تو بہت سے شاعروں نے مثنویاں لکھی ہیں لیکن دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم اور نواب مرزا شوق کی زہر عشق سب سے زیادہ ہردلعزیز اور ممتاز ہیں۔ نہال چند لاہوری ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج میں تھے انھوں نے قصہ گل بکاؤلی اسی زمانہ میں ترتیب دیا۔ میر منشی بہادر علی حسینی نے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر اخلاق ہندی اردو میں ترجمہ کیا۔ طوطا کہانی حیدر بخش حیدری نے لکھی۔ سنگاسن بتیسی میں کاظم علی جوان نے للو لال جی سے مدد دی ہے۔ خیر الدین کرامت حسین صاحب علم الاخلاق اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کے مصنف ہیں۔

۲۔ اردو نثر کی پہلی کتاب کون سی ہے؟
فضلی کی دہ مجلس اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی لیکن حال ہی میں ڈاکٹر عبدالحق نے سب رس معلوم کی ہے۔
سب رس کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ ہجری ہے۔ سب رس کے مصنف ملا وجہی عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔
بادشاہ کی فرمائش پر یہ کتاب ترتیب دی گئی تھی۔ وجہی نے اس قصہ کو اپنے دماغ کی اختراع بتلایا ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے
کہ قصہ محمد یحییٰ فتاحی نیشاپوری کی مثنوی دستور عشاق میں حسن و دل کے نام سے ترتیب دیا ہے جو عہد عالمگیری میں زبان فارسی میں لکھی گئی۔
سب رس اور مثنوی کا قصہ بالکل ایک سا ہے کہیں کہیں معمولی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ قصہ بہت عجیب ہے زبان
نامانوس و مقفیٰ ہے۔

۳۔ دور متوسطین کے شعرا کون تھے اور اس زمانہ میں اردو شاعری نے کہاں تک ترقی کی؟
ہم ایک دور کو دوسرے دور سے کسی ایک تاریخ سے جدا نہیں کر سکتے۔ زمانہ ایک زنجیر ہے اور وقت اس کی کڑیاں
لیکن خواجہ میر درد (۱۱۳۳ ہجری تا ۱۱۹۹ ہجری) مرزا رفیع سودا (۱۱۲۵ تا ۱۱۹۵) میر غلام حسین حسن اور میر تقی میر کے زمانہ کو
ہم دور متوسطین کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں اکثر شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آئے۔ دہلی کی بربادی نے انھیں وطن
چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لکھنؤ اس وقت تک خوشحال تھا۔ درد نے سپاہ گری چھوڑ کر شاعری شروع کی تھی اسی لیے زیادہ تر استعارات
اور تشبیہات عاشقانہ ہیں۔ عبارت صاف ہے ان کے کلام میں ہندی کے الفاظ نہیں ملتے۔ اور جگہ جگہ تصوف کی چاشنی بھی
ملتی ہے۔ کہیں کہیں سوز و گداز بھی موجود ہے۔ طبیعت میں بلا کا استغنا تھا۔ خودداری اور قناعت نے ہمیشہ ساتھ دیا۔ سب ہی
نے دہلی چھوڑ دی لیکن درد نے اس برے وقت میں بھی دہلی میں ہی رہنا مناسب سمجھا۔ مرزا رفیع سودا ہجو کے ماہر تھے۔ ان کو اگر
اردو کا خاقانی اور انوری کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ زبان پر فارسی کا عنصر غالب تھا۔ دہلی سے فرخ آباد وہاں سے فیض آباد
اور پھر دار السلطنت کے بدلنے پر لکھنؤ آئے۔ جو الفاظ و محاورات مرزا سودا نے مروج کیے وہ زیادہ تر قبول کر لیے گئے سودا
قصیدہ کے استاد تھے۔ ان کے کلام میں اریال، والٹیر اور سوئفٹ (VEROLL, VOLTAIRE اور SWIFT) کا سا مزا ہے مگر (ADDISON) ایڈیسن کی سی متانت نہیں۔ الفاظ اور مضمون کی بندش مشکل ضرور ہے
لیکن نہایت شیریں۔ ان کے کلام کا اثر ان کے زمانہ کے اور بعد کے شعرا پر بہت پڑا۔
میر حسن مثنوی کے استاد تھے جن میں مثنوی کربلیان اور مثنوی گلزار ارم خاص قابل ذکر ہیں۔ میر حسن نے قصیدہ بھی کہے
جن میں سے بیشتر ضائع ہو گئے انھوں نے سودا کی طرح ہجو سے کبھی اپنی زبان کو گندہ نہیں کیا۔ کلام میں عاشقانہ رنگ ہے۔
دہلی کے مشہور خوشنویسوں میں تھے۔
میر تقی میر کو کون نہیں جانتا۔ اگر ان کو اردو کا ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا
طبیعت آلام پسند تھی۔ زندگی ہی مصیبت میں گزری۔ اثر کیوں نہ ہوتا ؎

دل آہ جگر غم ناکی   اور نفس ایک تیر خاکی

نہایت ہی ذکی الحس دل کے انسان تھے۔ زبان میں غضب کی چاشنی اور سلاست تھی۔ جو لفظ جو محاورہ زبان سے نکلا وہ زبان زد
عام ہو گیا۔ اکثر مثنویاں بھی لکھیں۔ جن میں مثنوی خواب و خیال اور مثنوی جوش عشق قابل بیان ہیں۔ غزل میں ایک نیا رنگ۔
ایک میٹھا درد ہوتا تھا ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

شاعر ہونے کے ساتھ ہی نثار بھی تھے غمگین دلوں پر ان کی غزلیں نمک پاشی کا اثر رکھتی ہیں۔ میر کی دنیا درد و الم کی دنیا ہے کلام نہایت پیارا بہتر اور
شیریں ہے ؎

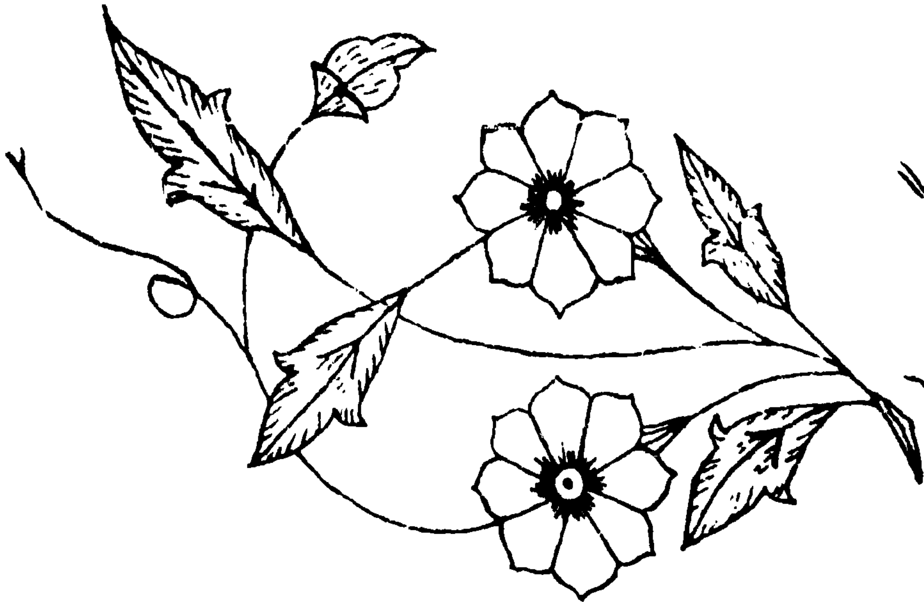
میر ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

دور متوسطین میں قصیدہ اور مثنوی نے کمال حاصل کیا۔ درد اور میر نے غزل گوئی میں بھی ایک نئی جان ڈال لیکن دور کی ادبی یادگار قصیدہ و مثنوی ہی ہیں۔ [illegible]

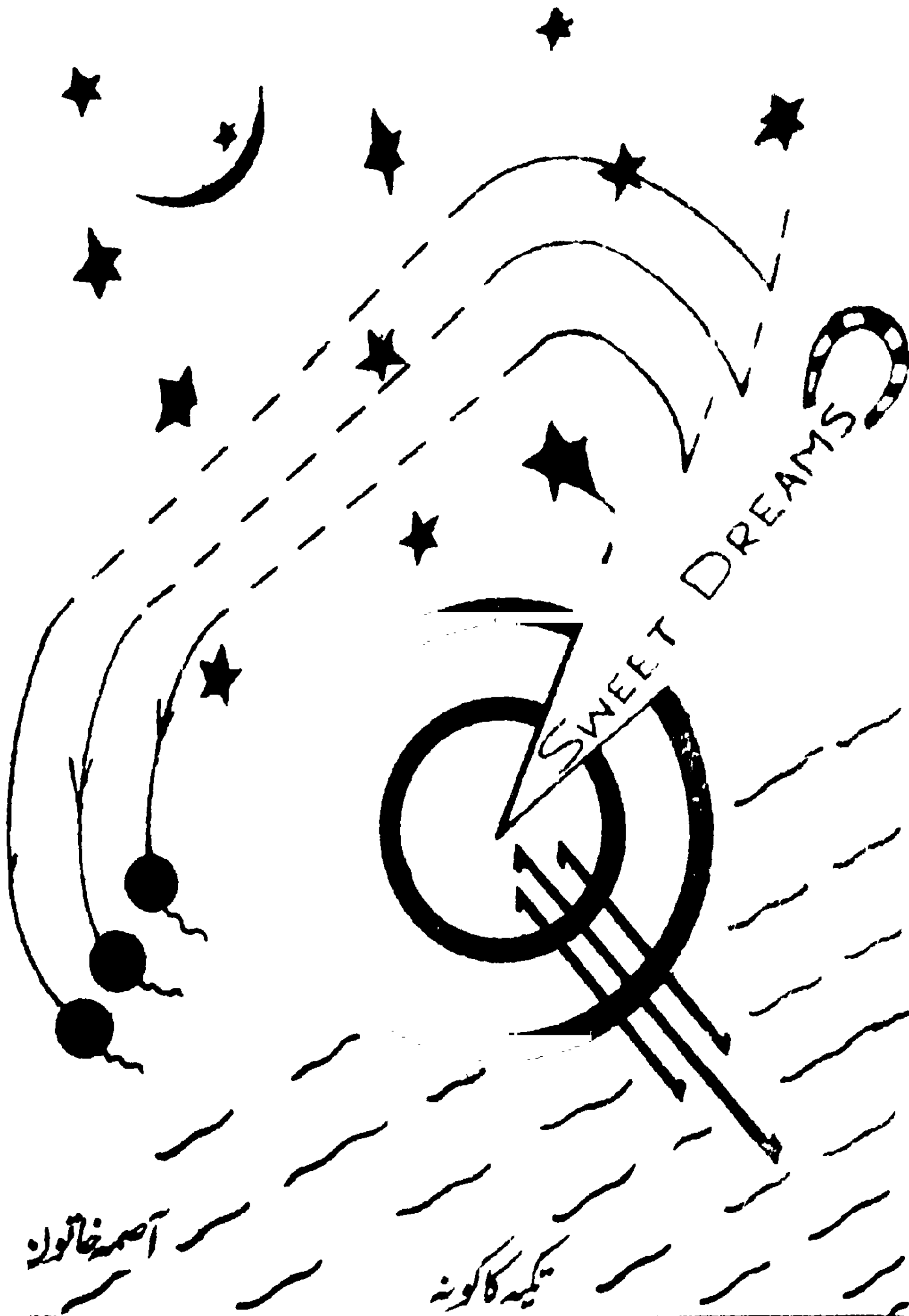
۴۷



بیگم چودھری منظور حسن



بیگم چودھری منظور حسن



آصمہ خاتون

تکیہ کا کونہ

نیلے ریشم سے ... S. DREAMS ... لال ریشم سے ... سنہرے ریشم سے بنائیے

نسیم سندیلوی بی۔ اے آنرس ایڈیٹر پرنٹر اینڈ پبلشر نے شاہی پریس میں چھپا کر دفتر اضطراب لکھنؤ سے شائع

جولائی

مدیر
نسیم سندیلوی

اضطراب — اگست ۱۹۴۰ء



ماہنامہ

اضطراب

لکھنؤ

چندہ سالانہ عہ
معاونین سے صہ
فی پرچہ ۳ر

دفتر
جاپاننگ آرٹ
نظیر آباد۔ لکھنؤ

جلد نمبر ۱ — شمارہ نمبر ۲

ضروری اطلاع

(۱) اضطراب کے لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مضمون ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں ورنہ مضمون کی اشاعت اسی مہینے میں نہ ہو سکے گی۔

(۲) مضامین صاف اور خوشخط ہونے سے کتابت اور طباعت میں آسانی ہوتی ہے اور اس طرح مضمون نگار صاحبان کو غلط چھپائی کی شکایت بھی نہیں ہوگی۔

(۳) دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیے۔ ورنہ تعمیل میں دیر لگے گی۔

(۴) مضمون کی واپسی کے لیے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۵) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جائے گا۔

منیجر

اضطراب

جلد اگست سنہ ۱۹۴۰ء نمبر ۲

اداریہ

ہم اور آپ

یہ ہمارا دوسرا پرچہ ہے

اسی کی ترتیب میں ہمیں مسعود احتر جمال صاحب سے بہت مدد ملی ہے۔ ہم جمال صاحب کو ادارہ کی شرکت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ آئندہ پرچہ سے آپ صاحب نظم کے حصہ کے نگراں رہیں گے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انھوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہم انسے امید کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری ہی طرح پرچہ کے مفاد کے لیے کوشاں رہیں گے

پچھلا پرچہ بہت مقبول ہوا ہم نے اس پرچہ کی ترتیب میں بھی حتی الامکان کوشش کی ہے اور ہماری برابر یہی کوشش رہیگی کہ ہم پرچہ کو کسی طرح بہتر سے بہتر بنائیں۔

ہم ان لوگوں کے خلوص کے شکرگزار ہیں جنھوں نے پرچہ کے متعلق اپنی صحیح رائے سے ہمیں آگاہ کیا

پرچہ کے لیے جن لوگوں نے خاص مضامین لکھے اور جو جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس اشاعت میں شائع نہ ہوسکے ہم ان سے معافی چاہتے ہیں

اس مرتبہ مجبوراً دو صفحے قلیشیہ کے کم کردیے گئے ہیں اور اشتہارات بھی زیادہ نہیں ملے گئے لیکن اس پر بھی ہم اس پرچہ میں [illegible] نہ چھاپ سکے آئندہ ماہ سے ہمارا ارادہ پرچہ کا حجم بڑھانے کا ہے اور اس وقت ہمیں امید ہے کہ ہم اپنے معاونین [illegible]

پرچہ کا معیار ابھی خود ہماری منشاء کے مطابق نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے لئے مضمون نگار اصحاب کی توجہ کی خاص ضرورت ہے۔

اس کی رجسٹریشن کے لئے درخواست دیدی گئی ہے لیکن ابھی پرچہ کی اشاعت اور خریداری کے لئے ہمارے معاونین کی کوشش ضروری ہے —

لکھنؤ — ۲۰ / جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

السید سبزمحمد [illegible]

مشاہدات

میں اکثر بیٹھ کر پہروں اسی پر غور کرتا ہوں
کہ آخر کس لئے بگڑا ہوا ہے نظم دنیا کا
کسی کے واسطے سیم و جواہر کے خزانے ہیں
کسی کو پیٹ بھر دانا بھی کھانے کو نہیں ملتا
کسی کی کٹ رہی چین سے آرام سے سکھ سے
سسکتا ہے بلکتا ہے دکھوں سے کوئی بیچارا
میسر ہیں امیروں کے لیے ایوان شاہانہ
غریبوں کو مگر ٹوٹا سا چھپر تک نہیں ملتا
خدا ہے ایک دونوں کا مجھے تسلیم ہے کامل
مگر ان کے مقدر میں ہے آخر فرق کیوں اتنا
جہاں تک سوچتا ہوں اس قدر حیران ہوتا ہوں
یہ کیسا مسئلہ ہے جو سمجھ ہی میں نہیں آتا
نظر پڑتی ہے لیکن جب کسی ایوانِ عشرت پر
خیال آتا ہے مجھ کو ملک کے باغی جوانوں کا
حریف حال و مستقبل ہیں یہ ماضی کی تعمیریں
نظام زندگی ان کے سہارے چل نہیں سکتا
ہمیں یہ نظم فرسودہ بدلنے کی ضرورت ہے
ہوس کے دیوتا کا سر کچلنے کی ضرورت ہے

کامل جونپوری

نوائے اثر

خان بہادر نواب مرزا جعفر علیخان صاحب اثر لکھنوی
ایم۔بی۔ای۔ اڈیشنل کمشنر۔ الہ آباد

تصور میں تیرے سحر ہو رہی ہے — پری نور ساگر میں منھ دھو رہی ہے
بایں نازنینی و ناز آفرینی — ستم ہے کہ مشقِ ستم ہو رہی ہے
محبت، محبت کی بھوکی محبت — تمناؤں کی جان کو رو رہی ہے
"حقیقت" کہ اوہام میں گھر گئی تھی — بحمد اللہ آزاد پھر ہو رہی ہے
دمکتے ہوئے اُنکے عارض جو دیکھے — سحر غازہ رخسار سے دھو رہی ہے
ہوا ختم پھولوں کا عہدِ جوانی — وہ رنگت رہی ہے نہ خوشبو رہی ہے
دمِ خواب ہے دستِ نازک جبیں پر — کرن چاند کی گود میں سو رہی ہے
کہاں اُنکے چہرے کی رنگیں صباحت — شبِ ماہ بھی گو دُلہن ہو رہی ہے
جب اتنی بسر ہو گئی ہنستے روتے — بسر وہ بھی ہو جائے گی جو رہی ہے
مسرت کے تو راز سے بے خبر ہے — مسرت کو تیری ہوس کھو رہی ہے

اثرؔ خانقاہوں میں کیا ڈھونڈھتے ہو
پرستش "خرابات کی" ہو رہی ہے

مرسلہ۔ اقبال صفی پوری

(خاص "اضطراب" کے لئے)

بکھرے ہوئے پھول

جناب ماہر القادری صاحب

—— گلاب گلقند بن کر میٹھا ہو جاتا ہے، مگر گلاب نہیں رہتا۔
—— سپاہی کا فرض تلوار کی دھار اور سنگین کی نوک پر ادا ہوتا ہے۔
—— سنیما کے مناظر بہت خوشنما ہوتے ہیں کاش! لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آنکھوں کے راستہ سے بھی جوانی لوٹی جا سکتی ہے!
—— دوشیزگی، اُس کلی سے بھی زیادہ معصوم اور لطیف ہوتی ہے، جسے تتلی کے ہونٹوں نے بھی نہ چھوا ہو۔
—— نقشوں اور فانوسوں سے اینٹ پتھروں کے بنے ہوئے مکان روشن ہو سکتے ہیں، مگر دلوں کے حجروں میں اُجالا نہیں ہو سکتا۔ خوب کہا اقبال رحمہ نے:-

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

—— "ذوقِ تفکر" اور "محبت زیادہ عمل" — انقلاب و تعمیر کی بنیاد ہیں۔ صرف سوچنے اور غور کرنے سے، راستہ کی ایک ٹھیکری بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتی۔
—— جب دلیلیں ختم ہو جاتی ہیں، تو آدمی گالی گلوچ کے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آتا ہے۔
—— ظلم کی نگاہ میں "آنسو" بھی بغاوت ہے اور مسکراہٹ بھی "قانون شکنی"!
—— موت کا خوفناک پنجہ بادشاہ کے حلقوم اور فقیر کے گلے میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔
—— خدا کا انکار، سب سے بڑی نادانی ہے حقائق اور مسلمات کے انکار کو آزادیٔ فکر سمجھنا "جہل مرکب" ہے بلکہ اس سے بھی بڑھکر!
—— قوموں کی تاریخ، مورخ کے قلم سے نہیں تلواروں کی نوکوں سے لکھی جاتی ہے۔
—— اسلام اور انسانیت، ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔
—— اگر "دانائی" مول ملتی تو سرمایہ دار، سب سے زیادہ عقلمند ہوتے۔
—— بچہ کی مسکراہٹ ایک کھلونے میں خریدی جا سکتی ہے۔
—— جوانی ایک ایسی چٹان ہے جس میں ایک طرف دہکتی ہوئی آگ اور دوسری طرف متلاطم سمندر ہے۔
—— غلاموں کے قہقہے بھی، آزاد کے آنسو کی برابری نہیں کر سکتے۔
—— عورت کے رخساروں میں حیا کی سرخی، دنیا کی سب سے زیادہ حسین اور دلکش چیز ہے

(طبعزاد)

دیدنی حیات

از حضرت جوش ملیح آبادی

پہلو میں تابِ حسنِ جوان دیدنی حیات
لوِ چراغِ خلوتیاں دیدنی حیات
کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لے کے ساتھ
موجِ خرامِ آبِ رواں دیدنی حیات
دم سازِ ابر و باد ہے رندانہ بانکپن
طرفِ کلاہِ پیرمغاں دیدنی حیات
آرائشوں کی فکر نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگیٔ لالہ رخاں دیدنی حیات
حسنِ جواں شرابِ کہن سازِ برشگال
عشرت سرائے بادہ کشاں دیدنی حیات

ہم کیا بولیں؟

جناب ڈاکٹر محمد حامد صاحب فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی، بار ایٹ لاء الہ آباد

جب میں ہندی اردو کے موجودہ قضیہ پر غور کرتا ہوں تو بے اختیار یہ شعر ورد زبان ہو جاتا ہے

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبیست!

اُردو نے یو۔پی میں جنم لیا۔ دہلی، لکھنؤ، آگرہ اور الہ آباد کی آب و ہوا میں پروان چڑھی، میر انیس، ذوق و غالب نے اسی صوبہ میں اسے پروان چڑھایا۔ پریم چند، چکبست اور رتن ناتھ سرشار نے گنگا جمنا کی ان ہی لہروں کے کنارے بیٹھکر اس کی آبیاری کی، لیکن زمانہ کی نیرنگیاں دیکھئے کہ آج اسی آب و ہوا، اسی صوبہ اور اسی خاک سے اس کا بیج ناپید کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ آنکھیں تو یہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں کہ جب ہندوستان کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آئے گی اور ہمارے صوبہ کی اسمبلی کے ممبر بولنے کھڑے ہوں گے تو سننے والے ان کی زبان کو سن کر جھوم رہے ہوں گے۔ پریم چند، دیا شنکر نسیم اور مومن و آزاد کی پھولی ہوئی زبان پھر برگ و بار لائیگی اور اسمبلی ہال ہمارے قومی اتحاد کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئے گی۔ لیکن افسوس کہ زمانہ کا انقلاب ان امیدوں پر پانی پھیرتا نظر آ رہا ہے اور آج ہم اس فکر میں مبتلا ہیں کہ اردو کو اس کی جنم بھوم میں مٹنے سے کیسے بچائیں۔

چند روز ہوئے ہندو ساہتیہ سمیلن کا سالانہ اجلاس ہوا تھا۔ اس میں ہمارے صوبہ کے صدر مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن اور ہمارے صوبہ کے وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند اور مسٹر سکسینہ جیسے ممتاز قوم پرست (؟) افراد شامل تھے اس میں جو بیز ٹیپ کے بند کے طور پر بار بار دہرائی جاتی تھی وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ ـــــ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اس صوبہ کے رہنے والوں کی مادری زبان صرف ہندی ہے۔ عدالتوں میں آج کل جو زبان رائج ہے وہ عوام کی زبان نہیں ہے اسے بدلنا چاہیے ملک بھر میں ذریعہ تعلیم صرف ہندی ہو وغیرہ وغیرہ۔

اس سمیلن کے اجلاس میں ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں جو جارحانہ اور جنگجویانہ تجویزیں پاس کی گئیں ان کو یہاں نقل کر کے میں خواہ مخواہ قارئین کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اپنے صوبہ کے صدر اعظم مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی تقریر کے اس حصہ کی طرف ذرا سا اشارہ کئے دیتا ہوں جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ ہندی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے قبل ہمیں چاہیے کہ اس کے لیے راستہ صاف کر دیں، میدان تیار کریں اور فضا ہموار کریں تاکہ آہستہ آہستہ وہ دن بھی جلد آئے جب ہم دفتری، عدالتی اور سرکاری تمام کاروبار صرف ہندی میں کر سکیں۔

اردو ہندی کے قضیہ میں عجیب عجیب لفظی بازیگریوں اور منطقی مغالطوں سے کام لیا جاتا ہے ان ہی میں سے ایک ہندوستانی کی جدید اصطلاح بھی ہے۔ ہندی کے حامی حسب ضرورت موقع محل کی مناسبت سے کبھی ہندی اور اردو کو ایک ہی زبان کے دو نام قرار دیتے ہیں کبھی اردو کو ہندی کی شاخ بتلاتے ہیں، کبھی ہندی اردو دونوں کو ہندوستانی میں ضم کر دیتے ہیں لیکن چالاک بازیگر کی طرح جب ان تمام جھگڑوں سے باہر آتے ہیں تو ان کی زبان پر وہی ہندی ہوتی ہے جسے ہندی کے بجائے شدہ سنسکرت

کہنا زیادہ موزوں ہے۔

میں پرشوتم داس ٹنڈن اور بعض دیگر حضرات کا کافی احترام کرتا ہوں، اور اُن کی ذات کے ساتھ مجھے جو پُرخلوص دوستانہ وابستگی ہے اُسے مجروح کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کے باوجود میں اُن کے اس عمل کی کسی طرح تائید نہیں کر سکتا جو اُردو ہندی کے موجودہ جھگڑے کے سلسلہ میں انھوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم زبان کے مسئلہ کو ایمانداری کے ساتھ سوچنے کے بجائے فرقہ وارانہ لائنوں پر سوچتے ہیں۔ زبان ایک لطیف چیز ہے لیکن افسوس کہ ہم نے اسے سیاست کی کانٹوں بھری وادی میں کھینچکر اُس کا حلیہ بگاڑنا شروع کر دیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس وقت یہ مسئلہ اتنا اہم اور نازک ہرگز نہ بنتا۔

آج ہندی کی حمایت میں جو لوگ آواز بلند کر رہے ہیں، وہ اپنے رویہ میں اتنے شدید ہیں کہ کسی طرف سے ذراسی لچک بھی ان میں نہیں پائی جاتی۔ انھیں اصرار ہے کہ زبان کا نام بھی ہندی ہو، رسم خط بھی دیوناگری ہو، الفاظ بھی دیوبانی ہوں۔ اور انداز بیان بھی وہی ہو جس سے آجتک کان آشنا نہیں۔

آج امیر خسرو، ملک محمد جائسی اور عبدالرحیم خان وغیرہ کے حوالے دے دیکر ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ جس طرح وہ ہندوستانی زبان کو ہندی کہتے تھے اسی طرح تم بھی اُردو کے بجائے اسے ہندی کہو۔ نیز جس قسم کی وہ زبان لکھتے تھے ویسی ہی تم بھی لکھو گویا ہمیں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ایسی زبان لکھیں اور بولیں:۔

چو شمع سوزان، چو ذرہ حیران، ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آئیں نہ بھیجیں پتیاں (خسرو)

ہم سے کہا جاتا ہے کہ "پچھلے زمانہ کی طرف لوٹو" کیسی حیرت انگیز نصیحت ہے! سوال یہ ہے کہ اگر اس نصیحت کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر زبان ہی پر کیا منحصر ہے ہمیں ہر چیز میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لوٹنا چاہیے میں پوچھتا ہوں کیا تم کوئی ایک ایسے انگریز کا نام بتلا سکتے ہو جو یہ کہے کہ ہمیں موجودہ انگریزی کو چھوڑ کر اسپنسر، چاسر، بابین جانسن اور ملٹن کی زبان اختیار کرنی چاہیے؟ کیا کوئی ایک ایرانی ایسا مل سکتا ہے جو آج کل کی ایرانی زبان کے بجائے عہد قدیم کی پہلوی کو ترجیح دیتا ہو؟ کیا کوئی ایک اٹالین ایسا دکھا سکتے ہو جو پرانی لیٹن کو اٹلی کی موجودہ زبان کی جگہ رائج کرنا چاہتا ہو؟ پھر یہ کیا مصیبت ہے کہ ہندوستان میں ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ہماری زبان نے صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ انھیں بھول جاؤ صدیوں کی مدت میں اس میں جو کاٹ چھانٹ ہوئی ہے اس کو فراموش کر دو اور صدیوں کی کوششوں سے زمانہ کی ضروریات کی بنا پر اُس نے جو رنگ اختیار کیا ہے اُسے دماغ سے محو کر دو اور اب پھر نئے سرے سے صدیوں پہلے کی بھولی ہوئی اور مٹی ہوئی زبان کو لکھنا اور بولنا شروع کرو۔ بچہ بڑھ کر جوان ہو گیا مگر اب اصرار ہے کہ تو پھر پہلے کی طرح بچہ بن جا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کیا ہے؟ بلکہ یہ دیکھو کہ کیا تھا؟ ——— حیرت!

بہرحال سیاسی و اقتصادی منافرت کی موجودہ تاریک فضا کے باوجود میں اب بھی مایوس نہیں ہوں، اسی تاریک فضا میں مجھے کچھ ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جن سے اُمید کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ یہی ہستیاں ہیں جنھیں موجودہ غبار آلود مطلع میں امید کے چمکتے ہوئے تارے سمجھنا چاہیے مجھے یقین ہے کہ شاید یہ فضا زیادہ دیر تک باقی نہ رہے گی، ہم چیزوں کو صحیح طور سے دیکھیں گے اور غلط باتوں پر اصرار کرنا چھوڑ دیں گے۔ خدا کرے کہ یہ توقع غلط ثابت نہ ہو!!

"آنسو"

جناب مسعود اختر جمال صاحب

کچھ تو ہوتا ان آنسوؤں میں اثر
داغ ہی میرے دل کے دھو دیتے

یا ترے گیسوئے پریشاں میں
موتیوں کی لڑی پرو دیتے

یا بڑھا کر یہ بے خودی میری
یاد بھی تیری دل سے کھو دیتے

اور یہ بھی نہیں تو کاش جمال
غم کے سیلاب میں ڈبو دیتے

لمعاتِ جمال

نقاب اُٹھا کے وہ جلوہ دکھا دیا تو نے
مجھے بھی میری نظر سے چھپا دیا تو نے

یہ تیرا حسنِ کرم ہے۔ تری نوازش ہے
کہ مجھکو عشق مجسّم بنا دیا تو نے

نظر سے چھیڑ کے مضرابِ عشق و سازِ وفا
تمام ہستیٔ دل کو جگا دیا تو نے

مری خطا ہے یہی میں تجھے بھلا نہ سکا
ترا کرم ہے کہ مجھکو بھلا دیا تو نے

نظر کے ایک اشارے سے موجِ ہستی کو
تجلیات کی رَو میں بہا دیا تو نے

چمن میں نرگسِ مخمور و جلوۂ گل کو
مری نگاہ۔ مرا دل بنا دیا تو نے

مری نظر میں غمِ دو جہاں کو اے ساقی
مئے نشاط پلا کر بڑھا دیا تو نے

جمال

(خاص "مضراب" کیلئے)

؟

(جناب سلام صاحب مچھلی شہری)

سب ہی یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ خیام کی رباعیوں اور [illegible] کو [illegible] (حالانکہ یہ بہت مشہور شاعر نہیں) کی نظموں کو وہ کیسے زیادہ پسند کرتا ہے کیوں کہ یہی دو چیزیں اس کے مطالعے میں دیکھی جاتی تھیں۔

سب ہی یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس کی ذاتی نظموں میں [illegible] اور موسیقی اور شراب و کباب کے تخیل پائے جاتے ہیں یا وہ رنج و غم اور موت کے مناظر بھی کس طرح کھینچ لیتا ہے کیوں کہ وہ ہر قسم کی نظمیں لکھتا ہوا پایا جاتا ہے

احباب اس کے متعلق یہی معلوم کرنا چاہتے تھے اور انہیں بھی کوئی شک نہیں کہ اس معاملے میں جمال کی زندگی ایک معمے سے کم نہ تھی۔

لیکن اب سب خوش تھے ان کو جمال کی عزیز ڈائری مل گئی تھی۔

کتنی حیرت کی بات ہے یہ ڈائری بالکل سادی تھی نظموں کے بدلے صرف پہلے صفحے پر ایک مختصر سی عبارت تھی جیسے کسی انگریزی یا فارسی نظم کا ترجمہ

"پھر وہ اسے اتنا عزیز کیوں رکھتا ہے؟"

"شاید کچھ پاگل ہو گیا ہے" دوستوں نے ایک مضحکہ خیز تبسم کے ساتھ ڈائری میز پر پھینکدی۔ "مگر یہ عبارت ہے کیا؟" منظر نے ڈائری اٹھالی۔

"خیام! تم اپنے گناہوں کے لئے اتنا افسوس کیوں کرتے ہو۔؟

اس توبہ اور فریاد سے کیا فائدہ؟
ان پر خدا کی رحمت نہیں ہو سکتی جنھوں نے کبھی گناہ نہیں کیا ہے۔

رحمت صرف گنہگاروں کے لئے ہے ——
پھر افسوس کیسا؟"

"حسین ساقی اٹھ اور اپنا رنگین پیالہ شراب سے بھر دے کیوں کہ میں اس سے دنیا کی تمام مصیبتوں کو دھو ڈالنا چاہتا ہوں" (خیام)

"دیکھو میں ٹھیک کہتا تھا جمال ایک رومانی شاعر ہے وہ صرف حیات اور شراب و شباب کا پیغام دیتا ہے" منظر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر نوٹ بک میز پر پھینکدی۔

اب دوستوں اور تمام ادبی حلقوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جمال ایک شاعر شباب ہے، وہ حوادث مصیبت اور موت کا افسردہ اور خشک پیام نہیں دیتا۔

جمال کی عمر بیس یا اکیس برس سے زیادہ نہیں ہے مگر وہ دن بدن گھلتا اور کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لوگ اسکی نظموں میں حسن و شباب کی کیفیت محسوس کرتے ہیں مگر اس کے لئے خود اس کی نظمیں دیمک بنتی جاتی ہیں۔

کچھ دن سے جمال بیمار ہے ——
آج زندگی کی آخری رات ہے۔
"اچھا میں نے اس ڈائری میں کچھ لکھا ہی نہیں" جمال مسکرایا۔

روح کی طرح سنجیدہ اور سفید ہاتھ قرطاس پر متحرک تھے "...... ایسی ہی گھڑی ہے جب شباب، مسرت اور ان سب چیزوں کو چھین لیتی ہے جو ہمارے پاس ہیں اور ہمیں زمین [illegible] کے سپرد کر دیتی ہے،

جب ہم دنیا کی سیر اچھی طرح کر لیتے ہیں تو وہ زندگی کے فسانے کو ختم کر دیتی ہے۔

لیکن اسی زمین۔ اسی قبر اور اسی خاک سے میرا خدا مجھے پھر اٹھائے گا۔

مجھے یقین ہے ۔۔۔۔ (والٹر ریلے)

دوسرے دن احباب جمال سے ملنے آئے۔

وہ مر چکا تھا۔

اس کی عزیز ڈائری اب بھی میز پر پڑی تھی۔ ستمگر نے ڈائری کے اندر سب سے اوپر والٹر ریلے کی یہ نظم لکھی ۔۔۔

"زمانہ بھی کتنا ظالم ہے جو شباب و مسرت اور ان سب چیزوں کو چھین لیتی ہے جو ہمارے پاس ہیں ۔۔۔"

اور درمیان کے تمام صفحے خالی تھے جن پر "؟" کے نشان بنے تھے۔

ہم لوگ گھر آرہے تھے ۔۔۔

میں نے منتظر سے متواتر کئی سوال کئے؟ ———

کیا وہ خالی صفحے پھر بھرے جاسکتے ہیں؟

وہاں کیا لکھا جاسکتا ہے؟

جمال کو والٹر ریلے کی یہی نظم کیوں پسند آئی؟

اس نے ڈائری میں کچھ لکھا کیوں نہیں وہ تو شاعر تھا؟

وہ شباب ہی میں کیسے مر گیا؟

کیا اس کی زندگی مسرت بخش نہیں تھی؟

ادب لطیف

یہ تمہاری بھول ہے ۔۔۔

جناب سلیم صاحب صدیقی

میں جانتا ہوں کہ تم ایک پیکر شعر و نغمہ ہو کائنات تمہارے گیتوں کی سحر آفریں دھن پر رقصاں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک مجسمہ حسن و جمال ہو۔ فضائیں تمہارے ترنم کی بے پناہ کشش میں ڈوبی ہوئی ہیں —— اور میرے سینے میں ایک حساس دل بھی ہے۔ لیکن —— کیا تمھیں نہیں معلوم کہ ملک کے نوجوان اسوقت فوجی بینڈ کی گت پر ایک جنگی ترانہ گا رہے ہیں۔ کیا تمھیں اس کی خبر نہیں کہ افلاس زدہ کسان اپنے ملک کی حفاظت کے لئے میدان کارزار کی طرف برابر آگے بڑھتے جارہے ہیں۔ دیکھو فضا میں مزدوروں کا سرخ جھنڈا لہرا رہا ہے

تم مجھے روک رہی ہو —— نہیں ۔ نہیں ۔ یہ کبھی نہ ہوگا —— خدا حافظ ۔ مجھے تم سے ملنے کی فرصت نہیں۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اس کشمکش سے دامن چھڑا کر تمہارے دامن میں پناہ لونگا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں ان مصائب کو بھول کر تمہاری یاد کی لطافتوں سے دل کی جنت بساؤں گا۔ لیکن میری دلنواز یہ تمہاری بھول ہے۔

شاعر کا سجدہ

(جناب شرف احمد خاں صاحب سروش)

عبودیت سے جو ایک روز قلب گھبرایا
تو نقش بندگی. دل سے مٹا دیا میں نے

گلا کے آہنی زنجیر آدمیت کی
نشیمن بشریت جلا دیا میں نے

بجھا کے محفل ہستی میں ہوش کا فانوس
جنوں کی شمع کو رہبر بنا دیا میں نے

سنہرے ابر سے ٹپکا کے زندگی کی شراب
ضمیر وقت کو بھی تھرتھرا دیا میں نے

شفق کی مے کو ستاروں کے جام میں بھر کر
صنم کدے میں قمر کے بہا دیا میں نے

بلند اتنا ہوا میرا شہپر پرواز
چراغ شمس و قمر جھلملا دیا میں نے

لرزتے رہتے ہیں جس جا پہ شہپر جبریل
وہاں سے بھی قدم آگے بڑھا دیا میں نے

ستارہ اک چمک اٹھا ضمیر یزداں میں
حریم قدس کا پردہ اٹھا دیا میں نے

جبیں پہ اپنی ستاروں کا تاج کج کر کے
الوہیت کا چمن جگمگا دیا میں نے

نہ دیکھی میں نے وہاں جب شعاع برق جمال
تو پھر نگاہ کا پردا جلا دیا میں نے

رُخ پہلے نور نے حلقے میں لے لیا مجھ کو
سروش سجدے میں سر کو جھکا دیا میں نے

امانت

جناب الیاس احمد صاحب ردولوی

رات تقریباً آدھی ڈھل چکی ہے۔ چودھویں کا چاند ہے۔ بے بادل آسمان سے اپنی شعاعہائے نورین کے خم لئے اتر رہا ہے ساری کائنات ایک خواب در مرمریں معلوم ہوتی ہے۔ وکٹوریہ پارک کی سحر آگیں خاموشی میں دفعتاً ایک موٹر کی آواز گونجی اور چند لمحوں بعد ایک کار نکلا۔ وکٹوریہ کے مجسمے کے بالکل سامنے ٹھہر گئی۔ اور اس میں سے ایک شکیل نوجوان اور ایک بہت حسین لڑکی اترکر پاس والے سبزے پر جا بیٹھے

سریندر۔ کہو سروج تصویر کیسی رہی۔

سروج۔ نہایت اچھی حقیقتاً یہ ایم۔ بی۔ ایم کا شاہکار کہی جانے کے لئے مستحق ہے۔ مگر چھوڑو ان باتوں کو مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔

سریندر۔ تو کہو میں سننے کے لئے بالکل آمادہ ہوں

سروج۔ سریندر مجھے افسوس ہے کہ مجھ میں ماں بننے کے آثار پیدا ہو چکے ہیں، مجھے اس کی کچھ تشویش نہیں لیکن ڈر اسکا ہے کہ کہیں اس کا اور امتحان کا تصادم نہ ہو جائے۔

سریندر۔ بہوا کیا۔ دیوالیہ کی طرح مصیبت ہو رہا تھا۔ سروج یہ بڑی بری خبر ہے تمھیں ماں ہرگز نہ بننا چاہیئے۔

سروج۔ کیوں؟

سریندر۔ اس لئے کہ اس سے ہمارا تمھارا معاملہ دنیا پر آشکارا ہو جائے گا اور اسمیں ہم دونوں کی سخت رسوائی ہے۔

سروج۔ سوال کا سوال کیا سوال ہے تم اپنے پتاجی سے سارے واقعات کہکر مجھ سے شادی کرنے کی اجازت حاصل کر لو۔

سریندر۔ کہدیا ہوا لیکن تم تو جانتی ہو۔ پتاجی ابھی میری شادی کرنی نہیں چاہتے۔ ان کی خواہش ہے کہ ابھی ایم۔ اے کرنے کے بعد ولایت جاؤں۔ اور ڈاکٹریٹ حاصل کروں پھر کہیں شادی ہوگی۔

سروج۔ ان سے کہو تو۔ جب وہ واقعات سے آگاہ ہو جائیں گے اور انھیں معلوم ہو جائیگا کہ ہم تم ایک دوسرے کو ایک عرصہ سے چاہتے رہے ہیں تو وہ ضرور شادی کی اجازت دیدیں گے۔

سریندر۔ نہیں سروج۔ وہ کبھی بھی اس کی اجازت نہ دیں گے۔ میں ان کی طبیعت سے خوب واقف ہوں اور اتنا ہی نہیں۔ وہ اس واقعہ کو اپنی پوزیشن پر ایک سخت دھکا بھی متصور کریں گے۔ لہذا میری بات مانو میں کل تمھیں یونیورسٹی میں ایک دوا لا دوں گا۔ تم اسے کھا لینا اور بس۔

سروج۔ میں ایسا ہرگز نہ کروں گی۔ تمھیں شاید باپ بنتے ڈر لگتا ہے! ——————؟

سریندر۔ ہاں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ نہ میں ابھی باپ بننے کو تیار ہوں اور نہ تمھیں ماں بننے دینا چاہتا ہوں۔

سروج (جس کے چہرے پر غصے کی سرخی دوڑ رہی ہے) تم باپ بنو نہ بنو۔ لیکن مجھے ماں بننے میں کوئی عار نہیں ہے

سریندر۔ دیکھو سروج۔ بچپنے کی باتیں نہ کرو۔ اس سے تم بھی بدنام ہوگی اور میں بھی۔ آخر تم دوا استعمال کرنے سے

انکار کیوں کرتی ہو۔

سروج۔ میں اپنے آنے والے بچے کی قاتل کبھی نہوں گی۔ اس کے علاوہ میں اسے اپنی اور تمہاری سچی محبت کا حاصل سمجھتی ہوں۔ گناہ کی پیداوار نہیں۔

سرنیدر۔ لیکن یہ تم سمجھتی ہو نا؟ دنیا تو ایسا کبھی نہ سمجھے گی۔

سروج۔ دنیا نہ سمجھے گی تو کیا ہوا۔ میرا ضمیر تو مجھے ناپاک نہ کہے گا۔

سرنیدر۔ سروج۔ ضمیر کے نشتر اتنے تیز نہیں ہوا کرتے۔ جتنے دنیا والوں کے تمہیں ابھی شاید اسکا تجربہ نہیں ہوا۔

سروج۔ (غصے سے کھڑی ہو کر) تو تم چاہتے ہو کہ میں دوا سے بچے کو ضائع کر دوں اور اپنے حاصل محبت کو حاصل معصیت بنا ڈالوں۔ یہی نا۔

سرنیدر۔ سروج محبت اور معصیت میں بڑا فرق ہے اور پھر کچھ بھی نہیں محبت اپنی ... لبادہ اوقات معصیت کا روپ بھرتی ہے اور انکار چھپکتی ہے اور محبت کرنے والے اور دنیا والے محبت کی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں پاتے لیکن جب کبھی محبت معصیت کا ایسا روپ بھر لیتی ہے جس کا علیحدہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے تو محبت ایک "معصیت مستقل" بنکر رہجاتی ہے۔ دنیا والوں کی نگاہ میں بھی اور محبت کرنے والوں کی نگاہ میں بھی سمجھو سروج ہوش کے لئے سمجھو۔

سروج۔ دنیا والوں کی نگاہ میں محبت کی صورت مسخ ہو جاتی ہوگی۔ لیکن محبت کرنے والوں کی نگاہ میں وہ ہمیشہ بے داغ رہتی ہے بشرطیکہ محبت میں فریب کو دخل نہ ہو

سرنیدر۔ (گھڑی دیکھ کر) اف ایک بج چکا ہے۔ اب اسوقت تو اس مسئلہ کو زیادہ طول نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن میں پھر کہتا ہوں سروج کہ تم میری بات پر غور کرو اور کل یونیورسٹی میں مجھے بتانا۔

"دوسرے دن گیارہ بجے"

——— یونیورسٹی لائبریری کے سامنے والے سبزے پر سروج ایک عجیب ربودگی کے عالم میں ٹہل رہی ہے کل کی شوخ و نٹکھٹ آج ایک مجسمہ حزن و یاس بن چکا ہے وہ بتا رہا ہے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اسے آواز دے رہا ہے وہ پیچھے مڑتی ہے اور سرنیدر کو لمبے لمبے قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھتی ہے۔

سروج۔ کہو کیا کہنا ہے؟

سرنیدر۔ کہنا کچھ نہیں۔ میں وہ دوا لے آیا ہوں (کوٹ کی جیب سے ایک ... نکالتے ہوئے) یہ لو

سروج (خشکیں انداز میں) میرا فیصلہ وہی ہے جو کل تھا۔ سنا تم نے میں دوا ہرگز نہیں پی سکتی۔

سرنیدر۔ سروج۔ انجام پر نظر کرو۔ تم یہ کیا کہہ رہی ہو ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے خدانخواستہ دیر ہو گئی تو سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہوگا۔

سروج میں کف افسوس کیوں ملنے لگی۔ میں نے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی ہے جس کے لئے مجھے منفعل ہونا پڑے ہاں ـــ اگر میں نے دوا کھا کر اپنی محبت کی نشانی کو فنا کر دیا تب البتہ مجھے پشیمان ہونا پڑے گا کیونکہ اسوقت میرا ضمیر مجھ سے کہے گا "سروج۔ تو قاتل ہے۔ تو بدکار ہے۔ تو نے محبت نہ کی تھی گناہ کیا تھا۔" سرنیدر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ماننا کہ لئے تمہیں میرے سرمایۂ محبت کو سرمایہ معصیت سمجھنے پر مجبور نہ ...

مسر نیدرا۔ میں تم سے یہ کب کہتا ہوں کہ تم اسے سرمایۂ معصیت تصور کرو۔

سروج۔ لیکن اس حرکت کے معنی یہی ہوں گے۔ بچہ کو ضایع کردینا میرے آسودہ گناہ ہونے پر دلالت کرے گا اور میں یہ کبھی بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ تم باپ بننے کو تیار نہیں ہو ——— میرا بچہ کیا کہلائے گا اور میں ——— لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں دنیا والوں کی نگاہ میں میں اس سے ضرور ذلیل ہو جاؤں گی مگر اپنی نگاہ میں نہیں۔

مسر نیدرا۔ تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ تم میری خواہش کو رد کر رہی ہو۔

سروج۔ ہاں تم یونہی سمجھ لو۔

مسر نیدرا۔ (گڑگڑاتے ہوئے) سروج اگر میری عزت کا نہیں تو میرے پتا ماتا کی عزت کا خیال کرو۔ اس سے میرے خاندان کی پشتہا پشت کی حاصل کی ہوئی آبرو جاتی رہے گی۔

سروج۔ تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمھیں اپنی رسوائی کا خوف ہے۔ میرے ماتھے پر کلنک کا جو ٹیکہ لگنے والا ہے اس میں شاید تم اپنی تصویر دیکھتے ہوئے ڈرتے ہو۔ بولو

مسر نیدرا۔ نہیں۔ نہیں سروج میں تمھاری خاطر بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سروج۔ (مسر نیدر کی بات کاٹتے ہوئے) خاموش۔ میری خاطر داری تمھیں منظور ہوتی تو یہ صورت کبھی نہ پیدا ہوتی بہرحال تم اطمینان رکھو۔ میں تمھیں بدنام نہ ہونے دوں گی۔ کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکیگا کہ بچے کا باپ کون ہے میں اپنے بچے کی قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں۔

(خاص)

بادۂ شیراز

جناب حکیم ابراہیم صاحب فخر دہلوی

وہ عشوہ ترا سروِ گل اندام نہیں ہے
وہ جلوۂ مہتاب، لبِ بام نہیں ہے

آئینۂ دلبر، دلِ ناکام نہیں ہے
اُٹ اپنی طرف روئے دلآرام نہیں ہے

جز بیخودیٔ عشق، مجھے کام نہیں ہے
جز ناز و فریاد کچھ آرام نہیں ہے

شیریں سخنی میں ترے ہونٹوں کے مقابل
گویا لبِ نے خندۂ صد جام نہیں ہے

دلبر کی اداؤں کا احاطہ نہیں ہوتا
ایسی بھی ہیں کچھ جنکا کوئی نام نہیں ہے

رشتے دلِ دیوانہ تری مژگاں نے ہیں ڈالے
پھر بھی خلش اندیشۂ انجام نہیں ہے

اِک جلوۂ بیرنگ سے ہے ربط نظر کو
نظارہ پریشان لبِ بام نہیں ہے

اے فخر نہیں درد محبت کے سوا کچھ
خاموش کہ احساسِ نظر عام نہیں ہے

عورت

جناب علی سردار صاحب جعفری

کیا ہوا گر تیری رنگیں رہگذر سے دور دور
زندگی کے راستوں میں پیچ و خم کھاتا ہوں میں

تو نہ جانے کیوں سمجھتی ہے کہ تجھ کو بھول کر
اپنے احساسات کی دنیا میں کھو جاتا ہوں میں

میری خاموشی پہ اکثر تمتما اٹھتی ہے تو
تیری خاموشی کا لیکن راز پا جاتا ہوں میں

چاہتی ہے مجھ سے تو نسوانیت کا احترام
اور تری انسانیت کے زمزمے گاتا ہوں میں

آہ یہ تہذیب کا جادو۔ تمدن کا فریب
سوچتا ہوں جس قدر اتنا ہی شرماتا ہوں میں

"اک سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھی ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھی ہے تو"

اس نظام زندگی میں جس سے رسوا ہے حیات
تیری ہستی رقص عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں

اپنے ہونٹوں کی حسیں گلنار محرابوں سے پوچھ
ان میں بوسوں کی حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرے ابرو کے اشاروں میں ارادہ ہے نہ شوق
تیری آنکھوں میں شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ ترے ماتھے کا ٹیکا یہ تری زلفوں کے خم
کاروان رنگ و نکہت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ ترے چہرے کا غازہ یہ ترے ہونٹوں کا رنگ
عشق کی نظروں کی دعوت کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرے اعضا کی نزاکت تیرے پہلو کا گداز
مرد کے بستر کی زینت کے سوا کچھ بھی نہیں

میں یہ کہتا ہوں محبت زندگی کا درد ہے
تو یہ کہتی ہے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

سوچتا ہوں اور اکثر سوچتا رہتا ہوں میں
کیا تری دنیا نزاکت کے سوا کچھ بھی نہیں

جذب کر لیتی ہے تجھ کو مرد کی جادوگری
تو کہ اک لمحے کی فرصت کے سوا کچھ بھی نہیں

اک نشاط انگیں کھلونا بنکے رہ جاتی ہے تو
جیسے تو سامان راحت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ تکلف یہ تصنع یہ ادب یہ احترام
اک ہوس پرور سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں

جب تلک تو خود نہ توڑے گی طلسم رنگ و بو
تیری قیمت ایک عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

(خاص اضطراب کے لیے)

مصطفیٰ کمال اتاترک

محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ

کون ایسا شخص ہوگا جو مصطفیٰ کمال کی شخصیت سے واقف نہ ہوگا۔ غازی موصوف بیسویں صدی کے بہترین سپہ سالار، اعلیٰ مدبر، بڑے مصلح کار، و بہت اعلیٰ درجہ کے سیاستداں تھے۔ آپکا وجود نہ صرف مسلمانوں کیلئے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کے لئے باعث فخر تھا۔ آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ترکی کو یورپ کے چنگل سے بچایا تھا۔ جہالت کو دور کیا ملک کے منتشر شیرازہ کو جمع کیا آپ کو اس مقصد کے لئے طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا مگر اس اولعزم شخص نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جس ملک کو دنیا "مرد بیمار" یا "بیمار ترکی" کے نام سے موسوم کرتی تھی اسقدر طاقتور بنا دیا کہ براعظم کی بڑی سے بڑی سلطنت اس کے نام سے کانپنے لگیں۔ یورپ آپ سے اسقدر خوفزدہ تھا کہ آپ کو "گرے وولف" یعنی بھورا بھیڑیا کے نام سے پکارتا تھا۔ شہنشاہ جارج پنجم نے آپ کو گیلی پولی کی تاریخ کی ایک کاپی دی جس میں مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کش تحریر تھی۔ "دنیا کے سب سے بڑے کمانڈر، فیاض دوست، شریف دشمن سپہ سالار عالی غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے حضور میں اپنی نیک دوستی کے ثبوت میں یہ کتاب ہدیہ پیش کرتے ہیں۔"

بیسویں صدی کا یہ سب سے بڑا انسان ۱۲ مارچ ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوا تھا۔ ابھی پانچ ہی سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ نے اسقدر عمدہ تعلیم اور تربیت دی کہ آج دنیا ان کی مداح ہے۔ آپکا نام صرف مصطفیٰ تھا۔ جب میٹرک پاس کرکے آپ نے ملٹری کالج میں داخلہ کرایا تو آپ کو دیکھتے ہی ایک مصری پروفیسر کے منہ سے نکلا کہ یہ لڑکا کسی دن دنیا میں کمال حاصل کریگا۔ جب سے آپ مصطفیٰ کمال کہلانے لگے۔

چونکہ بچپن سے آپ کے دل میں وطن کا خیال موجزن تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے بغیر کسی قسم کی جھجک کے ملک میں اپنی تقاریر کے ذریعہ سے جوش پھیلانا شروع کیا۔ ترکی کے لیے یہ دور نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا۔ ملک میں بیک وقت تین طاقتیں کارفرما تھیں۔

(۱) سلطان کی سازشی حکومت جسے ملکی فلاح و بہبود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ سلطان کو صرف اپنی عیاشیوں کی پڑی تھی۔ اور اس کے لئے وہ ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتے تھے۔ انھیں حرم کی رنگ رلیوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ عوام کی مصیبتوں پر نظر کرتے۔

(۲) غیر ملکی حکومتیں جن کی عدالتیں، ڈاکخانے اور پولیس کے محکمے الگ الگ قائم تھے۔

(۳) قوم کی خود ساختہ پارلیمنٹ کی قوت جو قانون کے ذریعہ عوام کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی۔

ان طاقتوں کے علاوہ ایک طاقت اور بھی تھی جو خفیہ طریقے پر اپنا کام کر رہی تھی اور جس کا یہ مقصد تھا کہ موجودہ حکومت کو ختم کرکے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جائے لیکن عوام کی اس بڑھتی ہوئی کشمکش میں تعمیر سے زیادہ تخریب کا پہلو تھا۔ فوجی قوتوں کی زمام ایک جوشیلے سپہ سالار انور پاشا کے ہاتھ میں تھی جو ملک کے اندرونی مسائل سے نظر ہٹا کر یورپ کو فتح کرنے کے منصوبے سوچا کرتے تھے۔ سلطان کی بے راہروی سے ملک پر قرضے کا

انبار لدتا چلا جاتا تھا۔ جن کے سود کی ادائیگی بھی ناممکن نظر آتی تھی۔ جن غیر ملکی حکومتوں نے قرضہ دیا تھا انھوں نے ملک میں بیچارہ ماتحتوں کے ذریعہ سازشوں کا ایک جال بچھا رکھا تھا اور وہ ترکوں کی جنگجویانہ اسپرٹ کو یکلخت ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اس ناگفتہ بہ دور میں مصطفیٰ کمال پاشا کا عروج واقعی ایک معجزہ ہے۔ انھیں صرف غیر ملکی حکومتوں سے ہی نہیں بلکہ خود اپنے ملک کی تخریبی طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور آخر کار وہ کامیاب ہوئے۔

کمال کے آہنی ارادوں اور کامیابی کا راز سمجھنے سے پیشتر ہمیں پہلے ان کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیے۔ موصوف بچپن ہی سے بلا کے ذہین واقع ہوئے تھے۔ ان کے معلم ہمیشہ ان کے مداح رہے۔ تعلیمی دور ختم کر کے آپ نے فوجی تعلیم حاصل کی جب آپ اٹھارہ (۱۸) سال کے ہوئے۔ اسی زمانے میں ترکوں اور یونانیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ آپ نے اس میں شرکت کی۔ اور پہلی مرتبہ عملی جنگ کے تجربے حاصل کئے اس معرکہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ نے قسطنطنیہ کی فوجی کالج میں داخلہ لیا اور وہاں کے امتحان میں اول رہے انھیں ایام میں آپ نے اطراف و جوانب میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی بلکہ ان ترقیوں سے متاثر ہو کر خود سلطان نے ایک مرتبہ انھیں دربار میں بلایا اور شرف بار یابی بخشا۔ جس کی وجہ سے عوام کی نظروں میں آپ کی عزت نظاہر بڑھ گئی۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہی شخص سلطان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خود اس ملک کی قسمت کا مالک بنے گا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد بائیس سال کی عمر میں آپ فوج میں لفٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں سے آپ کی عملی زندگی کا اور قومی جد و جہد کا آغاز ہوتا ہے

ابتدا میں آپ نے وطن کے نام سے ایک ملکی انجمن قائم کی جس کی شاخیں دور و نزدیک پھیلتی رہیں اسی سلسلے میں آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دو مرتبہ گرفتار ہوئے لیکن حکومت نے آپ کی سابقہ خدمات کا خیال کر کے رہا کر دیا۔ اور اس انجمن کو خطرناک سمجھکر سلطان نے کمال کو بیروت بھیج دیا۔ اور اس کے بعد دمشق میں ایک فوجی دستہ کا کپتان مقرر کر دیا۔ یہاں پر بھی موصوف اپنی کوششوں سے باز نہیں آئے۔ اور ترکوں میں انقلابی روح بیدار کرنے کے لیے ایک انجمن "فادر لینڈ" کے نام سے قائم کی اس میں کچھ فوجی افسر اور ترک سپاہی بھی شامل ہو گئے۔ اسی دوران میں روسیوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے مصطفیٰ کمال کو پھر جنگ میں حصہ لینا پڑا۔ اس مہم کو آپ نے اس بہادری اور قابلیت کے ساتھ سر کیا کہ وہاں کے واپسی پر حکومت نے آپ کو میجر کا عہدہ دیا۔ اب اس انجمن کی اشاعت بیت المقدس۔ حلب اور نواحی علاقوں میں بھی تیزی سے ہونے لگی۔ اور ترکوں میں کافی بیداری پیدا ہو گئی۔ لیکن پھر بھی کامیابی کا تصور ابھی بعید از فہم تھا۔ غیر ملکی ریشہ دوانیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ سلطان کی حکومت مذہب اور خلافت کی آڑ میں عوام کی ذہنیت کو بنیادی مسائل سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ جس کا لازمی اثر یہ تھا کہ ترکی حکومت نہ تو تمدنی ترقی کر سکتی تھی اور نہ بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس نفسی نفسی کے عالم میں ملاؤں اور مولویوں کی بن آئی تھی وہ خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنی دنیا کو رشک فردوس بنائے ہوئے تھے اور قوم کو جہنم کے دروازے تک لیجانے میں حکومت کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ قومی جماعتوں کو حکومت سے زیادہ ان مذہبی پنجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اس زمانے میں "مقدونیہ" انقلاب و بغاوت کا مرکز تھا۔ کمال نے کسی طرح اپنا تبادلہ وہاں کرا لیا۔

اور انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر بن کر انھوں نے نہایت مستعدی سے اپنا کام شروع کیا۔ دوسری طرف انکی
انجمن بھی روز بروز ترقی کرتی رہی۔ ان تمام ذرائع کے علاوہ انھوں نے ملک کی دوسری ترقی پسند قومی جماعتوں
سے معاہدے کر رکھے تھے تاکہ اس سے مدد لی جائے۔ انھیں ایام میں سلطان نے ملک کے تمام تجربہ کار
جرنیلوں اور مدبروں کی ایک جماعت طلب کی تاکہ ان کے خیالات سے فائدہ اٹھا کر ملک کی حالت
درست کی جائے۔ سلطان المعظم خود پس پردہ لوگوں کی تقریریں سن رہے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اس موقعہ پر
غیر معمولی جرات سے کام لیکر ایک دستور ساز اسمبلی کی تحریک پیش کی اور موجودہ نظام کو بے انتہا ناقص
اور تباہ کن بتایا۔ آخرش یہ تحریک کامیاب ہوئی اور تمام جلاوطن ترک جو قومی تحریک کے سلسلے میں ملک کے
باہر اپنی زندگی بسر کر رہے تھے واپس بلا لئے گئے لیکن خود سلطان کی خفیہ ریشہ دوانیوں سے رفتہ رفتہ
دستور ساز اسمبلی ناکامیاب ہونے لگی۔ مصطفیٰ کمال اس موقعہ پر پہلی مرتبہ قومی رہنما کی حیثیت سے سامنے آئے
اور لوگوں کو کہا کہ ابھی اصلاحات ناقص ہوئی ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم لوگوں کی تمام توقعات پوری ہونگی۔ گھبرانے اور
شور مچانے سے ہم لوگ کچھ تعمیری کام نہ کرسکیں گے۔ ابھی حالات پر پوری طور پر قابو نہ حاصل ہوا تھا کہ آسٹریا
نے بوسنیا اور ہرزگوینا ترکی کے دو صوبوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ سرویا نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا
بلگیریہ کا عیسائی گورنر وہاں کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا۔ یونان نے کریٹ کو اپنے مقبوضہ علاقوں میں
شامل کرلیا۔ دوسری طرف طرابلس پر اٹلی کے حملے کا اندیشہ غالب تھا۔ ان بغاوتوں میں بہت کچھ سازشیں
خود سلطان کی تھیں۔ جو ملک کی مرکزی حکومت کو کمزور کرکے اپنا اثر بڑھانے کے لئے کوشاں تھے کمال کو
ایسے نازک موقعہ پر طرابلس بھیج دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت طرابلس کی حالت بھی بہت نازک تھی لیکن غازی
موصوف نے شیخ سنوسی کی مدد سے وہاں کے نظم و نسق کو بخیر و خوبی سنبھال لیا۔

ابھی یہ سب ہنگامے فرو نہ ہونے پائے تھے کہ سلطان نے رجعت پسندوں کی مدد سے ترکوں کی قومی
جماعتوں کی بیخ کنی شروع کردی۔ اور اسی سلسلہ میں مشہور ترکی قوم پرست اڈیٹر طیسنن کو شاہراہ عام پر پھانسی
دیدی گئی۔ اس واقعہ نے قومی کارکنوں پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ بھاگ بھاگ کر سالونیکا میں جمع ہونے
لگے۔ غازی موصوف بھی ایک سوداگر کے بھیس میں وہاں جا پہنچے اور ان لوگوں کو جوانمردی کے ساتھ ان ناسازگار
حالات کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا۔ یہاں پر باغیوں کی ایک فوج بنائی گئی جس کے کمانڈر خود غازی
موصوف تھے۔ اس وقت بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ سلطان نے بھی اپنی تمام طاقتیں جمع کر رکھی تھیں اور
وہ باغیوں کا سر کچلنے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن حق و باطل کا یہ معرکہ ترکی قوم کی عظیم الشان کارناموں میں سے
ایک ہے مصطفیٰ کمال آندھی کی طرح آگے بڑھے اور ایک ہی دن میں استنبول پر جا کر دم لیا۔ یہ ایک حیرت انگیز
فوجی کارنامہ ہے۔ جنگ میں فتح باغیوں کی ہوئی۔ اور سلطان المعظم کو معزول کرکے ان کی جگہ محمد رشاد (محمد خامس)
کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں آپ پیرس میں بغرض مطالعہ آلات حرب بھیجے گئے اور وہاں سے آکر ایک
طویل مضمون اسی موضوع پر لکھا جس میں ترکی فوج کو بالکل نکمی اور ناکارہ بتایا اور جدید طریقوں پر ترکی فوج میں
بھی انقلاب کر دینے کی تجویز پیش کی۔ حکومت نے مجبوراً آپ کو فوجی پرنسپل کے عہدے پر مامور کیا۔ جو اس زمانے
میں بہت اہم تھا لیکن انہی ایام میں طرابلس پر اٹلی نے حملہ کردیا۔ غازی موصوف اپنے عہدے سے استعفے
[illegible]

دیگر بھیس بدلے ہوئے مصر کے راستہ سے طرابلس جا پہونچے۔ بعد میں انور پاشا بھی انکی ماتحتی میں کام کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ لیکن یہاں پر ذہنی اختلاف کے باعث ان دونوں سپہ سالاروں میں تفرقہ کی بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر جنگ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ برآمد ہوا اور حکومت نے اغیار کے دباؤ سے مجبور ہو کر انھیں واپس بلا لیا۔ غازی موصوف کے لیے یہ پر آشوب زمانہ تھا۔ انور بے کی مخاصمت نے بھی ان کے عزائم کو بہت نقصان پہونچایا کیونکہ عوام کی باگ دوڑ اُس وقت انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ ان دنوں ترکی میں واقعات نہایت تیزی سے بدل رہے تھے۔ دوسری طرف یورپین حکومتیں بھی اس بدنصیب ملک کے حصے بخرے کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔ لیکن کوئی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ قسطنطنیہ اور درہ دانیال پر اس کے سوا کسی دوسری حکومت کا قبضہ ہو۔ یہ باہمی رقابت ہی کمزور ترکی کی حلیف تھی۔ اس کے بعد جرمنی کی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں اور جنگ عظیم کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ مصطفےٰ کمال نے بہت کوشش کی کہ اس نازک دور میں ترکی جنگ میں نہ اُلجھنے پائے لیکن انور بے کی جوشیلی طبیعت نے ان کے ارادوں کو پست کر دیا اور ترکی بھی میدان کارزار میں کود پڑا۔

جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے کون ہے جو واقف نہیں۔ جرمنی کی شکست ترکوں کی بربادی کا باعث ہوئی۔ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس طرح خلیفہ کا اقتدار بھی ختم ہو گیا اور ان کی حیثیت کٹھ پتلی کی سی ہو گئی۔ جس نے اتحادیوں کی تجویز کے مطابق غازی موصوف صرف اس جرم میں باغی قرار دیا کہ وہ اناطولیہ میں اپنے ملک کو دشمنوں کے پنجے سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت ترکی فوج بمشکل ساٹھ ہزار تھی اور ہر ترک کو بیک وقت تین اور کبھی کبھی چار چار یونانیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن پھر بھی مصطفےٰ کمال نے نہایت استقلال سے دشمنوں کو شکست دے کر ترکی کو خود مختار سلطنت تسلیم کرا لیا۔ اب جدید ترکی کی بنیاد پڑی خلافت اور بادشاہت اڑا دی گئی جمہوریت قائم کی گئی جس کے صدر خود مصطفےٰ کمال منتخب کئے گئے۔ اور پے در پے چار دفعہ آپ کا انتخاب ہوا۔

ترکی کو سب سے زیادہ نقصان اپنوں سے پہنچا ادھر جنگ عظیم میں عربوں نے غداری کر کے مخالفوں کی مدد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حجاز ترکی کے ہاتھ سے نکل گیا ادھر خود ترکی کی حکومت میں جو مذہبی عنصر غالب تھا اُس نے تقدس کی آڑ میں ملک کی تباہی میں کافی حصہ لیا لیکن غازی موصوف نے جاہل اور قدامت پرست مولویوں سے ملک کو خالی کرانا شروع کیا اور جگہ جگہ کالج اور یونیورسٹیاں، کتب خانہ قائم کئے جس کی وجہ سے ہر طرف تعلیم عام ہو گئی یہ تعلیم ہر ترک عورت اور مرد کے لیے لازمی قرار دی گئی۔ یورپین اقوام کا جو رعب ترکی پر چھایا ہوا تھا اسے دور کیا گیا۔ اس طرح چند سال میں ترکوں کو اپنی زبان اور اپنی قوم سے محبت ہو گئی اور اب وہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح نماز میں رٹے ہوئے الفاظ نہیں استعمال کرتے بلکہ نماز اور قرآن شریف سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ کمال اتاترک نے آج جو احسانات مسلمانوں پر کئے ہیں کسی طرح بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان کا وجود صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ایک ایسا قابل فخر کارنامہ ہے جس پر انسانیت کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

آج جبکہ موجودہ جنگ کی تباہ سامانیوں کے باعث یورپ کا نقشہ روز بروز تبدیل ہو رہا ہے۔ یہی مصطفےٰ کمال ایسے مدبر کی بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے لیکن امید ہے کہ عصمت انونو بھی اپنے پیش رو کی طرح ترکی کے نگہبان ثابت ہونگے۔

خاص "اضطراب" کے لیے

پاپی

جناب ملک سلمان الارشد صاحب فاروقی

زندگی کی قیمت روپیہ ہے اور روپیہ کی قیمت زندگی۔ غربت کی نشانی نوٹوں کی گڈیاں ہوتی ہیں اور ذلالت کی نشانی غربت ہے یہی اس دنیا کا معیار ہے اور اسی کسوٹی پر دنیا کے افراد کھرے کھوٹے کی پہچان کرتے ہیں۔ راجو زندگی کی اسی منزل میں تھا۔ اس کا دنیا میں اگر کوئی تھا تو صرف اس کی بہن لاجونتی تھی جس سے کہ وہ بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اور وہ اس کا دین و ایمان تھی۔ اس کی دنیا میں صرف ایک آرزو تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ لاجونتی کا بیاہ ہو جائے۔ مگر بیاہ کی لازمی شرط سماج نے یہ رکھی ہے کہ لڑکی کو کچھ زیور دیا جائے اور دولہا کی قیمت چند روپہلی اور سنہری سکوں کے ذریعہ ادا کی جائے۔ غریب راجو ایک معمولی کسان تھا جس کی کل کائنات چند بیگھے زمین۔ دو بیل اور ایک ہل تھا۔ لاجونتی کے بیاہ کے لیے جتنے روپیوں کی ضرورت تھی وہ کبھی اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھے تھے پھر بھلا وہ کس طرح سے لاجونتی کا بیاہ کر سکتا تھا

گاؤں کا دوسرا خدا زمیندار ہوا کرتا ہے اور جب غریب دیہاتی آسمانی خدا سے نا امید ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس انسانی خدا سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یہ خدا روحانیت سے کوسوں دور گرگ در گرگ فریب میں یکتا ہوتا ہے۔ وہ شروع میں اپنی لچھے دار باتوں سے غریبوں کو اپنا گرویدہ کر لیتا ہے۔ اور پھر اپنی من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ رائے لچھمن داس جی اپنے گاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے غریبوں اور مظلوموں کی انھوں نے کبھی حمایت کی تھی۔ کب اور کیسے یہ سب ہی جانتے تھے لیکن کیوں یہ اسکی کسی کو خبر نہ تھی۔ اس گاؤں کے لوگ فخریہ بیان کرتے تھے کہ ہمارے گاؤں کے زمیندار منش نہیں ہیں۔ بلکہ اوتار ہیں اوتار۔ البتہ دولی چند۔ بجو اور شیخ جی اس راز سے واقف تھے کہ رائے لچھمن داس اوتار کے بھیس میں مکر و فریب کے دیوتا ہیں۔ ان کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ مردہ خواہ دوزخ میں جائے یا جنت میں انکی بلا سے۔

سیکڑوں لڑکیوں کی رائے صاحب نے اپنے خرچ سے شادی کرائی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں اقتصادی مشکلات کے باعث ان لڑکیوں کے والدین کی زمین اور بیل قرق کرا لیے۔ مگر پھر بھی وقت پر مدد تو کر دیتے تھے یہی کیا کم بات تھی۔ دوسرے لڑکیاں جب بھی اپنے میکے آتی تھیں تو رسماً ایک رات کے لئے مالک کے گھر جانا ضروری تھا خواہ گھر والے موجود ہوں یا نہ ہوں

لاجونتی کی عمر ۱۶ برس کی ہو چکی تھی دل میں امنگیں بیتاب تھیں لیکن ہونٹوں پر شرم سے خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی اور ساتھ ہی گاؤں والوں کی حریص بھوکی نگاہیں اس پر پڑ رہی تھیں۔ مگر بیاہ اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ لاجونتی کے پاس روپہلی اور سنہری سکے دینے کے لیے نہیں تھے ——— پھر بھلا ان نوجوانوں کے ماں باپ اس رشتہ کو کیسے قبول کر سکتے تھے البتہ گاؤں بھر میں بھگوا ایک ایسا نوجوان تھا جس کا سر پھر گیا تھا پھر وہ لاجونتی سے بیاہ کے لیے تیار تھا اور روپیہ پیسے کا طالب نہیں تھا مگر آج اس سے اس لئے لاجونتی کا بیاہ نہیں ہو سکتا تھا کہ گاؤں والوں نے اس کو اسی جرم کی بنا پر برادری سے خارج کر رکھا تھا کہ غریب نا جوالیسا اقدام

کرنا کوقصداً برابر ری اس کا بھی حصہ بالی بند کر دیتی تا راجو سماج کے انتقام کے خوف سے قدم نہ بڑھا سکا۔

مجبوراً غریب راجو نے آس پاس کے گاؤں میں بر کی تلاش شروع کی: اور خوش قسمتی سے اس کو ایک سستا سا بر بھی مل گیا۔ جو ڈھائی سو روپیہ کے ساتھ لاجونتی کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا البتہ اس کی عمر ضرور پچاس سال کی تھی اور اسی لئے وہ سستا بھی تھا۔ دکھی راجو اس رشتہ سے بہت خوش ہوا۔ اور جلدی جلدی روپیہ کا انتظام کرنے لگا خون و پسینہ کی گاڑھی کمائی کے سو روپیہ اس کے پاس جمع تھے اور سو روپیہ غلہ بیچ کر اس نے فراہم کر لئے۔ مگر اب بھی سو روپیہ کی ضرورت تھی۔ کیونکہ پچاس روپیہ صرف برادری کی دعوت ہی کے لئے ضروری تھے غریب راجو نے ہر ممکن کوشش کی کہ روپیہ مل جائے۔ غریب کو قرض بھی نہیں مل سکتا تھا۔ کیوں کہ مفلس کا اعتبار ہی کیا اس ناکامی میں اس کو ایک موہوم سی شعاع امید نظر آئی۔ اور وہ زمیندار صاحب کی فیاضی تھی ——

زمیندار انسان تھا لیکن گاؤں والوں کے لئے اوتار۔ وہ روپیہ دینے پر راضی ہو گیا یہ دوسری بات تھی کہ قاعدے کے مطابق راجو کی زمین اور بیل گروی رکھ لئے۔ مگر اس کے ساتھ ایک رحمدلی یہ بھی کی کہ راجو زمین جوت سکتا تھا۔ اور اگر سال بھر میں قرضہ ادا کر دے تو اسی طرح سے زمین کا مالک بنا رہ سکتا تھا۔ زمیندار صاحب نے ۱۲۵ روپیہ راجو کو دے جس میں ۲۵ روپیہ سود کے کاٹ لئے۔ راجو سو روپیہ دھوتی میں باندھے خوشی خوشی گھر آیا۔

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ راجو بے حد مسرور تھا۔ اتفاق سے زمیندار صاحب کے یہاں مہمان آنے والے تھے۔ زمیندار صاحب نے راجو سے کہا کہ وہ گاڑی لیکر اسٹیشن چلا جائے تاکہ معزز مہمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یوں تو بہت سے آدمی یہ کام کر سکتے تھے مگر زمیندار صاحب کا حکم تھا "راجو مجھے صرف تم پر بھروسہ ہے اور تم مہمانوں کو بہت آرام سے لاؤ گے" غریب راجو زمیندار صاحب کے اعتماد سے پھولے نہیں سماتا تھا وہ گاڑی لے کر جنار گدھ کے اسٹیشن کی طرف چلا گیا ——— مہمانوں کی آمد کی وجہ سے گھر میں بہت سے کام تھے اس لئے زمیندار صاحب نے لاجونتی کو بلا بھیجا کہ وہ آکر آٹا پیس دے۔ لاجونتی کے اوپر زمیندار صاحب نے احسان کیا تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس وقت ان کے کام نہ آئے۔ وہ زمیندار صاحب کے گھر دوڑی آئی۔ ٹھکرائن سو چکی تھیں۔ زمیندار صاحب نے خود اس کو گیہوں بتائے اور چکی اٹھا کر گیہوں کی کوٹھری میں رکھ دی۔

رات کے دو بجے تھے۔ لاجونتی اس وقت تک دس سیر گیہوں پیس چکی تھی۔ وہ پسینہ میں شرابور ہو رہی تھی سانس کی تیزی نے اس کے سینہ میں ایک خاص قسم کا تلاطم برپا کر رکھا تھا۔ کہ اتنے میں زمیندار صاحب داخل ہوئے

"ارے لاجو! تو تو بہت تھک گئی۔ بس اب رہنے دے۔ کل پیس دینا۔ جا مگر ذرا سویرے آ جانا"

لاجونتی زمیندار صاحب کی اس مہربانی سے بہت متاثر ہوئی اور پرنام کر کے جانے لگی۔ کہ پھر زمیندار صاحب نے کہا "لاجو اتنی رات گئے کہاں جاتی ہے۔ تجھے ڈر نہیں لگے گا؟ تو یہیں سو جا"

"نہیں مہاراج، میں چلی جاؤں گی"

"اری پگلی۔ اتنی رات گئے! نا۔ نا میں نہیں جانے دوں گا۔ زمانہ خراب ہے۔ راجو الگ نہیں ہے گاؤں کے نوجوان بدمعاش ہیں اگر کوئی آفت آگئی تو میں راجو کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ جا تو سامنے والی کوٹھری میں سو جا"

لاجونتی بھی اس خیال سے ذرا گھبرائی۔ مگر پھر کوٹھری میں داخل ہو گئی اور پیچھے پیچھے زمیندار صاحب، زمیندار صاحب

نے عجیب نگاہوں سے لاجونتی کو دیکھتے ہوئے کہا "ارے لاجو تیرا جس سے تیرا بیاہ ہو رہا ہے وہ تو بہت بڈھا ہے"

لاجونتی چپ رہی ــــــــــ

"تجھ جیسی سندر لڑکی اس بڈھے کے قابل نہیں۔ تو تو محلوں کے قابل ہے" زمیندار صاحب کی آواز میں رتنا شی تھی ــــــــــ

"سرکار! غریب کا غریب ہی سے نباہ ہو سکتا ہے" لاجونتی نے بڑی مشکل سے کہا

زمیندار کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ سانس تیز ہو گئی ــــ "لاجو! تجھ جیسی سندر لڑکی پر میں تن من دھن سب نچھاور کر سکتا ہوں ــــ"

لاجونتی کانپنے لگی۔ اس نے گھبرا کر کہا "سرکار تو ہمارے دوسرے مائی باپ ہیں۔

"لاجو" زمیندار صاحب نے کوٹھری کی زنجیر لگا دی۔

"سرکار" ــ لاجونتی کچھ نہ کہہ سکی ــــــــ

سولہ برس کی دھان پان لڑکی ایک مرد اور زمیندار کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی ــــــــــ

ــــــــ "لفنٹ لے پانچ بجانے ــــ اری روتی کیوں ہے؟ ــــ دیکھ کسی سے کچھ کہنا نہیں ــــ میں جلد ہی تجھ سے بیاہ کر لوں گا ــــ جو بات بیاہ کے بعد ہوتی تھی اب وہ ہو گئی۔ اس میں نقصان ہی کیا ہے ــــ" ڈیوڑھی سے جاتے وقت بنو نے چاندی کے پانچ سکے لاجونتی کے ہاتھ میں رکھ دئے اور چپکے سے کچھ کان میں کہا ــــ ایک دوشیزہ کی تباہی کا معاوضہ ــــ پانچ روپیہ!!

ــــــــــــــــ

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے ــــ لاجو کسی نہ کسی بہانہ سے زمیندار صاحب کے یہاں سر شام جاتی تھی اور رات گئے واپس آتی تھی۔ دو ہی چند اور شیخ جی نے اکثر زمیندار صاحب کے پیغام سلام لاجونتی تک پہونچائے تھے۔

"زمیندار صاحب پرسوں بیاہ ہے۔ آپ اپنا وچن کب پورا کریں گے۔؟"

زمیندار صاحب مسکرائے "پگلی بیاہ ہو جائے تو چلی جانا۔ میکے تو آتی ہی رہیگی۔ میں کہیں بھاگا تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ بیاہ تو سماج کے لئے ہے ہمارے لئے نہیں"

لاجونتی کانپنے لگی "اور یہ بالک! یہ جلد ہی سنسار میں آنے والا ہے۔ اس کا پتا کون ہوگا۔

"یہ تو جان۔ مجھے کیا معلوم"

"مگر اس بالک کے تو آپ ہی پتا ہیں۔"

"مجھ پر دوش لگاتی ہے۔ اس کا پتا میں ہوں۔ ہونہہ۔ بھگو سے پوچھ بھگوا سے۔ اس سے جس سے تو چھپ چھپ کر ملتی تھی" لاجونتی خاموش واپس آئی ــــــــ

اس کا آخری سہارا بھگو ہی تھا۔ اس نے اس سے سب کچھ کہہ دیا اور اس سے امداد چاہی ــــــ

گاؤں میں بھی انسان بستے ہیں ــــــــ صبح سویرے زمیندار صاحب باہر مردہ پائے گئے ــــ [illegible]

گاؤں کا گاؤں رنجیدہ تھا۔ زمیندار صاحب جیسے اوتار کو کسی پاپی نے قتل کر دیا تھا ———
دوسرے دن بھگوا نے پولیس کے سامنے آکر خود ہی اقبال جرم کر لیا ——— قاتل کو گرفتار کر لیا گیا ——— ایسے مہاپرش انسان کو قتل کرنیوالا یقیناً پاپی تھا ———
لاجونتی نے گاؤں والوں اور پولیس سے اپنی بپتا کہی۔ مگر اس غریب کی کون سنتا تھا ———
——— دوسرے دن لاجونتی کی لاش ایک کنوئیں سے برآمد ہوئی ——— غریب لاجو لاچہ ہو گیا
بھگوا کو عدالت نے ملزم قرار دیا ایسے پاپیوں کے لئے قانون نے پھانسی کی سزا تجویز کی ہے۔ لیکن بھگوا پر رحم کھا کر عدالت نے عمر قید کی سزا دی۔
البتہ گاؤں والے اب بھی کہتے ہیں کہ بھگوا اور لاجونتی پاپی تھے۔ زمیندار صاحب نے ان کو کسی دن دیکھ پایا تھا۔ وہ اس پاپ پر بہت خفا ہوئے تھے بھگوا نے اس ڈر سے کہ کہیں گاؤں والوں کو یہ قصہ معلوم نہ ہو جائے۔ ان کو قتل کیا۔ اور لاجونتی نے ان پر ایسا برا دوش لگایا ——— ایسے مہاپرش کو مارنے والا بڑا پاپی تھا ——— اور ایسے اوتار پر دوش لگانے والی پاپن ———"
لیکن دو ہی چند۔ شیخ جی۔ اور بھو جانتے تھے کہ ———

پاپی! ——— کون تھا؟

(بقیہ اضطراب عالم) میں چانس رکھا ہے گراٹلی کو ابھی تک کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اسکو کوئی زیادہ نقصان بھی نہیں ہوا ہے۔ مصر کی سرحد پر اگرچہ لڑائی ہو رہی ہے گر ابھی تک اس نے اعلان جنگ نہیں کیا ہے۔
یہ تو تھا یورپ کے پیچھے کا حال اب چلتے چلاتے اسٹیج پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جرمن ہوائی جہاز انگلستان پر حملہ کر رہے ہیں اور برطانی جہاز جرمن علاقوں اور ہالینڈ اور فرانس کے جرمن مقبوضات پر جوابی حملے کر رہے ہیں۔ بحر روم اور افریقہ کے شمالی علاقہ میں اٹلی اور برطانیہ میں چھوٹی موٹی ٹکریں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ حالت اب زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی۔ انگریزوں کو یقین ہے کہ ہٹلر انگلستان پر حملہ کر کے رہے گا۔ اس حملہ کی کیا صورت ہوگی اسکی بابت نہیں کہا جا سکتا۔ ہٹلر خفیہ ہتھیار کی دھمکی دیتا ہے اور انگریز سوچ سوچ کر کاٹ نکال رہے ہیں۔ بہر حال یہ یقین ہے کہ موجودہ سکون ایک آنیوالے طوفان کا پیش خیمہ ہوگا۔ یہ طوفان زالا اور آخری ہوگا اور اسی پر دنیا کے مستقبل کا دار و مدار ہے
جناب عشرت علی صاحب صدیقی

اضطرابِ عالم

لڑائی نے یورپ کے ساز کو برہم کردیا ہے ناچ گھروں کی میٹھی موسیقی قہوہ خانوں کے سُریلے نغمے۔ اور حسینانِ جہاں کے ناز و عشوے دنیا کے ایک خطے سے نابود ہوگئے ہیں اور ان کی جگہ فوجی بینڈ۔ توپوں کی گرج۔ طیاروں کی بھنبھناہٹ۔ بموں کے پھٹنے کی خوفناک آواز۔ مجروحوں کی کراہ اور بے خانماں شہریوں کی آہ و بکا کا دور دورہ ہے ہندوستان میں بھی گرانی اور غیر مستقل سیاسی صورت حال۔ مختلف جماعتوں کی کشمکش اور مستقبل کے متعلق خطرناک پیشینگوئیوں نے ہمیں تار حیات کو ایک مسلسل بیقراری بنا رکھا ہے۔ غرضکہ جدھر دیکھئے ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ پریشانی بے چینی۔ اضطراب۔ بعض سیاسی نجومی اسے دردِزہ سے تعبیر کرتے ہیں اور دیکھنا ہے کہ ان کٹھن گھڑیوں کے بعد بطنِ گیتی سے کیا چیز پیدا ہوتی ہے۔ دائمی امن یا بربریت اور دیوانگی۔

لڑائی پارسال ستمبر میں شروع ہوئی تھی۔ چند مہینے تو سازندوں کو ساز ملانے میں لگ گئے پھر طبلے پر تھاپ پڑی بربریت کی مردم خوار دیوی نے گھنگھرو بجائے اور آناً فاناً یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تھرکنے لگی جہاں جاتی لاکھوں انسانوں کی بھینٹ لیتی۔ اور ان کی برسوں کی کمائی کو نگل جاتی۔ چند مہینوں میں حکومتوں کا توازن بالکل بگڑ گیا۔ پہلے پولینڈ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اور پھر بات کہنے میں ناروے۔ ڈنمارک۔ ہالینڈ۔ بلجیم اور فرانس ختم ہوگئے۔ فسطائیت کے سیلاب نے جمہوریت کے قلعوں کو منہدم کردیا۔ جمہوری طاقتیں اپنے گردوپیش سے بے خبر خوابِ خرگوش میں پڑی تھیں۔ اور اس وقت چونکیں جبکہ یورپ کا بیشتر حصہ ان کے اثر سے نکل چکا تھا۔ روس نے پولانڈ سے بھرے جرمنی سے فینلینڈ کا حصہ بانٹ کرلیا۔ پھر اسٹونیا۔ لیٹویا اور لتھونیا میں عوامی حکومتیں قائم کرائیں اور اب خبر ہے کہ وہاں سوویٹ طرز کی حکومتیں بن رہی ہیں اس طرح اب یہ تینوں ملک عملاً روس میں ضم ہو جائیں گے۔ روس نے یہ پیش بندی اس لئے کی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے علاوہ دشمن جنگ کا رخ اسی کی طرف پھیر دیں اور فسطائیت اور سوشلزم کی لڑائی چھڑ جائے۔ یہ خطرہ کم ہوتا نہیں دکھائی دیتا تھا اور شرق میں روس کے صنعتی اور زراعتی علاقوں کے زد میں آجانے کا امکان تھا اس لئے اس نے رومانیہ پر دباؤ ڈالکر اپنا پرانا علاقہ بسربیا لے لیا۔ جرمنی نے ناروے پر قبضہ کرکے نہ صرف اپنے لئے تجارتی راستہ کا انتظام کرلیا بلکہ سویڈن کو بھی اپنے اثر میں لے لیا۔ بلقانی ریاستوں سے ہنگری تو پہلے ہی سے اس کے اثر میں تھا۔ اور اب جرمنی اس کی طرف سے رومانیہ پر ٹرانسلوانیا واپس کردینے کے لئے دباؤ ڈالکر رومانیہ کو بھی اپنے قابو میں کرلینا چاہتا ہے لیکن یہاں جرمنی اور روس کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں تاہم یقین ہے کہ جرمنی روس سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ جب رومانیہ میں نیم فسطائی حکومت برسراقتدار آئی اور اس نے جرمنی سے باہمی امداد کا معاہدہ کرنا چاہا تو جرمنی نے انکار کردیا۔ ترکی عجب کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ جرمنی۔ برطانیہ اور روس میں سے کسی کو خفا کرنا نہیں چاہتا۔ برطانیہ کو اس نے اپنی طرفداری کا یقین دلایا ہے۔ روس کو راضی رکھنے کے لئے یہ اعلان کردیا ہے کہ وہ اس کے خلاف کسی لڑائی میں شریک نہیں ہوگا اور جرمنی کو منہ بھرائی دینے کے لئے اس نے حال ہی میں اس کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کرلیا ہے۔

فرانس کی ہار کے وقت جرمنی کا پلہ بھاری دیکھکر اٹلی بھی لڑائی میں اس کا ساتھی بن گیا۔ اس کی تمنا ہے کہ بحرِ روم اطالوی سمندر بن جائے اور اس کے جنوب کے ممالک نیز نہر سویز اور اس کے گرد کے اسلامی ممالک اس کے اثر میں آجائیں۔ اٹلی کے داخلے نے فرانس کے لیے ایک بغلی گھونسہ کا کام کیا اور اس کا خاتمہ بہت جلد ہوگیا۔ برطانیہ کے لئے بھی ایک مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس لئے کہ ایسے موقع پر جب انگلستان پر جرمنی کے حملہ کا چرچا ہورہا ہے اٹلی نے اس کے بحری بیڑے کا کافی معقول حصہ بحرِ روم

عرفانِ تغزّل

حضرت خواجہ سید عزیز الحسن صاحب
مجذوبؔ دہلوی انسپکٹر مدارس۔ بنارس

بجز شوق یہاں جلوہ گہِ ناز میں ہے　　　طور پر بحث ابھی صورت و آواز میں ہے

کوئی محرم نہیں سب حال مرا راز میں ہے　　　ناشنیدہ ہے وہ نغمہ جو مرے ساز میں ہے

وہ مزہ ہے مرے نالوں میں کہ نغموں میں نہیں　　　کیفِ صد ساز مری خاطرِ ناساز میں ہے

حسنِ خفا اسے سمجھوں کہ کہوں حسنِ ادب　　　رازداں ہو کے بھی دل جستجوئے راز میں ہے

میں بنا خاک سے کیوں خاک میں ملنے کے لئے　　　میرا انجام بھی مضمر مرے آغاز میں ہے

ناحق الزام انا الحق کا ہے منصور کے سر　　　لب پہ مطرب کے جو نغمہ ہے وہی ساز میں ہے

پر شکستہ نہ سمجھ بلبلِ قدسی ہوں میں　　　پرِ جبریل مرے بازوئے پرواز میں ہے

یوں تو اس پیکرِ ہستی میں مرے کچھ بھی نہیں　　　کوئی مطرب ہو تو ہر نغمہ مرے ساز میں ہے

لاکھ اٹھا اب کہیں اٹھتا ہے یہ مجذوب کا سر
سجدہ مچلا ہے ترے در پہ جبیں ناز میں ہے

بھوک

محترمہ شفیق بانو صاحبہ

"ہاں تو تمھیں نوکری کی ضرورت ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہاں روزانہ بہت سی عورتیں آتی رہتی ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی پسند نہیں آئی۔"

"بیگم صاحب آپ سمجھ سکتی ہیں کہ ایک ضرورت مند زیادہ محنت سے آپ کے حکم پر چلے گا۔ بیگم صاحب بہت مصیبت زدہ ہوں۔ بدقسمت ہوں۔ غربت کے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلانے کی سکت نہیں رہی۔ اچھے گھر کی بیٹی نہیں اچھے گھر بیاہی گئی۔ لیکن اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ شادی کے سترہ برس بعد یہ بچہ ہوا تھا اور وہ اسے تین روز کا چھوڑ کر چل بسے۔ گھر کا اثاثہ تو زندگی ہی میں ختم ہو چکا تھا اب حضور کا نام سن کر چلی آئی۔"

"اچھا تو پھر جب تم گدڑی بہنے والی ہو تو ہمارے ہاں کام کیونکر کر سکو گی۔ یہاں پردہ وردہ کچھ نہ ہوگا۔ سب نوکروں کے سامنے آنا ہوگا اور وقتاً فوقتاً میں کچھ کہوں تو ان سے کام بھی لینا پڑیگا۔ میں اپنے بے بی کو دودھ پلانا چاہتی ہوں۔ دس روپیہ اور کھانا ملے گا۔ عید بقرعید تمھیں اور تمھارے بچہ کو کپڑے بھی ــــ لیکن یہ شرط ہے کہ تمھارا بچہ الگ رہے گا۔ اسے ماں کا بھر دودھ روزانہ اور کبھی کچھ پھل وغیرہ دیا کریں گے۔ اس کی تمھیں سختی سے پابندی کرنی ہوگی کہ تمھارا بچہ تمھارا دودھ نہ پی سکے۔ ڈاکٹری اصول سے تمھیں صفائی سے رہنا اور وقت پر دودھ پلانا ہوگا۔ تم بہت دبلی اور زرد دکھائی دیتی ہو کیا بات ہے؟ میں ذرا اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کرکے بلاتی ہوں وہ تمھیں دیکھکر اطمینان کرلے۔"

ڈاکٹر آیا معائنہ کیا اور یہ کہا کہ اناکے دودھ میں اور خون میں کوئی خرابی نہیں سب ٹھیک ہے فاقوں سے خون کم ہو گیا ہے۔

یہاں مقابلہ تھا "بھوک" اور "ممتا" کا۔ تقابل تھا محبت اور مفلسی کا۔ نوکری کبھی نہ کی تھی گھر سے کبھی نکلی بھی نہ تھی لیکن آج وہ تمام باتیں معمولی سمجھکر ملازمت کی کوشش کر رہی تھی ایسا نہ ہو بیگم صاحب انکار کردیں۔ غریبی کے بھیانک تخیل نے اسے مجبور کردیا محبت پر مفلسی غالب آئی مجبوریاں محبت پر بادل بنکر چھا گئیں تھوڑی دیر تک سوچتی رہی اور پھر بول اٹھی۔

"بیگم صاحب مجھے آپ کی ساری پابندیاں منظور ہیں"

"لیکن تمھیں باقاعدہ تین سال کا اگریمنٹ کرنا ہوگا۔ یہ رہا کاغذ اس پر دستخط کردو ــــ تمھارے حقوق ہمیشہ سمجھے جائینگے اور تمھیں ہماری ملازمت میں بہت آرام ملے گا۔"

دستخط کرنے والی کا ایک دفعہ ہاتھ کانپا اور خدا جانے کن کن خیالات کو سامنے لاکر وعدہ کرہی لیا اور دستخط کردیے۔

بیگم نے ایک مرتبہ مشکور نگاہوں سے دیکھا اور دوسری ملازمہ کی طرف دیکھکر کہا۔ "دیکھو حسن انھیں جو کمرہ دکھا دو اور سارا سامان قرینہ سے لگا دو۔ سب باتیں ٹھیک سے سمجھا دو۔ ان کے بچہ کو نانو کے سپرد کردو اور تاکید کردو کہ ایسے آرام سے رکھے مانوس کرکے ماں کو بھلا دے۔ اس کے لیے بے بی کا پرانا اونی کلاہ اور پھٹی ہوئی چادر دیدو۔"

"بہت اچھا سرکار!" کہکر ملازمہ الٹے پاؤں کمرے سے چلی گئی اور آنکھ جھپکتے تمام احکامات پورے ہو گئے۔

نئی ملازمہ کو انّا کا رتبہ مل گیا۔ جب اسے کوئی آواز دیتا "انّا! او انّا!" تو اُس کے دل کو دھکا سا لگتا۔ کئی دفعہ سوچا کہ وہ مالکہ سے کہے کہ سب کو حکم دیجیے کہ وہ میرا نام لیکر پکاریں لیکن پھر چپکی ہو گئی کہ ٹھیک تو کہتے ہیں دودھ پلانے والی کو سب ہی انّا کہتے ہیں۔ وہ کوٹھی کے ایک نہایت شاندار کمرے میں بچہ کو لیکر رہنے لگی۔ گھڑی کا ہر تیسرا گھنٹہ اُسے چونکا دیتا اور وہ اپنے فرض کو پورا کرتی۔ جس وقت دودھ پلاتی تو دوسری چھاتی سے دودھ ٹپ ٹپ گرتا رہتا۔ اُس کا دل بُری طرح مسلتا۔ بچہ کی ماتا۔ اُسے یہی خیال لگا رہتا۔ خدا معلوم میرا بچہ۔ میرا معصوم لال سو رہا ہے یا رو رہا ہے جانے دودھ بھی دیا ہو گا یا نہیں۔ رات کو گیلے میں سویا ہو گا یا سوکھے میں —— اگر گھر میں وہ اتنا بھی چھوڑ کر مرتے کہ میں روکھی سوکھی کھا کر بچّہ کو پال سکتی تو پھر میں یہ نوکری کیوں کرتی۔ آہ میرے بچے —— تو یوں مصیبت میں پل رہا ہے۔ سترہ برس تیرے لیے دعائیں مانگیں تھیں۔ کیا اس بُرے دن کے لیے؟ میں آرام سے ہوں۔ لیکن یہ بستر مجھے کانٹوں سے کم نہیں۔ مجھ سے بہتر تو پنجاب کی وہ گوجری عورتیں ہیں جو بچہ کو تنخواہ مقرر کر کے دو سال تین سال کے لیے گھروں پر لیجاتی ہیں اس طرح انکی ماتا بھی ٹھنڈی رہتی ہے اور اپنے بچہ کو بھی دیکھتی رہتی ہیں۔ یہاں تو اتنا بھی حکم نہیں کہ میں سامنے بھی جاؤں یا ذرا سی دیر کو اپنے لال کو کھلا لوں —— یہ سب باتیں تو پہلے ہی دن کہہ دی گئی تھیں میری غرض تھی ہر بات پر سر جھکا دیا۔

یہ باتیں انّا سوچتی اور اپنا سر دُھنتی۔ وہ اس عہد کو توڑ نہ سکتی تھی اور توڑ دیتی تو کہاں جاتی؟ اور پھر کیا اور کہاں سے کھاتی؟ روٹی کے ٹکڑوں نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ بدستور نہایت ہوشیاری سے احکام کی پابندی کرتی اور وقت سے دودھ پلاتی رہی۔ چونکہ وہ گھر کی رہنے والی مصیبت زدہ تھی اس لیے اُس کے دل میں فرض کا احساس زیادہ تھا۔ ظاہر غائب بچہ کو بہت اچھی طرح رکھتی دل کا حال تو خیر خدا کو معلوم تھا۔

جب تک اس کا بچہ چھوٹا رہا تب تک تو خیر لیکن جب ذرا بڑا ہو گیا۔ تو لوگوں کے کوارٹر سے لڑھکتا ہوا تمام میں پھرنے لگا اور کبھی کبھی ماں کی طرف بھی جا نکلتا۔ ماں فوراً ہی بھگا دیتی "میرے لال میاں سے چلا جا۔ —— بیگم صاحب دیکھ لینگی تو خفا ہونگی —— کوٹھری میں بند کر دیں گی"۔

بچہ بیگم صاحب کو ہوّا سمجھنے لگا۔ وہ بیگم کا نام سن کر خوفزدہ ہو جاتا اور نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چلا جاتا جہاں اس کی بھی کوٹھری تھی اور وہ نانو کے ساتھ رہتا تھا۔ نانو اگر اپنے جون میں ہوئی تو خیر ورنہ اُسے بری طرح جھڑکیاں دیتی اگر وہ روتا تو خوب چانٹے لگا کر خاموش کر دیتی۔ نانو کو محبت تو تھی نہیں سرکاری حکم سے اُسے پال رہی تھی۔ پھر بھی غنیمت تھا کہ اسے پیٹ بھر کھانے کو وقت سے دیدیتی اور رات کو روتے ہوئے کو چپ کرا دیتی۔ کبھی پانی دیدیتی کبھی روٹی کا ٹکڑا پکڑا دیتی۔

بیگم صاحب انّا پر بہت مہربان تھیں اور کیوں نہ ہوتیں وہ غریب ان کے اشاروں پر اپنی ماتا کو قربان کر رہی تھی بیگم اپنے بچہ کو تندرست پلتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتیں اور انّا بیچاری یہ سوچ کر کہ یہ دودھ میرے لال کا حق تھا کڑھتی اور سانس گھونٹ کر رہ جاتی۔ ایک دن اس کا بچہ اِدھر اُدھر دیکھتا چپکے سے ماں کے پاس چلا آیا۔ ماں بے بی کو صبح کے وقت نئے کپڑے پہنا رہی تھی اُس کے معصوم بچّے نے تتلا کر پوچھا "اماں یہ للا (کرتا) پھول پھول —— آپکا —— یہ پاجامہ چھاپ چھاپ (صاف صاف) اماں میں بھی لوں —— پھر اپنا میلا کرتا ہاتھ میں لیا اور ماں کو دکھا کر بولا۔ "اماں میلا للا (کرتا) چھی چھی —— میلا میلا —— اُوں ہوں میں بھی"

ماں نے مصلحت وقت کو سوچکر بچہ کو بہلا کر کہا "اب تم جاؤ بیگم صاحب بے بی کو دیکھنے بس آتی ہی ہونگی بس جاؤ بھاگ جاؤ"!

بچہ مستور کھڑا رہا اور غصہ سے منہ پھلائے شیشے کی الماری میں اپنا عکس دیکھتا رہا —— کبھی للچائی ہوئی نظروں سے

بسکٹ کے ڈبوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ "اماں وہ...... وہ بہت اچھے سارے، میٹھے میٹھے۔ بکٹ (بسکٹ) ہے"
ماں نے جلدی سے ایک بسکٹ دے دیا اور کہا "میرے بچے جا — جلدی سے بھاگ جا اسے کونے میں چھپا کے کہیں جاکر کھالے اور پانی پی کر کھیل — بیگم صاحب آتی ہونگی خفا ہوں گی۔"
بچہ بسکٹ پاکر خوش ہوگیا۔ بیگم صاحب کا نام سنتے ہی چپ ہوگیا اور بھاگتا ہوا ایک دم کوٹھے پر چڑھ گیا اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کوٹھے پر کوئی نہیں، تنہا وہاں چھپ کر یہ بسکٹ کھالوں — سامنے اڑتی ہوئی چڑیاں دیکھنے میں ایسا مشغول ہوا کہ ہاتھ سے چھجے پر بسکٹ چھوٹ گیا اور ساتھ ہی وہ معصوم بھی بسکٹ اٹھانے کو آگے بڑھا۔ لکڑی کا خوشنما جال بہت نیچا لگا تھا وہ جیسے ہی جھکا کر ہاتھ بڑھا کر بسکٹ اٹھانے لگا کہ ایک دھماکے کے ساتھ ٹہا خ سے لڑھکتا ہوا نچلی منزل کے پختہ زمین پر آرہا گرتے ہی سر پھٹ گیا۔ سب آواز کے ساتھ دوڑے ایک شور مچ گیا معصوم کے منھ سے خون بہہ رہا تھا۔ ہر ہر عضو کانپ رہا تھا۔ دماغ کرچی کرچی ہوگیا تھا — ماں نے چیخ مار کر بچے کو اٹھالیا اور اس کے خون بھرے منھ پر اپنا منھ رکھ دیا۔ ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ "میرے لال! میری سترہ برس کی آرزو اجڑ گئی"!!
بچہ کا سر ماں کی گود میں تھا۔ اور ماں کے لب بچہ کے ننھے خون آلود منھ پر ساکت تھے۔ ماں کی آنکھیں کھلی تھیں کبھی ٹکٹکی باندھ کر بچہ کو دیکھنے لگتی تھی کبھی ایک چیخ کے ساتھ سر دیوار سے ٹکراتی تھی۔ سب کھڑے اس دل ہلا دینے والے منظر کو دیکھ رہے ہیں لیکن کسی نے "آہ" "واہ" کا لفظ بھی نہ کہا۔ ہاں نوکر چاکر کبھی نظر بچا کر بیگم کی طرف دیکھ لیتے تھے۔
حسرت نصیب نامراد ماں کی گود میں خاک آلود بچہ دم توڑ رہا تھا!! ماں کے آنسو معصوم بچہ کی پیشانی پر گر گر کر خون میں مل کر بہہ رہے تھے!! بچہ کے ایک ہاتھ میں وہ بسکٹ تھا۔ جس کے اٹھانے کی کوشش میں خود گرا اور جان ہی گئی معصوم کی مٹھی میں بسکٹ کا ٹکڑا بھوک کی گواہی دے رہا تھا!!
بے بی آنا سے بہت مانوس تھا۔ انا کو روتا دیکھ کر اس سے چمٹ گیا اور خود بھی رونے لگا۔ انا نے ایک ہاتھ سے بے بی کو کلیجہ سے چمٹا لیا اس کا دوسرا ہاتھ اپنے بچہ کی پیشانی پر تھا۔
بیگم نے اپنے بچہ کو روتا دیکھ کر اسے انا سے الگ کرلیا اور پائیں باغ کی طرف چلی گئیں۔ اور اب نوکروں نے انا کو دلاسا دینا شروع کیا...... دکھی ماں اور زور سے رونے لگی......
دو چار دن بعد بیگم نے انا کو الگ کردیا کیونکہ اس کا دودھ خشک ہوچکا تھا......
جس بھوک کو بچانے کے لئے اس نے اپنی سترہ برس کی دعاؤں کو قربان کیا تھا۔ آج پھر وہی بھوک اسے ستا رہی ہے۔

انعامی سوال

جولائی کے پرچہ میں جو انعامی سوال تھا اس کے اکثر صحیح جواب وصول ہوئے جن حضرات نے صحیح جواب بھیجے تھے انکے نام ایک جلد "آغاز خیال" کی روانہ کردی گئی
[illegible] "

زندگی

حضرت نشتر سندیلوی

نگاہِ شوق کی تسکین ہی کبھی نہ ہوئی — کوئی عذاب ہوئی آہ! زندگی نہ ہوئی

جو دل پہ ایک نظر ہو کے پھر کبھی نہ ہوئی — ترس رہا ہوں کہ تجدیدِ زندگی نہ ہوئی

رہِ نیاز میں مٹنے کا اپنے غم کیسا — خوشی یہ ہے کہ تری ای فلک خوشی نہ ہوئی

جو دل کے جام کو لبریزِ بیخودی کر دے — مرے نصیب! اِدھر وہ نگاہ ہی نہ ہوئی

ہم اونکی جلوہ گہِ ناز میں تھے اک تصویر — نگاہ اوٹھ نہ سکی بات ہی کبھی نہ ہوئی

دلِ حزیں! تجھے اب کیا کریں، کہاں لیجائیں — چمن کو دیکھ کے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی

یہ کس نگاہ سے دیکھا تھا حُسنِ ظالم نے — کہ دل ٹھہر تو گیا، درد میں کمی نہ ہوئی

وہ اک خوشی، کہ جسے دل خوشی سمجھتا ہو — تمام عمر کبھی دل کو وہ خوشی نہ ہوئی

مَفر ہوئی نہ غمِ زندگی سے اے نشتر
بسر یہ زیست! باندازِ زندگی نہ ہوئی

انتقام

(اضطراب کے لیے مخصوص)

جناب حاتم طائی صاحب

کردار

پریم لتا ———— ایک سترہ سالہ طالبہ
کشور ———— پریم لتا کا ہم جماعت طالب علم عمر ۲۰ سال
شانتی ———— پریم لتا کی ماں عمر ۴۰ سال
کنور ———— پریم لتا کی سہیلی

پہلا منظر

ایک انگریزی طرز پر آراستہ کمرہ میں پریم لتا اور اس کی ماں چائے پی رہی ہے۔

شانتی۔ کل شام کو کہاں گئیں تھیں ...... پریا؟
پریم لتا۔ کشور کے یہاں۔
شانتی۔ کون کشور؟ (یہ پوچھتے ہوئے وہ گھبرا کر جھرجھری سی لیتی ہے لیکن پریم لتا کو اس کا احساس نہیں ہوتا)
پریم لتا۔ وہی سیر اکلاس فیلو ..... کنور کا دوست۔ وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملتا ہے آہا! کل اس نے دعوت کی تھی۔
شانتی۔ وہی جسکے گھونگھریالے بال ہیں؟
پریم لتا۔ ہاں۔
شانتی۔ جو لمبا تھا؟
پریم لتا۔ ہاں
شانتی۔ نیلی آنکھیں؟
پریم لتا۔ ہاں ہاں وہی۔

شانتی چیخ مار کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور حلق میں اٹکتی ہوئی آواز میں کشور۔ کشور کہکر گر پڑتی ہے۔ پریم لتا گھبرا کر نوکر کو آواز دیتی ہے۔

نوکر۔ حاضر سرکار!
پریم لتا۔ ڈاکٹر کو لاؤ۔ ڈاکٹر کو ..... جلدی جاؤ۔

کشور۔ کیا ہے پریم لتا؟

پریم لتا۔ جلدی دیکھئے ماتا کو کیا ہوا جا رہا ہے۔

کشور۔ (نبض دیکھکر) کچھ نہیں کوئی پریشانی کی بات نہیں کسی صدمہ سے بیہوش ہوگئی ہیں۔۔۔ تھوڑا ٹھنڈا پانی منگوا دیئے۔

پریم لتا دوڑ کر پانی لاتی ہے۔ کشور شانتی کے منھ پر چھینٹے دیتا ہے۔

شانتی۔ (ہوش میں آنے کے بعد کشور کو دیکھکر) کون۔ میرے پاس کون ہے۔۔۔ میں کہاں ہوں میں خواب دیکھ رہی ہوں؟

پریم لتا۔ آپ اپنے کرہ میں ہیں ماتا۔ آپ کے پاس کشور بیٹھے ہیں۔

شانتی۔ (آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے) کشور۔۔۔۔ کشور کیسے آئے۔

پریم لتا۔ آپ بیہوش ہوگئی تھیں۔۔۔ اگر یہ نہ آتے تو نہ معلوم میری بھی گھبراہٹ میں کیا حال ہوا ہوتا۔ ایشور نے انھیں بھیجا۔ پانی کے چھینٹے دیکر آپ کو ہوش میں لائے ہیں۔۔۔ (دروازہ پر کان لگاکر) وہ لیجئے ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔

ڈاکٹر۔ (اندر آکر) کیا بات ہے میڈم خیریت تو ہے؟

پریم لتا۔ ایشور کی دیا سے اب تو سب خیریت ہے (کشور کی طرف اشارہ کرکے) ان کی وجہ سے۔۔۔۔۔ ابھی پندرہ منٹ پہلے ماتا جی چائے پیتے پیتے ایک دم سے بیہوش ہوگئیں۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی۔ مگر مسٹر کشور نے وقت پر خوب مدد کی۔

ڈاکٹر۔ خیر اب تو ہوش میں ہیں؟

شانتی۔ میں اچھی ہوں ڈاکٹر صاحب۔ پریما بچہ ہے گھبرا گئی ہیں تو کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ بس گرمی کا اثر تھا۔

ڈاکٹر۔ (نبض دیکھکر) بالکل ٹھیک۔۔۔۔۔ اور کوئی وجہ نہیں (میز پر چائے کی پیالیاں دیکھکر) غالباً آپ چائے پی رہی تھیں مگر اچھا یہ ہے کہ آج کل چائے کم کر دیجئے اور۔۔۔۔ اور کچھ پھلوں کا استعمال بھی کیجئے (سوچ کر)۔۔۔ کسی دوا کی ضرورت نہیں۔

شانتی۔ آج ہی سے آپ کی ہدایت پر عمل ہوگا۔۔۔ معاف کیجئے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔۔۔۔ بیٹی پریما! آپ کی فیس ادا کرو مطلب کا حرج ہوتا ہوگا۔

پریم لتا فیس ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر سلام کرکے باہر جاتا ہے وہ بھی اپنی ان کا حال پوچھنے کے لئے ساتھ چلی جاتی ہے۔

شانتی۔ (بیٹھتے ہوئے) ظالم کشور!

کشور۔ خاموش! خاموش۔ پریما آتی ہوگی!

شانتی۔ (تیز آواز میں) تم جانتے ہو میں بیہوش کیوں ہوگئی تھی۔

کشور۔ میں کیا جانوں۔

شانتی۔ تمھارا خوفناک نام سن کر۔۔۔ یہ معلوم کرکے کہ پریما تمھارے یہاں جاتی ہے۔۔۔ دعوتیں کھانے اور۔۔۔ دل کی بہلانے

کشور۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

شانتی۔ پریما نے۔

کشور۔ پریم نے؟

شانتی۔ ہاں۔

کشور۔ اچھا پھر تمھارا مطلب؟

شانتی۔ کیا تم مطلب نہیں جانتے؟

کشور۔ میں نہیں جانتا۔

شانتی۔ (کشور کے پیر پکڑ کر) ایشور کے لیے پریم لتا کے لیے میری بیٹی پر رحم کرو۔۔۔ تم اسے بھی برباد کرنا چاہتے ہو میری طرح۔۔۔ شرم شرم: وہ تمھاری اولاد ہے جائز یا ناجائز۔

کشور۔ (بگڑ کر) غلط۔ جھوٹ۔۔۔ بالکل جھوٹ۔۔۔ اگر وہ ہو سکتی ہے تو کسی کی اولاد۔۔۔ کیونکہ تمھارا اصلی شوہر تو شاید تمھارا منھ بھی نہیں دیکھ سکا کہ تم نے اس کو زہر۔۔۔۔۔

شانتی۔ (چیخ کر) آہ۔۔۔ آہ چپ رہو۔۔۔ ظالم۔۔۔ میری روح ان باتوں کے سننے سے کانپ اٹھتی ہے (آسمان کی طرف دیکھ کر) ہے ایشور۔ جگ کرتار۔ مجھے معاف کر۔ مجھے بچا۔۔۔

کشور۔ (طنز یہ ہنسی ہنس کر) ایشور معاف کریگا۔ تمھاری جیسی ظالم عورت کو۔ ضرور معاف کریگا۔

شانتی۔ (بیقراری سے کشور کا منھ دبا کر) چپ رہو۔۔۔ بس چپ رہو اب کچھ نہ کہو۔۔۔ میری جان نکلی جاتی ہے، میری رگوں سے دم کھنچ رہا ہے (گڑگڑا کر)۔۔۔ رحم کرو۔

کشور۔ ہاں میں چپ رہ سکتا ہوں جب تم بھی میرے اور پریم لتا کے درمیان دخل نہ دو۔۔۔ ورنہ تمھارے کرتوتوں (خطوط) کا بھانڈا پھوڑ دیا جائیگا۔

شانتی کانپنے لگتی ہے۔ پریم لتا کے آنے کی آہٹ معلوم ہوتی ہے۔

کشور۔ (باتوں کا رخ بدل کر) ہاں۔۔۔ سچ کہوں۔ میں پریم لتا کو چاہتا ہوں۔

شانتی۔ (حقارت سے دیکھتے ہوئے) تمھاری چاہت۔۔۔

کشور۔ (بات کاٹ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے) اور آپ جانتی ہیں کہ نہ میرے ماں باپ ہیں نہ بہن بھائی۔ بدانتظامی کی وجہ سے گھر برباد ہو رہا ہے اور جائداد تباہ۔۔۔ اس لیے شادی کی جلدی کرتا ہوں ویسے جو آپکی مرضی —

پریم لتا دروازہ کی آڑ میں کھڑی ہو کر یہ باتیں سننے لگتی ہے۔

شانتی۔ (کشور کی لال لال آنکھوں سے خوفزدہ ہو کر) تو مجھے کب انکار ہے۔

کشور۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ کی پریم لتا مجھ سے کتنا خوش ہوتی ہے۔۔۔ (گھڑی دیکھکر) اچھا اب مجھے کافی دیر ہوگئی پھر حاضر ہونگا۔ کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہ اتنے میں پریم لتا اندر داخل ہوتی ہے۔

کشور۔ (مسکرا کر) میڈم پریم لتا!۔۔۔۔ کہاں چلی گئی تھیں؟

پریم لتا۔ (نیچی نظریں کئے ہوئے) ماتا جی کی حالت پوچھتی ہوئی ذرا ڈاکٹر صاحب کے موٹر تک۔۔۔۔ تو کیا اب آپ جا رہے ہیں

کشور۔ ہاں۔۔۔ میں تو پانچ منٹ کے لیے آپ سے ایک کتاب مانگنے آیا تھا وہی لو لیرکس (LOVELIRCS) مگر یہاں بہت دیر ہوگئی (مسکرا کر) پھر ملیں گے کالج میں۔

پریم لتا کشور کو کتاب لا کر دیتی ہے وہ چلا جاتا ہے

اور۔۔۔ گرتا ہے

دوسرا منظر

کشور اپنی کوٹھی کے ایک کرہ میں ارمونیم پر گا رہا ہے۔ ابر گھر گھر کر آسمان پر ایک نئی تصویر بنا رہا ہے ہیں کرہ کی کھڑکی سے باہر کا منظر بہت دلکش ہے

گانا

بات کی اب سکت نہیں عاشق جاں نثار میں — چشم براہ ہے مگر آپ کے انتظار میں
حسن کے ساتھ ناز بھی جور بھی ہو جفا بھی ہے — ایک نہیں تو بس وفا ہائے ستم شعار میں
جام و شراب و چاندنی اور کنار آب جو — آپ نہیں تو کچھ نہیں موسم صد بہار میں!

پریم لتا داخل ہوتی ہے مگر کشور کو گاتا دیکھکر چپکے سے اس کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کشور بے خبر گا رہا ہے۔

جام و شراب و چاندنی اور کنار آب جو — آپ نہیں تو کچھ نہیں موسم لالہ زار میں!
عشق تمام کر گیا قصہ عاشق حزیں — آنکھ مگر کھلی رہی آپ کے انتظار میں!

پریم لتا کشور کی محویت پر ہنس دیتی ہے۔

کشور: (مڑکر) خوب.... تم یہیں موجود ہو اور میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔

پریم لتا: اور میں بھی......

کشور: تو یوں کہو (مسکراکر) دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی۔

پریم لتا: اچھا یوں ہی سہی (شرماکر سر جھکا لیتی ہے)

کشور: اچھا پریم! سچ کہو آج موسم کتنا پیارا ہے (کھڑکی کی طرف) اودی اودی گھٹایں منڈلا رہی ہیں۔ مہین مہین پھوار پڑ رہی ہے.... ٹھنڈی ہوا لوریاں دے رہی ہے ایسے میں اگر جھولا نہ گاؤ تو کتنا ظلم ہے۔

پریم لتا: (مسکراکر) تم ہی گاؤ نا۔

کشور: (منہ بناکر) مجھے تو رونا آتا ہے۔ رو چکا... دردمندوں کو گانے سے کیا مطلب۔

پریم لتا: اور میں بڑی سکھی ہوں دکھ سو چکی مگر خیر... تمہاری خوشی کے لئے گاؤں گی۔

گانے لگتی ہے

بادل گرجے بجلی چمکے --- جیرا دھڑ دھڑ ہوئے
داکوئی کی کر کر کے --- جگرا مورا روئے

کشور کرسی کے پیچھے پر بیٹھ جاتا ہے اور مسکراتا جاتا ہے۔

بھولی بھالی جانت کا تھیوں --- الفت ظالم ہوئے

کشور آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اس کی گردن کے گرد ڈال لیتا ہے۔

ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھنے جانے نیا

نیناں جلوہ واکا ڈھونڈیں --- کیسے جوے کوئے

کشور۔ (ایک دم سے رک کر) بس رہنے بھی دو اس گانے کو۔۔۔ اور طبیعت پریشان ہو گئی۔
پریم لتا۔ (ہنس کر) آپ کی خوشی کے لیے گایا تو پریشانی ہوئی اب پریشانی کے لیے گاؤں گی تو نہ معلوم کیا ہو۔
کشور۔ (سنجیدگی سے) کچھ نہ ہو۔۔۔ خوشی ہو۔۔۔ لطف آئے۔۔۔ (انداز سے دیکھ کر) اگر۔۔۔
پریم لتا۔ اگر؟
کشور۔ گاہے گاہے ہو تو مل کر تھوڑی سی پی لی جائے۔
پریم لتا۔ کیا چیز؟
کشور۔ (مسکرا کر) رنگین۔
پریم لتا۔ (تعجب سے) یعنی
کشور۔ شربت۔۔۔ جو میرے پاس ہے (ذرا آنکھیں مٹکاتے ہوئے) اس الماری میں۔
پریم لتا۔ میں کچھ اور سمجھی۔

دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیتے ہیں۔
کشور الماری کھول کر ایک بوتل سے دو گلاس بھرتا ہے۔

کشور۔ (ایک گھونٹ پی کر دوسرا گلاس پریم لتا کو دیتے ہوئے) پریم لتا! "لطف بہار کیا۔ با جام و سبو نہ ہو اگر"
(پریم لتا کے پی لینے کے بعد) "جان بہار زندگی موت ہے تو نہ ہو اگر"
آؤ پریم! آؤ ہم تم مل کر گائیں۔۔۔ پریت کی آج تو ریت منائیں

دونوں گاتے ہیں

پھولوں میں ہم جھولا جھولیں۔ حسن نگری میں چھپنے کھیلیں۔ پچھلے سب دکھ بھول ہی جائیں۔ عید منائیں عید منائیں۔
آؤ ہم تم مل کر گائیں۔۔۔ پریت کی آج تو ریت منائیں

پریم لتا۔ (رک کر) کتنا اچھا شربت ہے۔۔۔ جی چاہتا ہے اور پیوں۔
کشور۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ابھی لاتا ہوں۔

تھرمس سے برف ڈال کر پھر دیتا ہے۔

پریم لتا۔ (پی کر) پیارے کشور۔۔۔ تم نے تو آب حیات پلا دیا معلوم ہوتا ہے کہ اڑی جا رہی ہوں۔
کشور۔ مگر پریا مجھے تمہاری یہ تعریف اچھی نہیں لگتی۔
پریم لتا۔ (کشور کے گلے میں ہاتھ ڈال کر) یہ کیوں؟
کشور۔ اس لیے کہ تم اس سے بھی زیادہ لطیف ہو۔ (ادا سے آنکھیں چلا کر)۔۔۔ مور اگر کسی کی تعریف کرے تو کیا بھلی معلوم ہوگی؟
پریم لتا۔ (کشور کو چڑھانے کے لیے) کتنا پیارا رنگ ہے اس کا!
کشور۔ یہ اس کا رنگ نہیں گلاس میں تمہارے گلگوں رخساروں کا عکس پڑ رہا ہے
پریم لتا۔ کیسا مزیدار ہے۔
کشور۔ تمہاری باتوں کا اثر پڑ گیا ہے۔
پریم لتا۔ کیسا نشہ ہے!

کشور۔ تمھارے لب بلبلیں سے چھو گیا ہے نا!
پریم لتا۔ (کشور کے سینہ پر اپنا سر رکھتے ہوئے دکھانے کو بگڑ کر) تم (میری ہی ثنا خوانی کر رہے ہو۔
کشور۔ پھر کس کی کروں؟
پریم لتا۔ (چپ کرا اپنی۔۔۔ اپنی بھونرا جیسی آنکھوں کی۔۔ گھونگھر والے بالوں کی۔۔۔ چاند جیسے مکھڑے کی۔۔۔ اور
کشور۔ (پریم لتا کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے) اور اس چکدار پیشانی کی۔

پریم لتا اپنے جسم میں ایک پر لطف سنسناہٹ سی محسوس کرتی ہے۔ مگر پھر سنبھل جاتی ہے۔

پریم لتا۔ (بگڑ کر) آئیں یہ کیا کرتے ہو۔
کشور۔ کچھ نہیں پیاری۔۔۔ سچی اور بے لاگ محبت کی مہر۔
پریم لتا۔ (غصہ سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں) تمھیں۔۔۔ اسکا۔۔ حق کیا ہے۔۔۔ ہٹو الگ۔
کشور۔ حق!۔۔۔ پیاری پریا۔۔ تمھیں نہیں معلوم کہ محبت کی نظر میں ہمیشہ کے لیے تم میری ہو۔۔۔ اور رواجوں کی نظر میں بھی ہونے والی ہو۔۔۔ بہت جلد۔۔۔ شاید آیندہ ہفتہ میں۔

پھر پیار کرتا ہے اور پریم لتا کے رگ و پے میں بجلی دوڑ جاتی اور نیند سی آنے لگتی ہے۔

پریم لتا (رک رک کر) بیشک۔۔ بیشک پیارے اب ہم اور۔۔۔ تم۔۔۔

کشور پریم لتا کے رخساروں کا بوسہ لیتا ہے۔
(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

کشور کے مکان کا کمرہ۔ ایک بڑھیا، وہاں پر بیٹھی ہے پریم لتا آتی ہے۔

پریم لتا۔ کشور کہاں ہے؟
عورت۔ ابھی ابھی اپنی چچی کے یہاں گئی ہیں۔۔۔ بیٹھیے آتی ہونگی۔
پریم لتا۔ کتنی دیر میں آئیں گی تم بلا لاؤ بوا۔۔۔ کہنا پریم تم سے ملنے آئی ہے بہت ضروری کام ہے۔

بڑھیا چلی جاتی ہے۔ پریم لتا بڑبڑانے لگتی ہے اسکا چہرہ اترا ہوا اور رنگ زرد

مظالم کشور۔۔۔ تو نے مجھے شربت میں شراب پلائی۔۔۔ اس طرح پہلے میری عقل پر ڈاکہ مارا پھر عزت پر۔۔۔ اب شادی سے بھی انکار کرتا ہے مجھے حقیر و ذلیل جان کر۔۔۔ بدکار اور بازاری عورت سمجھکر۔۔۔ (دانت پیس کر) آہ۔۔۔ تو نے کتنی معصوم ہستیوں کی چوری کی۔۔۔ کتنی شریف عورتوں کو کسبی بنا دیا۔۔۔ کتنی بے گناہ کنواریوں کی عصمت برباد کی۔۔۔ (آسمان کی طرف دیکھکر) اے پرمیشور مجھے ہمت دے کہ میں اس سے ان سب مظلوموں کا بدلہ لے سکوں۔۔ میری نسوانیت وقت پر مجھے دھوکہ نہ دیجائے۔۔۔ میری فطری کمزوری میرے ارادوں کو ڈگمگا نہ دے۔۔۔ میری نزاکت مجھے بدحواس نہ کرائے۔۔۔ اور میرا انتقام عصمت کے ڈاکوؤں کے لیے عبرت آموز ہو۔۔۔"

کشور کے آنے کی آہٹ معلوم ہوتی ہے۔۔۔ پریم لتا خاموش ہوجاتی ہے۔

کنور۔ (اندر آکر) آخاہ بہن پریم۔۔ صبح ہی صبح اور۔۔۔ آج یہ تم زرد کیوں ہو؟

پریم لتا۔ کچھ نہیں۔۔۔ یونہی ذرا طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔۔۔

کنور۔ جبھی آج تین چار دن سے کالج نہیں آئیں۔۔۔ میں سمجھی اپنے چچا کے یہاں گئی ہوگی۔ نہیں تو دیکھنے ضرور آتی۔۔۔ مگر اب تو بالکل اچھی ہو؟

پریم لتا۔ ہاں پرماتما کی دیا ہے۔۔۔ مگر چھوڑو ان باتوں کو اس وقت میں ایک بہت ضروری کام سے تمھارے پاس آئی ہوں ــــ

کنور۔ کہو۔

پریم لتا۔ پہلے وعدہ کرو کہ جو میں کہوں گی وہ مان ضرور لوگی۔

کنور۔ ہاں ماننے والی بات ہوگی تو انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

پریم لتا۔ نہیں اقرار کرو۔

کنور۔ اچھا ہوگیا اقرار۔

پریم لتا۔ پرسوں شام سے تم بیمار ہو جاؤ۔۔۔ یا بن جاؤ۔

کنور۔ بیمار ہو جاؤں یا بن جاؤں؟۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو تم۔۔ ارے پرسوں تو کالج میں ڈرامہ ہے۔ اس میں ہیروئن کا پارٹ مجھ ہی کو کرنا ہے

پریم لتا۔ وہی تو میں کرنا چاہتی ہوں۔

کنور۔ اور ریہرسل۔؟

پریم لتا۔ اس سے اطمینان رکھو۔۔۔ میں نے سب یاد کر لیا ہے۔۔۔ تمھاری کاپی لے گئی تھی نا! اسی سے دیکھکر۔

کنور۔ اور ایکٹنگ؟

پریم لتا۔ آج تین دن سے کنور سے سیکھتی ہوں۔

کنور۔ اچھا۔ مجھے سناؤ۔

پریم لتا کردار کے بعض حصے عمل کیسا تھ سناتی ہے جسے دیکھکر کنور حیرت میں آجاتی ہے

پریم لتا۔ کہو اب تمھیں اطمینان ہوگیا۔۔۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتادو وہ بھی پوری کرلوں۔

کنور۔ نہیں نہیں۔ بہت اچھا ہے۔۔۔ مجھے تمھاری بات منظور ہے۔

پریم لتا۔ پیاری کنور! (مسکراکر) تم سنو گی کہ تمھاری پریم کتنا اچھا پارٹ کرتی ہے۔۔۔ اچھا اب جاتی ہوں۔

کنور۔ پھر کب آؤ گی۔

پریم لتا۔ ایشور جانے۔ یہ کہکر چلی جاتی ہے۔ (پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

کالج کے ہال میں ڈرامہ ہو رہا ہے چوتھا منظر پیش نظر ہے کشور پھٹے ہوئے کپڑے پہنے فقیر کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ سر سے خون بہہ رہا ہے

کشور۔ آہ۔۔۔ آہ یہاں بھی نہیں۔ وہ حسن سراپا۔۔۔ وہ نور مجسم۔۔۔ عوبی کمال۔۔۔ سبزہ جس کے قدموں پر لوٹتا ہے۔۔۔ چاندنی جس کے پیروں کو چومتی ہے۔۔۔ ماہتاب جس کی مشاطہ ہے اور۔۔۔ اور آفتاب جس کا غلام۔۔۔ دولت عزت۔ مال و منال

نہیں نہیں ہزاروں جانوں سے زیادہ عزیز نوشاد..... (پکارتا ہے) نوشاد! نوشاد! دنیائے محبت کی ملکہ نوشاد آ...... آ میرے سینہ میں سما جا میرے خون میں........ میری روح میں سما جا آسمان کی طرف دیکھ کر۔

میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اے جذبۂ دل اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

(ذرا دیر رک کر) آ گئی ... آ گئی ... میرا جذبہ کھینچ لایا! (چھپی ہوئی آنکھوں سے سکتے کے عالم میں دیکھنے لگتا ہے)

پریم لتا شہزادی نوشاد کے لباس میں سہیلیوں کے ساتھ آتی ہے۔

پریم لتا۔ یہ فقیر کون ہے؟

ایک سہیلی۔ وہی ملکۂ عالم کا عاشق جانباز... شہباز۔

پریم لتا۔ شہباز عیار... میرے عشق کا دعویدار۔

کشور۔ (چونک کر) نہیں نہیں... دلوں کی ملکہ... وہی وفاشعار آپ کا فرمانبردار۔

پریم لتا۔ (کرخت لہجہ میں) فرمانبردار! مجھے گلی گلی بدنام کرنے والے... کوچہ کوچہ رسوا کرنے والے... میری عفت و عصمت کا مذاق اڑانے والے... گریبان میں منہ ڈال اور پھر اپنی فرمانبرداری کی حقیقت دیکھ۔ ارے... شقی... ظالم... جابر

کشور۔ (ایک لمبی سانس لے کر) ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا۔

شاہزادی! مجھے جابر کہتی ہو... مجھے ظالم بتاتی ہو... مجھے شقی سے خطاب کرتی ہو جس کا سب کچھ تم نے لوٹ لیا صرف ایک نظر دیکھ لینے کے جرم میں....... یاد کرو تم اپنے لب محل سے جھانک رہی تھیں میں نیچے سے گذر رہا تھا تم نے کمان ابرو سے تیر ارا ایسا چھا تکا کہ کلیجہ پر آ لگا۔ دل بیتاب ہو گیا۔ مگر تم..... آہ تم آج بھی سنگ دل ہو۔ پتھر اور لوہے سے زیادہ سنگ دل.....

پریم لتا۔ خاموش او بے ادب خاموش ورنہ زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔

کشور۔ (قہقہہ لگا کر) زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی.... زہے نصیب جو تمہارے سامنے موت آئے... خوشا تقدیر جو مرتے وقت تم کو مسکراتا ہوا دیکھ لوں۔

پریم لتا۔ یہی بات ہے۔

کشور۔ سونا کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور قول عمل پر۔

پریم لتا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

کشور۔ بدل و جان۔

پریم لتا۔ (ایک سہیلی سے) جاؤ زہر قاتل کی بوتل لے آؤ۔

سہیلی بوتل لاتی ہے پریم لتا اپنے ہاتھ سے گلاس میں زہر انڈیلتی ہے

پریم لتا۔ (کشور سے) جانتے ہو یہ کیا ہے ——— زہر۔

کشور۔ نہیں نہیں...... سکون قلب... آرام روح... راحت جان.....

پریم لتا۔ اور تمہیں یہ پینا ہوگا۔

کشور۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔

پریم لتا گلاس کشور کو دیتی ہے۔

کشور: (گلاس لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ کر) اے خدا...... اے رحمٰن و رحیم تو گواہ ہے کہ میں خودکشی نہیں کر رہا ہوں بلکہ کسی کا حالِ جہاں آرا میری محبت کا امتحان لے رہا ہے... اگر امتحان سے بھاگتا ہوں تو عشق شرمندہ ہوتا ہے.. وہ عشق جس پر کائنات کی بنیاد ہے وہ عشق جو گلشن حیات کی زینت اور باغ ہستی کی رونق ہے..... اے حسن شاہد رہیو کہ میں نے محبت کی عزت رکھ لی ہے (پی جاتا ہے) میں نے الفت پر اپنی جان کی.... قربانی ---- خدا...... دی.... آہ ---- آہ

گر پڑتا ہے۔ مجمع تالیاں بجاتا ہے۔ دوبارہ دوبارہ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ ایک منٹ کے بعد کشور تڑپنے لگتا ہے پریم لتا چیخ مار کر بیہوش ہو جاتی ہے---- پردہ گرتا ہے پانچ منٹ کے بعد اسٹیج کے اندر سے شور کی آواز آتی ہے ایک شخص بہت پریشان باہر آتا ہے اور کہتا ہے۔

"حضرات! شہباز کے اداکار مسٹر کشور کی حالت بہت خراب ہے۔ خیال ہے کہ انھیں اصلی زہر دے دیا گیا —— اور میڈم پریم لتا بھی بیہوش ہیں۔ مجمع میں اگر کوئی ڈاکٹر ہوں تو فوراً چلے آئیں۔

ڈراپ

مکتبہ جامعہ

ہمارا ادب اب ایک نئے انقلابی دور سے گذر رہا ہے۔ دنیا میں روز نئے نئے تغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کی صحیح رہنمائی کی جاتی۔ مکتبہ جامعہ نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ ایک طرف اس نے اپنی مطبوعات کے ذریعہ قدیم ادب کے بیش بہا ذخیروں کو ایک جگہ جمع کر کے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے اور دوسری طرف جدید ادب کے نئے رجحانات سے بھی غافل نہیں رہا ہے۔ یہ ایک ایسا قابل فخر کارنامہ ہے جسے بہی خواہانِ ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ مکتبہ نے اپنی تمام مطبوعات کو پبلک کے لیے نہایت دیدہ زیب صورت میں پیش کیا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے کتب فروش کسی بازار کی ایک چھوٹی سی میلی کچیلی دکان میں اردو ادب کے شہ پارے بادامی رنگ کے سڑے ہوئے کاغذ پر چھپوا کر بیچا کرتے تھے۔ کاروباری حیثیت سے پنجاب کے چند اداروں نے اس طرف توجہ ضرور کی تھی لیکن اُن کا مقصد ادب کی خدمت سے زیادہ اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا۔ اب جامعہ نے حیرت انگیز طریقہ پر اس کمی کو پورا کیا ہے اور ملک کے پڑھے لکھے طبقے نے اس کی کوششوں کو سراہا بھی ہے لیکن افسوس ہے کہ عوام نے ابتک اس قابلِ قدر مکتبہ کی کچھ بھی ہمت افزائی نہیں کی۔ اگر ہمارے سکوت و جمود کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب کہ صفحۂ زمین پر اردو ادب کا ایک نام لیوا بھی نہ باقی رہے گا

(ادارہ)

مسلم سے خطاب

جناب کامل رشید صاحب

باخبر اے صف شکن! اے مردِ غازی ہوشیار — سینۂ گیتی میں برپا ہو رہا ہے خلفشار

تیرہ نشیں قومیں ابھرنے کے لیے ہیں بیقرار — اور تو بے فکر ہے افسوس اے غفلت شعار

اُٹھ کہ اب ہونے کو ہے اسرارِ ہستی بے نقاب

ہونے والا ہے زمانے میں نرالا انقلاب

ساری دنیا پر مسلط ہے نیا جوشِ شباب — آ رہی ہے ذرہ ذرہ سے صدائے انقلاب

آنے ہی کو ہے سوا نیزہ کے اوپر آفتاب — ساری قومیں جاگتی ہیں اور تو ہی محوِ خواب

تیری ہستی اس طرح حسرت سے دامنگیر ہے

درد و غم کی گویا جیتی جاگتی تصویر ہے

تو ہے وہ گم کردہ منزل جسکی منزل ہی نہیں — اور منزل ہے اگر تو جذب کامل ہی نہیں

کیا ملے لطفِ چمن شورِ عنادل ہی نہیں — کشتیِ مسلم کا یعنی کوئی ساحل ہی نہیں

اب خدا کے واسطے خانہ بدوشی چھوڑ دے

بت شکن مشہور ہے تو، بت پرستی چھوڑ دے

تھا کبھی اوجِ ثریا پر ترا قومی نشان — ہر گھڑی دم تیرا بھرتے تھے زمین و آسماں

سجدہ گاہِ زندگی تھا ایک تیرا آستاں — منزلِ مقصد سے تھا نزدیک تیرا کارواں

آہ کل تک حال تیرا کیا تھا اور کیا آج ہے

تیرا دل محکوم ہے غیروں کے سر پر تاج ہے

مذہب

نسیم سندیلوی

میں مذہب کو زندگی سے ملا کر دیکھتا ہوں۔ پیشواؤں اور عقیدتمندوں سے اس کی سچائی کا اندازہ لگاتا ہوں — کتابیں تو سب ہی اچھی ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان مذہبی کتابوں پر چلنے والے کیا ہیں — اور انھیں کہاں تک پاس ہے وہ کس حد تک اپنے پیغمبر کے، اپنے دیوتاؤں اور رشیوں کے بنائے ہوئے اصولوں پر کاربند ہیں۔

آج فرقہ وارانہ فساد کی آوازیں سن کر ہر شخص کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اکثر مجھ کو بیٹھتے ہیں۔ جاہل انسان کا ذکر کیا۔ ان کی تو جہالت مشہور ہے۔ یہاں تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ حال ہے کہ ذاتی مفاد کے لیے، لیڈر بننے کے شوق میں سیکڑوں بیگناہوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ اپنی تقریروں سے اپنے قلم سے لوگوں میں نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ فرقہ وارانہ اشتعال پر تیل چھڑکتے ہیں۔

کیا اسی کا نام مذہب ہے؟ کیا یہی مذہب کی ساری کتھا ہے؟

ایک طرف اسلام خطرہ میں ہے۔ دوسری طرف گاؤکشی سے ہندوؤں کی مذہبی بنیاد متزلزل ہے۔ سنڈے اسکول کے عام نہ ہونے سے عیسائی ناراض ہے۔ ایک دوسرے سے لڑمرنے کو ہزاروں بہانے ہیں لیکن خدا کی وحدانیت پر جب کا ہر شخص قائل معلوم ہوتا ہے اتحاد کسی میں نہیں۔ مسلمان خدا پر سو جان سے فدا ہے۔ ہندو ایشور، ایشور کی دھن لگائے ہے، عیسائی گاڈ کے گیت گاتا ہے۔ مسلمان کو یقین ہے کہ ایشور وہی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ ہندو سمجھتا ہے کہ گاڈ اور ایشور دونوں ایک ہیں۔ عیسائی جانتا ہے کہ گاڈ اور خدا میں کوئی فرق نہیں، اُردو کے ایک پرانے مشہور دکنی ادیب کی زبان میں: "ایک کلمہ کا فرق ہے باقی خدا کی وحدانیت میں ہندو ہور مسلمان فرق ہے" [1]

لیکن ....؟

اس پر بھی مسلمان کتھا سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ ہندو خدا کا نام سن کر رام رام جپنے لگتا ہے۔ عیسائی کلمہ سن کر منھ پھیر لیتا ہے بنیادی اصول سب کے ایک ہیں سچائی ہر مذہب کی پشت پناہ ہے۔ ہر مذہب اچھائیوں کا رہبر ہے۔ برائیاں کسی کو نہیں بھاتیں

لیکن ....؟

پیشواؤں کے لیے بھی تو کچھ کام چاہیئے۔ اگر مذہب کو اتنا ہی آسان بنا دیا جائے تو پھر ہمارے سجادہ نشین، گرو مہاراج، اور فادر کیا کریں گے۔ انکی زندگی کے لیے آپس کی منافرت کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ بنیادی اصول نہ سہی ان کے خود کے بنائے ہوے من گھڑت مسائل تو ہیں۔ مسلمان کے چھو جانے سے ہندو کی رسوئی ناپاک ہو جاتی ہے۔ ہندو کے باجہ بجانے سے محرم کے جلوس کی توہین ہوتی ہے یہ گتھیاں کون سلجھائے گا؟

فرقہ وارانہ لڑائیوں کے لیے چندہ ہوتے ہیں۔ علماء جہاد کے فتوے دیتے ہیں۔ غیر جانبدار لوگوں کی زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ شہر کے امن کے لیے حکام بندشیں لگاتے ہیں۔ باہر والے ہنستے ہیں اور یہ ہیں کہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ بھونکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جب ذرا شورش کم ہوئی تو پھر ایک شگوفہ چھوڑ دیا۔

---

[1] [illegible]

ہزاروں مسلمان۔ بھوک سے فاقہ کر کے جان دیتے ہیں۔ لیکن متمول ہستیوں کی رواداری اس بات کی متقاضی نہیں ہوتی کہ وہ ان کی ایک وقت کی روٹی تک کا انتظام کر سکیں۔ جو دو ایک یتیم خانہ ہیں ان کی اقتصادی اور مالی حالت دگرگوں ہے۔ وہ ہو آشرم کے گھوارے بیچاری بےبس بیواؤں کی عصمت سے کھیل رہے ہیں اور ان پر دینی نظر کرنے والا نہیں۔ غریبوں کے بچے گلی کوچوں میں اپنی تعلیم کا وقت بیکار گنواتے ہیں لیکن ان پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ بڑی بڑی دعوتوں میں۔ جی حضوری کی پکار میں ہماری دولت سے تو دیگیں اڑاتے ہیں۔ اپنی بھونڈی اور بھدی آواز سے ایک نغمہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نغمہ جو غریبوں کا خون چوس کر ان کو لاچار کر کے۔ انکی محنت کی کمائی ان سے چھین کر اپنے مصرف کے لئے سامراجی مندر میں دولت کی دیوی کے چرنوں پر اس کی پوجا کے لیے ۔۔۔ اسکو خوش کرنے کے لیے گایا جاتا ہے ۔۔۔ وہ اس قصر شاہی میں دوش بدوش چل کر غریبوں کی امیدوں کو۔ اُن کی بڑھتی ہوئی ترنگوں کو پامال کر رہا ہے ہیں۔ یہی حضرات محل شاہی کے جگمگاتے مینار۔ پبلک میں آ کر ایک دوسرے کو کوستے ہیں۔ اپنی عیاشی میں ہزاروں روپیہ برباد کرتے ہیں لیکن ہم وطنوں پر کوڑی خرچ کرتے دم نکلتا ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند　　(حافظ)

ہم جانتے ہیں کہ ان مہروبیوں کی جن کی خانگی زندگی پبلک کی زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ جو پلیٹ فارم پر آ کر ایمان کے دقتی جوش میں سوڈا واٹر کی بوتل کی طرح اُبل پڑتے ہیں لیکن عشرت کدہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ساقی و مینا کو صد سجدہ کرتے ہیں۔ جنھوں نے ابتک اپنے لوہے کے پنجہ میں ہزاروں بےبس انسانوں کو مقید کر رکھا تھا آج انکی محفلیں بھی سونی ہو رہی ہیں۔ ان کے پنجوں میں زنگ لگ چکا ہے اور اب وہ وقت دور نہیں کہ انکے اس خونی پنجہ کو خون سے ہی پاک کیا جائے گا۔ ستار کے تار رفتہ رفتہ ٹوٹ رہے ہیں۔ اب ان پر من مانے گیت نہیں گائے جاسکتے۔ وہ وقت کے پابند ہیں۔ وقت کا طمانچہ ان پر اس قدر زبردست لگنے والا ہے کہ صدیوں تک پانچوں انگلیوں کے نشان انکے گندمی گالوں پر نمایاں رہیں گے۔ وہ وقت دور نہیں کہ وہ ساز و نغمہ کی محفلیں چھوڑ کر کاسۂ گدائی لئے در بدر مارے پھرینگے۔ وقت بدلے گا۔ انقلاب ان لوگوں کے جھلسے ہوئے سیاہ داغ والے دلوں کا مکر و فریب زمانہ کی گردش سے مٹا دیگا۔ جو آج ساقی کے سامنے ایک جرعہ آخریں کے لیے سرنگوں ہیں وہ کل دہقان کے قدموں پر زندگی کی بھیک مانگیں گے اور ہمارے سادہ لوح مگر صاف دل لیکن مفلس کسان انھیں ان ہی کے کارنامے سنا کر ان پر لعنت کریں گے۔ اس وقت ان کا یہ مذہب کا جال جسے لئے وہ مچھیروں کی طرح بھولی مذہب پرست مچھلیوں کو شکار کر کے اپنی غذا بنا رہے ہیں۔ اس قدر بے جھٹ ہوگا کہ اس پھندے میں مچھلی تو کجا گھاس پھوس بھی آنا پسند نہ کریگا۔ ان کے چہروں پر زمانہ کی لعنت کی مکھیاں بھنبھنائیں گی اور ان کے وقت سے شل سکتے ہوئے ہاتھ اس قابل بھی نہ رہیں گے وہ ان کو اڑا سکیں۔

لاوارث کی موت پر کوئی چار آنسو نہیں بہاتا۔ کسی کو اس کے کفن کی فکر نہیں اسکی آخری رسم ادا کرنیوالا بھی نہیں ملتا لیکن ــــــ ؟

اگر اس کے اعتقاد پر ذرا بھی تفرقہ کی جھلک ہو سکتی ہے تو ایک طرف مسلمان صف آرا ہو جاتے ہیں دوسری طرف ہندو ڈھول بجاتے آتے ہیں۔ کلیسا کی گھنٹیاں بجا کر پادری گرجے کے دریچوں سے جھانکتا ہے اور اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ ان دونوں میں چل جائے تو پھر اپنی جنت کی ہواؤں سے سربسجدہ ہو کر کہوں کہ کاش مجھ میں آج تو وہ طاقت دیتی کہ ۔۔۔ ۔۔۔ کو ۔۔۔ خواب ۔۔۔ سے جگا دیتا۔ ۔۔۔ کہدے کہ وہ عیسائی ۔۔۔

پھر ہم اس کے استقبال کے لیے چشم براہ ہو جائیں گے اور کلیسا کے سب سے شاداب چمن میں اسکی میت کو اتنی نمایاں جگہ دیں گے۔ وہ جگہ جو آنے والی نسلوں سے بہ زبان خاموشی یہ کہہ سکے کہ بیسویں صدی کے دور میں بھی عیسائیوں کی روحانیت قابل ستائش تھی

کیا یہی مذہب ہے؟

جس نے جودوں کو لیا اور کچھ کسی کو نہ دیا
ہزار کعبہ بنا یا ہزار حج بھی کیا (درجی)

مذہب انسانیت کا نام ہے۔ انسانیت مذہب ہے۔ خدمت خلق ہی امتیازی مذہب۔ انسان کو انسان سے زیادہ اور کیا چیز عزیز ہو سکتی ہے۔ اگر کسی شخص میں صرف انسانیت کا جذبہ ہے اس کی آنکھیں یتیم کو دیکھکر نم ہو جاتی ہیں۔ بیوہ کو دیکھکر اس کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے غمگین کی پیشانی سے وہ بیچارگی کا پسینہ اپنے دامن سے پونچھتا ہے۔ غریب کی مدد کرتا ہے۔ اندھے کی لکڑی پکڑ کر اسے راستہ بتاتا ہے مسافر کو وہ اپنی منزل تک پہونچنے میں مدد دے کر اس کی الجھن کو دور کرتا ہے۔ بڑھیا اور لاچار عورت کو اسکے جوان بچے کی موت پر دلاسا دیتا ہے سہاگن کے بیوہ ہو جانے پر سماج سے باغی ہو کر اسکے لیے ایک دوسرا جیون لگاتا ہے۔ جاہل کو جو ہر تعلیم سے جوان کرتا ہے۔ وہ شخص اس دنیا کا قائد اعظم ہے۔ اس کے مذہب کو جس کا کلمہ انسانیت ہے جس کا پیغمبر صداقت جس کا خدا صاف طینت ہے اسکو زمانے کے دنیوی اپنی شریعت کے غبار میں اگر کبھی چھو نہیں سکتے پنڈتوں کے رنگ برنگ سجے ہوئے ماتھے اپنی خود بینی کی کھڑاؤں پر بھی اگر اس کی جلا نہیں پا سکتے۔ پادری اپنے تمام کلیسائی نغموں میں تو بیت کے متلاشی اگر چاہیں کہ اس انسان کے سرور کو پہونچ جائیں جس کا مذہب انسانیت ہے تو ان کے لیے یہ ناممکن ہے۔

مذہب کی بیجا پابندیوں سے خود ساختہ رسوم نے ان تمام کو اسقدر محدود کر دیا ہے کہ وہ جتنا روحانیت سے قریب تر ہونا چاہتے ہیں اتنا ہی مذہب کی خود نمائی انھیں اپنے بنائے ہوئے دائرے کا چکر لگاتے رہنے پر مجبور کر دیتی ہے یہ مذہبی ترشح جس سے انکی تمام امیدیں وابستہ تھیں تب بھی اس سے وہ سمجھتے تھے کہ انکے چمن کی کلیاں شباب لائیں گی جنھوں نے کلید جنت اپنے ہاتھ میں لیکر دوسروں کو شمع دکھلانے کا دعوی کیا تھا۔ آج وہ چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ وقت جلد ہی اس کو چراغ سحری بنانے کا منتظر ہے پھر اس مذہب کے اندھیرے میں پیشوا دیوانہ وار خود ہی سہارے کی تلاش میں اپنے بھاری بھرکم لبادے اتار کر سچائی کی طرف دوڑیں گے انکو معلوم ہو جائیگا کہ عوام سے مذہب کی آڑ لیکر اپنی پرستش کرانا انکا کام تھا انکا کام روحانیت کے سبق پڑھانا اور انکی اخلاقی قوتوں کو ابھارنا تھا مندر میں سونے کی مورتی رکھکر دیوں سے رقص کرانا مسجد میں گھی کے چراغ جلا کر بھولی بھالی عورتوں سے مرادوں کی دعا منگوانا کلیسا میں دہریہ جبینوں پر پاک پانی کی چند بوندیں ڈال دینا۔ پادری سے گناہوں کا اعتراف کر لینے پر حضرت عیسیٰ کے دامن سے فرقہ کو خیالی گلہ میں منسلک کر دینا پاپیوں کی کبھی نہ بجھنے والی جلتی ہوئی آگ میں صندل کی لکڑی ڈالکر گناہ کا کفارہ دیدینا۔ ان سب سے انسانیت کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اور وہ مذہب جو انسانیت کو ادنیٰ نہ کر سکا اسکے پیرو زندگی کی جد و جہد کا کیا مقابلہ کر سکیں گے۔

ہمارے مذہبی پیشوا یہ سمجھتے ہیں کہ ماتھوں پر سجدوں کے نشان۔ سفید داڑھیوں پر عطر کی خوشبوئیں۔ صاف جبینوں پر سیندور کی لکیریں سینوں پر صلیب کے نشان انکی مغفرت کرائیں گے۔

لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ زندگی کا مقصد غریب دوستی علم پرستی۔ جذبہ انسانیت۔ سماج کی بندشوں سے بغاوت انسانیت کے حقوق کی حفاظت اور سب کی ہمدردی ہے۔ یہ زندگی کا مذہب ہے جو مذہب زندگی کے مسائل حل نہ کر سکا کیا وہ مذہب مذہب کہا جا سکتا ہے؟

سینما ——

ہندوستانی فلم

جناب سید خورشید احمد صاحب

"فلم اور ہماری زندگی" کے عنوان پر کافی لکھا جا چکا ہے اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہماری زندگی اور سینما میں بہت گہرا تعلق ہے ایسی صورت میں اچھے اور بُرے فلموں کا ہماری زندگی پر اثر انداز ہونا ضروری ہے، اگر فلم بُرے ہیں تو وہ نہ صرف ہمارے اخلاق کو گندہ کریں گے بلکہ ہمارے ذوق کو پست بنانے کے بھی بہت حد تک ذمہ دار ہوں گے اگر یہ مان لیا جائے کہ "ذوق کسی قسم کا بھی ہو خود نہیں پیدا ہوتا بلکہ پیدا کیا جاتا ہے"، تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سینما کا صحیح ذوق بھی فلموں ہی کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کی تمامتر ذمہ داری فلم سازوں پر ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں جس قسم کے فلم کی مانگ ہوتی ہے ویسی ہی تصویریں بنتی ہیں۔ اچھے اور بُرے کا انحصار پبلک پر ہے فلم ساز اس کے لئے ذمہ دار نہیں ہو سکتے مگر اس خیال کو زیادہ اہمیت نہیں دیجا سکتی کیوں کہ جہاں فلم تفریح کا سامان ہیں وہاں وہ اپنا دیرپا اثر ہمارے ذہنوں اور دماغوں پر چھوڑتے ہیں اگرچہ یہ اثر بالکل غیر شعوری ہوتا ہے مگر ہے یہی کہ ہم ان سے برابر اثر قبول کرتے رہتے ہیں اور چپکے چپکے وہ ہماری ذہنیتوں میں بھی انقلاب پیدا کرتے رہتے ہیں اور یہی ذہنی انقلاب آگے بڑھکر ساری زندگی کو تبدیل کر دیتے ہیں اور ہر شعبہ حیات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملکی فلم ساز اس اہمیت کو بہت کم محسوس کرتے ہیں اور اب بھی شاید انھیں اسکا احساس نہیں ہندوستانی فلم انڈسٹری کی جو حالت ہے اسے دیکھکر دکھ ہوتا ہے تکلیف پہونچتی ہے اب بھی جب دنیائے فلم میں انقلاب پیدا ہو چکا ہے دیگر ممالک میں یہ انڈسٹری کہاں سے کہاں پہونچ چکی ہے اس کی اہمیت کو محسوس کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے ہندوستان میں فلمی گندذوقی کا یہ عالم ہے کہ یہاں نوے فیصدی بلکہ اس سے بھی زائد فلم ایسے بنتے ہیں جو محض "عجیب" و "لغو" یا عبث سے پر ہوتے ہیں بات یہ ہے کہ فلم ساز حضرات اس انڈسٹری کو آنکھ بند کر کے مستقل آمدنی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں انھیں اس سے غرض نہیں کہ اس کا معیار پست ہو رہا ہے یا بلند، ملک کو بجائے نفع کے نقصان ہو رہا ہے یا حقیقتاً اسے کچھ مل رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی اصلاحی پروگرام ہے اور نہ ان کا مقصد اسے ترقی دینا؟ انھیں صرف اپنی تجوریاں بھرنے سے کام ہے اور بس) آئے دن سینما گھروں میں "ہری کین ہلسا" "سائیکل والی" کے سے فلموں کی نمائش ہوتی رہتی ہے' ایسے فلم دیکھ کر ہمارا فلمی ذوق ہی پست نہیں ہوتا بلکہ ہمارے خیالات، جذبات اور احساسات کا غلط استعمال بھی، اس طرف سے غفلت اور بے حسی کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہمارے سامنے کبھی کوئی معیاری فلم نہ آسکے گا اور نہ یہ انڈسٹری کبھی پایۂ تکمیل تک پہونچ سکے گی۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی فقدان کے سبب عوام میں بالعموم معیاری فلم پسند نہیں کیجا سکتی ہیں جہالت کی وجہ سے ہماری ذہنی اور دماغی قوتیں بیدار نہیں ہیں احساسات میں حس و حرکت اور ستھرا پن نہیں ایسی صورت میں یہ امید کرنا کہ ہم معیاری فلم پسند کریں گے ایک بے معنی سی بات ہوگی مگر او پر کہہ چکا ہوں کہ ذوق خود نہیں پیدا ہوتا بلکہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم دیکھنے والوں پر غیر محسوس طور پر اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ تعلیمیافتہ

اور غیر تعلیم یافتہ کی کوئی قید نہیں وہ دونوں طبقوں پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے، اگر شروع سے ہمیں اچھے اور معیاری فلموں کا عادی بنایا جاتا تو ہم کبھی لغو اور لچر فلم پسند نہ کرتے لیکن ہماری ذہنی تربیت اس لائن پر ہوئی اور عوام کی پسند اور غیر تعلیم یافتہ کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا، کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں مشکل سے ایک یا دو فلموں کے علاوہ اور کوئی فلم ایسا بنا ہو جس سے کسی قسم کا اصلاحی کام لیا جاسکے خواہ وہ معاشی اور تمدنی اصلاح ہو یا فلمی کور ذوقی کی اصلاح، اگرچہ ہر فلم کی نمائش کے وقت یہ پروپیگنڈا ضرور ہوتا ہے کہ معاشی اور تمدنی مسائل بہترین طریقہ سے حل کئے گئے ہیں، ہندوستانی سماج کو عمدہ طور پیش کرکے اس کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ مگر محض پروپیگنڈا ہوتا ہے اصلیت سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے ہر اسٹوری فلاپ شاٹ ہوتے ہیں ردوبدل کے بعد ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے، کوئی صاف و صریح بات نہیں بتائی جاتی کہ سوسائٹی کی اصلاح ان طریقوں سے ہوسکتی ہے، ممکن ہے فلم اپنے ٹیکنیک کے لحاظ سے مکمل ہو مگر مختلف شعبہ جات کی اصلاح کا عنصر اس میں بالکل نہیں ہوتا، اس کی جگہ زنانہ ریاں موسیقی اور رقص وغیرہ لے لیتی ہیں، مجھے اعتراف ہے کہ فلم انڈسٹری نے اپنی پچیس چھبیس سالہ زندگی میں کافی ترقی کی ہے لیکن یہ ترقی محض ٹیکنیک تک محدود ہے، اس نے ایسے ایسے اداکار ضرور پیدا کردیے ہیں جو اداکاری میں ہالی وڈ سے پیچھے نہیں ہیں ہمارے ملک کے اداکار اس وقت فن اداکاری میں آسمان فلم کے درخشاں ستارے بنکر پوری آب و تاب سے چمک رہے ہیں دیکھنے میں یہ الفاظ اور اظہار خیال کا یہ طریقہ دلکش اور جاذب معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انھیں زمین پر رہنے کے پیچھے کیا سہنا پڑا آج سے بیس پچیس سال پہلے جب فلمی دور کا آغاز ہوا تو اسے ایک مستقل چیز بنانے اور عوام تک پہنچانے میں کافی دشواریاں اور دقتیں پیش آئیں جیسا کہ عموماً ہر نئی چیز کو رائج کرنے میں ہوتا ہے مگر کارکنان کے استقلال اور ان کی انتھک کوششوں نے انھیں اپنے مقاصد میں کامیاب بنایا، سنیما نے بھی اپنی جگہ پیدا کی اور گوشہ گوشہ میں پھیل گیا، لوگ اس طرف متوجہ ہوئے اور یہ صنعت ترقی کرنے لگی، سیکڑوں کمپنیاں کھلیں اور ہزاروں آرٹسٹ مہیا ہوگئے، فلم سے متعلق بہت سی چیزوں، مثلاً اداکاری، میک اپ اور ڈائرکشن وغیرہ پر لوگوں نے قابو پایا، جہاں تک اس قسم کی ترقی کا تعلق ہے اس کا اعتراف میں اوپر کرچکا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم صرف ان ترقیوں سے مطمئن ہیں، کیا اس صنعت سے اور کوئی کام نہیں لیا جاسکتا، کیا ہم اسے صرف تفریح محض کا آلہ بنائے رہیں گے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں پوری قوت کے ساتھ یہ بتانا چاہیئے کہ اس صنعت کا صحیح مصرف کیا ہے تفریح کے ساتھ ساتھ اس سے ملکی فلاح و بہبود کا کام بھی لینا چاہیئے، فلم ساز حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خود اس طرف متوجہ ہوں گے بالکل بیکار ہے اس لئے کہ ان پر جذبۂ زرگیری اس طرح قابو پاچکا ہے کہ وہ بھول کر بھی ملک کی بہتری کا خیال نہیں کرسکتے حالانکہ اس تجارت کے ساتھ ساتھ ان کا اولین فرض یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ہمارے سامنے مستقل اصلاحی پروگرام رکھتیں، ہمیں سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تمدنی ترقیوں کا راستہ دکھاتیں، بہرحال اب ہمیں صرف اس بات سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے کہ صنعت فلمسازی نے عمدہ عمدہ آرٹسٹ، پروڈیوسر، کامیاب ڈائرکٹر اور کیمرہ مین پیدا کردئے ہیں۔

ہندوستان آج کل جس ہنگامی دور سے گذر رہا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے، ہمارے اضطراب، بے چینی اور ہیجان کا یہ تقاضا نہیں کہ ہمیں "الہ دین کا چراغ" "علی بابا اور چالیس چور" کے قصوں اور حسن و عشق کی فرسودہ روایتوں میں الجھا رکھا جائے، اب ایسے فلم جن میں محبت کا مذاق عریاں اور بہیمانہ جذبات کے ذریعہ اڑایا گیا ہو قطعی بیکار ہیں، وہ زمانہ بھی نہیں رہا کہ ہم مذہب اور اس کے محیر العقول کرشموں اور تماشوں سے پر تصویروں کو

پسند کریں۔ ضرورت ہے کہ ملک میں ایسے فلم تیار ہوں جو ذہنی ہیجان میں سکون پیدا کر سکیں جنہیں دیکھکر ہم میں حب الوطنی، یکجہتی، محبت، اخوت اور اخلاق کا جذبہ پیدا ہو سکے اور ہم ان کے معنی سمجھ سکیں۔ اگر دوسرے ذرائع ہمارے خیالات، جذبات اور تاثرات میں انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں تنہا اس کام کو بدرجہ احسن انجام دے سکتے ہیں۔ فلم کے ذریعہ ہماری سوئی ہوئی قومیں بیدار کی جا سکتی ہیں فلم تعلیم کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں چنانچہ بیدار ملکوں میں بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی تعلیم فلم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ سیکڑوں مسائل ہیں جن کا تعلق براہ راست ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے ان کی گتھیاں بھی فلم کے ذ. یعہ سلجھائی جا سکتی ہیں کاش ملک کی اس مانگ کی اہمیت کو ہمارے فلمساز محسوس کر سکیں اور اپنی تجارت کے ساتھ ساتھ ملک کی کچھ خدمت بھی کریں۔

تنقید

سینما کے پردے پر

کم کم۔ یہ ایک نادار رقاصہ کی کہانی ہے جو اپنی غریبی کی وجہ سے در بدر ناچتی گاتی پھرتی ہے اور اسطرح بھیک مانگ اور چوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے دوسری طرف ایک انسان دولت کے نشے اور عزت کی ہوس میں غریبوں پر در پردہ ظلم کرتا ہے اور بظاہر لیڈری کر کے ان کی ترقی اور اصلاح کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے سے باز نہیں آتا اس نے کم کم کے بوڑھے باپ پر بھی مظالم کئے ہیں اسنے غریب کا ڈرامہ چرا کر اپنے نام سے اسے مشہور کیا۔ کم کم کے باپ کے روپیہ سے جو اس نے بطور امانت کے رکھائے تھے آج وہ رئیس زادہ بنا ہے۔ کم کم کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکتی ہے وہ اس رئیس زادہ کے لڑکے سے شادی کر کے اس کے باپ سے بدلہ لینا چاہتی ہے اس نے اپنے باپ کا بدلہ اپنے سوامی کے باپ سے لے لیا لیکن وہ اپنے شوہر سے بغاوت نہ کر سکی......

اس نے جو کچھ کیا انتقام کے جذبے سے ..... وہ زندگی کے مسائل نہ سمجھ سکی... جس ماحول سے وہ متنفر تھی اپنے انتقام کی چنگاریوں کو بجھا کر پھر اسی ماحول سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ آج کل ایسی ادھوری کہانیوں سے نہ اصلاح کا کام ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہماری معاشرت پر اس کا مفید اثر پڑ سکتا ہے۔

آج کا ہندوستان رنجیت فلم کمپنی کا یہ لاجواب شاہکار ہے۔ اس سے پہلے اس فلم کمپنی کے کھیلوں میں چند مزاحیہ کردار اور چند رئیسوں کی عیاشانہ پارٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس فلم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ رنجیت فلم کمپنی نے اسقدر جلد کسطرح اتنی کامیاب فلم تیار کی۔ ڈرامے میں نہایت واضح طریقہ پر دکھلایا گیا ہے کہ کسطرح ہمارے ملک کے نوجوانوں پر شہری تہذیب کا جادو رفتہ رفتہ انھیں حقیقت کی دنیا سے دور کرتا ہے۔ حالانکہ ابھی دیہاتوں کی زندگی میں اصلاح کی بہت بڑی ضرورت ہے دیہات اور شہر کا تقابل کر کے سوسائٹی کی بیماریوں کو نہایت اچھے طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کو ایسے ہی کھیلوں کی ضرورت ہے جو ہماری معاشرت کی بنیادی اصول پر بحث کریں۔ بحیثیت مجموعی فلم نہایت کامیاب اور دلچسپ ہے۔ اس فلم کے دیکھنے کے بعد ہم رنجیت فلم کمپنی کے ڈائرکٹروں کے ستھرے ذوق کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ساتھ ہی ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے کہ اسقدر جلد رنجیت فلم کمپنی کا مذاق اتنا ستھرا کیونکر ہوا بہت ممکن ہو کہ نئے کرتا دھرتا نے اس فلم کمپنی میں آنے سے یہ تبدیلی ہوئی ہو بہرحال اب ہم امید کرتے ہیں کہ رنجیت فلم کمپنی بھی اچھے معاشرتی اور اصلاحی کھیل پیش کرے گی اب اسکا ذوق کچھ بدلا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔

(ادارہ)

ریڈیو ———

صدائے بازگشت

ہمارا یہ صفحہ ریڈیو کی خبروں کے لئے وقف ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ اپنی صحیح تنقید دفتر اضطراب کے پتہ سے بھیجتے رہیں۔ ہم اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے اسے برابر شایع کرتے رہیں گے اور کوشش کریں گے کہ اصلاح ریڈیو کے پروگرام اور پبلک کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ ضرورت ہوئی تو ہم خود بھی اپنے رائے کا وقتاً فوقتاً اظہار کریں گے۔

حال ہی میں ہمیں کچھ شکایتی خطوط موصول ہوئے ہیں لیکن ان میں عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیا گیا ہے آئندہ جو صاحب اپنی رائے کا اظہار کریں انہیں خیال رکھنا چاہیئے کہ سنجیدگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے ان خطوط کی اشاعت سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ کسی ادارے کو بدنام کریں۔ لیکن "اضطراب" عوام کا پرچہ ہے اور ہمیں بہرحال ان کی جائز تنقید کو شایع کرنا پڑے گا۔

(ادارہ)

انعامی افسانہ

پلاٹ یہ ہے ۔ ایک اچھوت لڑکا۔ ایک زمیندار کی لڑکی۔ دونوں کا بچپن کا میل جول۔ لڑکی تعلیم کے لئے باہر بھیجی جاتی ہے۔ لڑکا گاؤں میں رہ کر سماج کی اصلاح کرنا چاہتا ہے ساتھ ہی اسے بچپن کی باتیں کبھی کبھی یاد آجاتی ہیں۔ ان کی محبت۔ زمیندار اس ملاپ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ لڑکا اچھوت گنوار اور جاہل۔ لڑکے کی بغاوت —— ؟ —— ؟ —— ؟

کیا اسے لڑکی مل جائیگی؟ کیا ایک تعلیم یافتہ لڑکی ایک گنوار جاہل کے ساتھ زندگی بسر کرنا قبول کرے گی۔

اس پلاٹ پر جو صاحب سب سے اچھا افسانہ لکھ کر بھیجیں گے ان کو پانچ روپیہ کی کتابیں جن میں مکتبہ یہ کی بھی مطبوعات شامل ہوں گی بطور انعام دیجائیں گی۔

یہ انعامی افسانہ صرف نوجوان ادیبوں کے لئے ہے فیصلہ ایک تین آدمیوں کا بورڈ الگ الگ کریگا اور پھر ان کا مجموعی فیصلہ آخری ہوگا۔ انعامی افسانہ ستمبر کے پرچہ میں شایع ہوگا اور اگر ممکن ہو سکا تو پھر کبھی آئندہ ان تمام افسانوں کو ایک کتابی شکل میں پیش کیا جائیگا تمام افسانہ بنام ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "اضطراب" جابلنگ ارٹ لنگرآباد لکھنؤ۔ دفتر میں ۱۵ر اگست تک آجانے چاہئیں پلاٹ کے نبا ہنے کے ساتھ ساتھ زبان اور مختصر افسانہ نویسی کی خوبیوں [illegible] افسانے واپس نہ ہونگے

ہماری نظر میں

سہارا اور دوسرے رومانی افسانے

مصنفہ شفیق بانو صاحبہ شفق
قیمت ۸ر ملنے کا پتہ
جامع مسجد۔ نجیب آباد

ادب عکس ہے زندگی کا اور جس ادب میں زندگی کی ترجمانی نہیں وہ ادب نامکمل ہے

اُردو ادب میں مختصر افسانہ نویسی حال ہی میں شروع ہوئی ہے۔ لیکن اکثر مصنفین کے علمی ذوق اور نفسیاتی مطالعہ کی کمی اس فن کو برباد کر رہی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس نئے راستہ میں ہم کہیں گمراہ نہ ہو جائیں ہمیں اس شاہراہ پر بہت سنبھل کر چلنا ہے۔

سہارا اچھے چھوٹے چھوٹے کہیں افسانوں کا مجموعہ ہے۔

ہماری بہنوں نے برابر مردوں کی تقلید کی ہے لیکن وہ ان کی زبان کو ان کے اظہارِ خیال کو زیادہ نباہ نہ سکیں۔

ہمارے گھروں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ہی ہمارے جذبات ہمارے احساسات کی اصل ترجمان ہے۔ اور جو زبان ہم روزمرہ اپنے گھروں میں بولتے ہیں وہ ہی اصل میں اُردو ہے

شفیق بانو صاحبہ نے اپنی زبان میں۔ اس زبان میں جو ہماری بہنیں گھروں میں بولتی ہیں۔ مختصر افسانے لکھے ہیں۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ زبان میں روانی ہے اور اظہارِ خیال کا طریقہ پاکیزہ ہے ممکن ہے دوربیں نظریں بلاغت کی متلاشی رہیں لیکن ہم صریح الفہم اور روزمرہ کے منکر نہیں ہو سکتے۔ ستھری زبان کے ساتھ بیگمات چہل چہت اور چبھتے ہوئے فقرہ افسانوں کی جان ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شفیق بانو صاحبہ ایک ذکی الحس دل رکھنے والی خاتون ہیں۔ وہ سوسائٹی کی بیجا بندشوں سے متاثر ہوئی ہیں اور محبت نے بھی ان کے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔ انھوں نے دوسروں کے جذبات کا اثر قبول کیا ہے اور وہ ان کی ترجمانی بھی آسانی سے اس طرح کر سکتی ہیں کہ پڑھنے والے پر کردار کے جذبات کا صحیح اثر پڑے۔

اکثر افسانوں میں زندگی کے مختلف عکس نمایاں ہیں۔ اور یہی مختصر افسانوں کی خاص خوبی ہے۔ کتابت میں اکثر غلطیاں ہیں۔ طباعت اچھی ہے۔

جوہر عبدالحق نمبر

مجلد قیمت ۱۲ر
مکتبہ جامعہ۔ دہلی لکھنو لاہور بمبئی

جوہر جامعہ ملیہ کے طلباء کا رسالہ ہے اور اپنے حدود کے اندر اُردو زبان و ادب کی خدمت میں لگا ہوا ہے ڈاکٹر اقبال مرحوم کی یاد میں "جوہر اقبال" نکال کر اس رسالہ نے اُردو ادب میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلی۔ اب اس کا یہ دوسرا کارنامہ ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انکی سترویں سالگرہ کے موقع پر پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے اُردو زبان اور ادب کی خدمت میں جس ایثار اور جانفشانی سے خود کو نثار رکھا ہے اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی اور اُن کی محنت کی یہ سب سے بڑی داد ہے کہ اُن کے مقصد کی ترویج کی جائے۔

جوہر عبدالحق نمبر سے دونوں باتیں کسی حد تک پوری ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو ڈاکٹر عبدالحق کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری جانب ادبی اور تنقیدی مضامین سے اُردو زبان اور ادب کی خدمت ہوتی ہے جسے ڈاکٹر موصوف نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فریضہ بنا لیا ہے۔

جو ہر کے اس نمبر میں وہ مضامین جو عبدالحق کی زندگی سے بحث کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جو انھیں قریب سے جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک طرح کی شگفتگی اور تازگی ہے۔ جو محض تنقید لکھنے والوں کے یہاں مشکل سے پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسری قسم ان مضامین کی ہے جو اردو زبان اور ادب سے بحث کرتے ہیں۔ اور ان میں بعض مضامین نہایت مفید اور قابل قدر ہیں۔ تنوع اور دلکشی کے لحاظ سے یہ ایک ایسا مجموعہ ہے کہ اردو زبان و ادب سے دلچسپی لینے والوں کیلئے اسکا مطالعہ نہ صرف مفید ہوگا بلکہ دلچسپ بھی۔ طباعت کتابت عمدہ ہے۔

رگبی کی زندگی کتبہ جامعہ۔ دہلی لکھنؤ۔ لاہور۔ بمبئی ——— قیمت عہ ———

ہندوستان میں مکتبۂ جامعہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جس سے مفید کتابیں نکلتی رہتی ہیں۔ رگبی کی زندگی انگریزی کی مشہور کتاب "ٹام براؤنس اسکول ڈیز" کا ترجمہ ہے۔ انگریزی کی یہ کتاب ناول کے پیرائے میں انگلستان کے ایک بہت مشہور و معروف اسکول اور دارالاقامہ کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ کھیل کود تعلیم و ترتیب کے بہت سے اصول آتے ہیں بہت سے دلچسپ نفسیاتی مواقع پیدا ہوتے ہیں جن سے تعلیم و تربیت کے بارے میں اچھی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں کی تعلیم بیحد ناقص اور جہاں کا طریقۂ تعلیم بالکل لچر ہے اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب تعلیم کا انتظام کرنے والے ایک غیر معمولی انقلاب پیدا کردیں۔ رگبی کی زندگی کئی حیثیتوں سے بہت مفید ہونے کے علاوہ ناول ہونے اور ایک نقطۂ نظر پیش کرنے کے درمیان اس کی دلکشی کھو جاتی ہے۔ ترجمہ بھی جگہ جگہ مشکل ہے اگرچہ عام طور پر رواں اور سادہ ہے۔ جتنا فائدہ اس کتاب سے اٹھایا جا سکتا ہے اتنا ہندوستانی نہ اٹھا سکیں گے کیونکہ انگلستان کی وہ زندگی جس کا نقشہ یہاں پیش کیا گیا ہے ہندوستانیوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہے

مکتبہ جامعہ کے مختصر رسالے قیمت فی رسالہ ار ضخامت ۲۰ صفحہ

تعلیم و ترقی کے سلسلے میں مکتبہ جامعہ نے چند رسالے شائع کئے ہیں۔ زبان نہایت سلیس، عبارت شستہ اور بامحاورہ ہے بچوں کے لیے یہ رسالے نہایت کارآمد ہیں اور ہر گھر میں ان کی ضرورت ہے۔ اب بچوں کو پرانے طریقے پر تعلیم دینے سے انکی ذہانت کو فروغ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ جدید رسالے باتصویر ہیں۔ بچے انھیں نہایت شوق سے پڑھیں گے۔ رسالوں کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱۔ اردو پڑھنے کا قاعدہ باتصویر ۲۔ خط کتابت ۳۔ کہانیاں (حصۂ اول حصہ دوم) ۴۔ ۱۱ ماں بچے ۱ پڑھنے لگے (ایک دلچسپ قصہ) ۵۔ نماز ۶۔ حبیب خدا ۷۔ صدیق اکبر ۸۔ عمر فاروق ۹۔ غزلیں (اردو کے مشہور شاعروں کی آسان غزلوں کا دلچسپ مجموعہ) ۱۰۔ قومی گیت ۱۱۔ نظمیں ۱۲۔ میونسپلٹی ۱۳۔ ضلع کا انتظام ۱۴۔ ہمارا ہندوستان۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم باقی کتابوں پر اظہار رائے نہ کر سکے۔ خراب انشاء اللہ اگلے پرچہ میں۔ — مدیر

نسیم سندیلوی بی اے آنرز ایڈیٹر و پبلشر نے شاہی پریس میں چھپوا کر ... شائع کیا

سونے کی ٹکر کی چیز

مسٹر ڈرش موہن لال جی جیولرز دہلی" اپنے سونے جیسی نئی قسم کے گھانے تیار کرتے ہیں آج آپ کے یہاں سے آئے ہوئے پارسل کا مال دیکھا اصلی سونے کی ٹکر کی چیز ہے میں نے خود بھی پہلے آپ سے ایک زیور خرید لیا ہے۔ یہ نقلی سونا کسوٹی پر کسنے کا رنگ دیتا ہے اصل سونے کی طرح چمکدار اور کام آسکتا ہے استعمال ہونے کے ساتھ پرانا بھی استعمال کیا جاتا ہے تفصیل کو لے صرف تین روپیہ پارسل خرچ آٹھ آنہ تین تولہ کے خریدار سے صرف دس روپیہ محصول ڈاک معاف نمونہ ایک روپیہ ٹکٹ منگوا لیجئے پہلے ایک یا تین تولہ منگوا کر اپنی تسلی کر لیں اور پھر منگوائیں اور [illegible] نقلی مال سے [illegible] پر دو روز کے اندر واپس بھیج کر اپنی قیمت منگالیں۔

جرمن ناولٹی اسٹور پوسٹ بکس ۲۸ نئی دہلی [illegible]

تحفہ محبت

اگر آپ دولت، اولاد، رسوخ، عزت کے حصول اور متواتر کوششوں کے باوجود ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے [illegible] ہو چکی ہے تو ہمارا تعویذ محبت منگا کر اس کی روحانی برکت سے فیضیاب ہوں۔ [illegible] خواہ آپ کی قسمت میں [illegible] سات روز کے اندر اندر شرطیہ آپ سے آملیگا۔ جناب ڈی۔ سی [illegible] نواب صاحب [illegible] تحریر فرماتے ہیں تعویذ ملا اس کی سریع الاثیری دیکھکر اس مادی زمانہ میں بھی روحانی قوت کا اعتراف کرنا پڑا" ہدیہ [illegible] علاوہ محصول ڈاک [illegible] قیمت واپس [illegible] صرف تین روپیہ محصول ڈاک معاف

منیجر موہنی بھنڈار ۴۵ دہلی [illegible]

بغیر آپریشن فوطہ بڑھجانیکا علاج

اگر فوطے میں آنت اتر آئی ہو یا پانی آگیا ہے تو اس کی حیرت انگیز دوا اکسیر کنول رجسٹرڈ استعمال کیجئے خواہ کتنا ہی پرانا مرض ہو ایک ہفتہ میں مستقل طور پر فائدہ ہو سکتا ہے اس خطرناک بیماری کے لیے نہایت مجرب دوا ہے "کنول رجسٹرڈ" کی مالش سے پسینہ کے ذریعہ مادہ خارج ہو کر فوطے اصلی حالت پر آجائیں گے۔ آپریشن کرانے کی ضرورت نہیں۔ مکمل فائدے کے لئے ایک کی قیمت [illegible] اور نمونہ کی شیشی [illegible] علاوہ محصول ڈاک۔ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پتہ جام کوثر آفس رجسٹرڈ دہلی [illegible]

ایک دلہن کی سنسنی خیز آپ بیتی

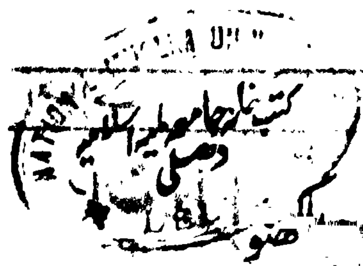
[illegible] رجسٹری شدہ

پہلی رات کس طرح گذاری؟

دلچسپ اور ہیجان خیز [illegible] والی سچی کہانی جس کو پڑھکر ساٹھ سالہ بوڑھے بھی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے [illegible] دوائیاں [illegible] نہیں [illegible] وہ اس کتاب کو [illegible] اور بار بار پڑھتے ہیں [illegible] کیونکہ بالکل [illegible] کے معاملات [illegible] پوشیدہ [illegible] قیمت صرف [illegible] علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:- جام کوثر آفس رجسٹرڈ۔ دہلی





ماہنامہ اضطراب لکھنؤ

چندہ سالانہ
معاونین سے عہ
خریداروں سے ۱۲

اکتوبر ۱۹۴۰ء
جلد ۱ شمارہ ۲

ادارہ
نسیم سندیلوی بی اے آنرز
مسعود اختر جمال

رجسٹرڈ نمبر اے ۶۶۲

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیے۔ ورنہ تعمیل نہ ہو سکے گی
منیجر

ماہنامہ اضطراب لکھنؤ

جلد نمبر ۱ — اکتوبر ۱۹۴۷ء — شمارہ نمبر ۴

ہم اور آپ ——

ہمارا چوتھا پرچہ جو آپ کے پیش نظر ہے پچھلے پرچوں سے بالکل الگ ہے۔ اب آئندہ ہم پرچہ کا معیار اس سے بھی اچھا پرچہ اپنے پڑھنے والوں کو دینگے

ہماری انعامی تنقید میں نعیمہ خاتون، غازیپور، اور بھائی سفیر احمد نازش نے حصہ لیا۔ بھائی سفیر احمد مقابلہ میں اول آئے۔ ہمارے "دیکھنے والوں" میں نوشہ صاحب تاجپوری، مسعود اختر جمال صاحب اور عشرت علی صاحب صدیقی تھے۔

جو مضامین ہمارے پاس آتے ہیں ان میں سے بیشتر سے ہم مطمئن نہیں اور اسی لئے اکثر اصحاب کو ہم سے شکایت ہے کہ ہم نے ان کا مضمون شائع کیوں نہیں کیا۔ لکھنے کے لئے وسیع مطالعہ اور سنے مضمون کی ضرورت ہے مضامین ترتیب دیتے وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ کس نے لکھا ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا ہے اور کیسا لکھا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس مرتبہ بھی شذرات میں کوئی علمی بحث نہ چھیڑ سکے جس کی وجہ ہماری مصروفیت اور جگہ کی تنگی کہی جا سکتی ہے۔ ابکی بار ہم کتابوں پر تبصرہ بھی نہ کر سکے ترتیب نئی تھی جس کی کتابت کا اندازہ ہمیں نہ ہو سکا اور اسی وجہ سے اس مرتبہ ہمیں اشتہارات بھی روکنے پڑے۔ آئندہ پرچہ میں ان تمام باتوں پر ہماری نگاہ رہیگی۔

ادارہ

مشاہدات

آگ برساتا ہے سورج رفعت افلاک سے
ہو گئے ہیں خشک آنسو دیدۂ غمناک سے
پتہ پتہ دھوپ کی شدت سے مرجھایا ہوا
اف تمازت ہے لبوں پر سب کے دم آیا ہوا
کاروانِ ابر رخصت ہو چکا ہے دہر سے
جھلسی جاتی ہے زمیں موج تپش کے قہر سے
ریت کے ذروں میں پنہاں ہے سلگتا آفتاب
رہ میں جن پر بدلتی ہے ہوا مثل کباب
اور اس جانب سڑک کے ایک پیر ناتواں
ہاتھ میں لیکر کلہاڑی چیرتا ہے لکڑیاں
سر پر کچھ بھی نہیں ہے ایک تہمد کے سوا
جانفشانی کے عرق میں سر بسر ڈوبا ہوا
چند لمحے بھی وہ دم لیتا نہیں آرام سے
اس کو کچھ مطلب نہیں ہے کام اپنے کام سے
دوسری جانب محل کے رہنے والے شاد ہیں
دامنِ زر میں ہزاروں جنتیں آباد ہیں
رنگ کتنا جانفزا عشرت کے پیمانوں کا ہے
کسقدر پرلطف موسم انکے خس خانوں کا ہے
شوق انکی زندگی میں غم کی جانسوزی کہاں
یہ سمجھتے ہیں کہ ہے اُن کی خدائی میں جہاں
اب مگر بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
حال کے ہاتھوں میں مستقبل کا رنگیں ساز ہے

(شوق کھنڈوی)

"انعامی تنقید"

جگر کی شاعری پر ایک نظر

صغیر احمد

جگر کی ابتدائی تعلیم پرانے طریقے پر ہوئی فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ کچھ عرصہ بعد انٹرنس کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ لیکن بعد میں اپنی خود فراموشی فطرت سے مجبور ہو کر انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا ان کی نشو و نما جس فضا میں ہوئی وہ سراپا شاعرانہ کیفیت سے معمور تھی خود ان کے والد اور چچا نہایت خوشگو شاعر تھے۔ گھر میں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اس ماحول میں جگر کی طبعی جولانی رنگ لائی اور رفتہ رفتہ وہ مجسم شاعر بن گئے۔

چونکہ ان کا مذاق شاعری فطری تھا اس وجہ سے وہ بارہ تیرہ برس کی عمر سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ اصلاح والد سے لیتے۔ والد کے انتقال کے بعد کچھ دنوں غزلیں داغ کو دکھائیں اور استاد کی سلاست، شوخی اور نزاکت کا اثر ان کے کلام پر بہت زیادہ پڑا۔ جو ان کے کلام میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ داغ کے بعد انھوں نے تسلیم اور رسا کو بھی غزلیں دکھائیں شروع زمانے کا شعر ہے،

یہ سوزِ نہاں نہیں ہے دل میں
جلتا ہے چراغ بیکسی کا

جگر گو رندانہ طرزِ معاشرت کے عادی تھے لیکن ان کا احساس خودداری مجبور زندگی بسر کرنے سے گریز کرتا۔ ان کے خاندان پر جب تباہیاں آئیں تو وہ فکرِ معاش میں آگرے گئے۔ یہاں زندگی کی چند رنگین ساعتوں نے ان کے ذوقِ شاعری کو تیز تر کر دیا۔ مے نوشی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ غم میں ایک سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی اور انکی زندگی مجسم پروانہ بنکر فضائے شعر و ادب پر چھا گئی۔

فکرِ معاش کے سلسلے میں کچھ دنوں کے بعد انھوں نے چشمے کی ایجنسی لے لی۔ اسی سلسلہ میں وہ گونڈہ بھی آئے جہاں اصغر سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات سے جگر کی اخلاقی اور شاعرانہ زندگی میں غیر معمولی انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ اصغر مرحوم اُس دور کے کامیاب غزلگو تھے۔ ان کے کلام کی رنگینی، شگفتگی اور لطافت ان کی مجازی شاعری پر اثر انداز ہوئی اور اُن کے اشعار میں بھی اصغر کی طرح تصوف کے لطیف نغمے مچلنے لگے۔ مولانا اصغر نے ان کو اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا سید عبدالغنی منگلوری سے بیعت کرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگر کی ذات پر مرشد مذکور کے فیض روحانی سے

مذہبی رنگ غالب ہوگیا جو آج بھی اُن کی شخصیت میں کسی نہ کسی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں جگر نے فارسی (دادین) کا غائر مطالعہ کیا جس سے اُن کی شاعری میں جان پیدا ہوگئی اور مضامین لبند ہونے لگے شعر ہے۔

بلبل ہمہ تن خون شد و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر اینست بہارے

اس کے بعد جگر مین پوری میں رہنے لگے جونکہ نظر شاعر حسن پرست واقع ہوئے تھے اس وجہ سے تنہ اشعار میں تغزلاتی شان جلوہ گر ہے۔ خوب خوب نغمے کہے۔ یہی زمانہ ان کی شاعری کا شباب تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی شہرت خواص سے عوام تک پہنچی۔ وہ مشاعروں میں بلا اصرار بلائے جاتے۔ انکی بے حد تعظیم و تکریم ہوتی جس وقت مترنم آواز سے پڑھتے لوگوں پر چھا جاتے داد و تحسین کی صدائیں لبند ہوتیں۔ عوام کی بنا وانوازی نے بھی ایک حد تک جگر کو متاثر کیا جس کے باعث تخیل میں عمق کم ہوگیا پہلے وہ کہتے تھے،

عشق میں گم گشتگی شوق راس آئی مجھے
تھی جو میرے دل میں حسرت اب آنکے دل میں ہے

اب وہ کہتے ہیں،

پھر وہی رت وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو
پھر محبت کی ہر اک چوٹ اُبھر آئی ہو

بہت دنوں تک دختِ رز نے جگر کو دونوں عالم میں بیگانہ بنائے رکھا۔ لیکن چند ماہ سے وہ تائب ہوگئے ہیں۔ زہد کو اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اور حضرت مرحوم کی بیوہ سے عقدِ ثانی کرلیا ہے۔

جگر کا اخلاق نہایت وسیع ہے۔ مولانا اصغر سے کمال عقیدت ہے۔ جگر کی عالمگیر شہرت محض اس وجہ سے نہیں کہ وہ مترنم لہجہ میں پڑھکر اہلِ بزم کو اپنے نغمہ سے مسحور کر دیتے ہیں۔ بلکہ اُنکی امتیازی حیثیت کا باعث اُنکی شاعری کا وہ سوز و گداز ہے۔ جو ہر شخص کے دل پر اثر کرتا ہے اور جس کے متعلق غالب مرحوم نے لکھا ہے۔

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

ہر موزوں طبع اس وقت تک "شاعر" کہے جانے کا مجاز نہیں جب تک وہ اپنے شعر کی خود تفسیر نہ بن جائے۔ اس معیار پر جب جگر کو دیکھتے ہیں تو اُنکی شاعرانہ عظمت مسلم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا ہر شعر خود اُن کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔

موسیقی ۔ یوں تو جگر کا کلام گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ لیکن سب سے بڑی خوبی ان کی "موسیقی" ہے "موسیقی" سے میری مراد اُس وجدانی کیفیت سے ہے جو نغمات کی مدد سے معنی کی رہبری کرے۔ ان کے اشعار شیریں موسیقیت میں ڈوبے ہوتے ہیں ملاحظہ ہو

یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا
دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں
کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

مندرجہ بالا اشعار کا ہر لفظ دلآویز موسیقی سے لبریز ہے۔

شعر میں موسیقی نشستِ الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ درحقیقت ترنم شاعری کی جان ہے۔ جگر کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ الفاظ اس طرح رکھتے ہیں کہ شعر میں شعریت کے دوش بدوش موسیقیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً،

اللہ اللہ یہ مری مشقِ تصور کا کمال
میں ہوں اس محفل میں اور محفل کی محفل دل میں ہے

دیکھئے حسنِ بندش اور شگفتگی الفاظ نے کس قدر دلکش ترنم پیدا کر دیا ہے۔ شعر میں جس قدر ترنم زیادہ ہوگا اسی قدر وہ لطیف اور نازک ہوگا۔ شاعر اور متشاعر کا جوہر یہیں کھلتا ہے۔

جگر کے کلام میں مجموعی حیثیت سے "غالبیت" نہیں ٹپکتی۔ اُن کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے جس سے اشعار میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مثلاً،

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے
رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

ایجاد و تخلیق۔ جگر کی دوسری بڑی خصوصیت انکا تخلیقی آرٹ ہے وہ ہر فرسودہ خیال کو "قوتِ تخیلہ" کے ذریعہ ندرت کا رنگ دیکر پیش کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اسلوبِ بیان کی حیثیت سے انکا کوئی حریف مقابل نہیں۔ شعر ہے،

جا اے فلک نہ خوش ہو برباد کر کے مجھکو
تیرے مزاج میں بھی آشفتگی رہے گی

"جا اے فلک" کے تخاطب سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ خیال ضرور پرانا ہے لیکن طرزِ بیان نے ایک نئی چیز بنا دی ہے در اصل شاعری "ندرتِ بیان" کا نام ہے۔ وہ پامال اور پیش پا افتادہ مضمون کو نرالے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو،

قیدِ ہستی سے کب نجات ملی — موت آئی اگر حیات گئی

غور کیجئے۔ "ہستی" کا موضوع کس قدر پرانا ہے لیکن پیرایۂ بیان اور جدتِ ادا سے ایک دوسری ہی چیز بن گئی ہے۔

ندرتِ بیان کی ایک مثال اور دیکھئے۔ گو موضوع "بہار" ہے جو نہایت پامال ہے،

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے
یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

متقدمین کے کلام میں طرزِ ادا اور جدتِ بیان کے ساتھ ساتھ "جوش و ولولہ" بہت کم ہے۔ جگر نے اُردو کے قالب میں "جوش و سرمستی" کی نئی روح پھونک دی ہے۔ کہتے ہیں،

نظر ملی ہے تو اُس کو بہار ساز بنا
نظر کو مائلِ رنگینیٔ بہار نہ کر

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

جلووں کو ترے دیکھ کے جی چاہ رہا ہے
آنکھوں میں اُتر آئے مرا کیفِ نظر بھی

مجھ ناتوان عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا!
دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا۔

جگر کی "رندانہ ادیت" کا ایک خاص عنصر یعنی جوش
و ولولہ ہے۔ کلام میں جتنا "درد و جوش" زیادہ ہوگا
اتنا ہی کلام موثر ہوگا۔

امثال بالا سے جگر کی وسعت تخئیل کے پہلو
بہ پہلو جذباتی انداز بیان کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔

جگر کو کیفیات اور جذبات کی تصویر کشی میں
کمال حاصل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا

عاشق ضبط کی انتہائی کوشش کرتا ہے لیکن
ناکامیاب رہتا ہے اس حالت کا سماں کس نزاکت
سے کھینچتے ہیں

کچھ ایسی ٹھیس لگی انتہائے ضبط پہ بھی
ٹپک پڑی مری حسرت مری نگاہوں سے

ہر لفظ پر غور کیجئے، آپ کو خود ہی کیفیت محسوس
ہوگی۔ اسی کا نام ہے "محاکات" اور جذبات و کیفیات
کی مصوری"

معشوق کے "خرام رنگیں" کی تصویر نگاہوں میں
کس لطف انداز سے کھینچتے ہیں،

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

معیار۔ جگر سوسائٹی کے معیار تمدن کا بہت خیال
رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں رکیک جذبات نہیں مبتذل
اور خیالات عامیانہ اور سوقیانہ نہیں ہوتے۔ انکی
شاعری خود انکے لطیف جذبات کا پرتو ہے یہی وجہ ہے
کہ اہل ذوق ان کا کلام نہایت دلچسپی سے پڑھتے ہیں
چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

ہنسی پھر آنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھاؤ، بدل دو فضا زمانے کی

شاید اسی کا نام مقام فنا نہ ہو
نازک سا ہوتا جاتا ہے دل ہر صدا کے بعد

مجھکو وہ لذت ملی احساس مشکل ہو گیا
رہتے رہتے دل میں تیرا درد بھی دل ہو گیا

استعمال الفاظ۔ جگر غزلوں میں بہت سے ایسے
الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن کو اب تک کسی غزلگو
نے نہیں استعمال کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ نامربوط
اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوتے۔ میرے نزدیک یہ
شاعر کا ایک زبردست آرٹ ہے۔ غزل جیسی نازک
اور لطیف صنف میں غیر مستعمل الفاظ نہایت خوش اسلوبی
سے کھپا دینا ایک ایسا اعجاز ہے جو صرف حضرت جگر
مرادآبادی کے حصے میں آیا ہے۔ طوالت مضمون کے
خیال سے مثال کے طور پر صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں"

ہم عشق مجسم ہیں۔ لب تشنہ و مستسقی
دریا کی طلب کیسی، دریا کو رلاتا ہے

"مستسقی" کا لفظ اس آسانی کے ساتھ استعمال
کر جانا جگر ہی کا کام ہے

جگر کا فلسفۂ زندگی۔ ہماری زندگی آجکل افلاس
جہالت کے باعث نئی نئی الجھنوں میں گرفتار ہوتی
چلی جا رہی ہے۔ اب ان کی نگاہیں رونے والے
شاعر پر نہیں ٹھہرتیں۔ اب عوام ایسی شاعری کو پسند

کرنے لگے ہیں جو اُن کے دل کا غم بھلا سکے جس میں زندگی ہو اثر ہو اور سرور آگیں نغمات کے دھارے ہوں۔ جگرؔ ہماری سوسائٹی میں اسی انفرادیت کے باعث مقبول ہیں۔ وہ اپنے غم کو بھی اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے پر اک کیف آگیں نشہ چھا جاتا ہے اور وہ اپنے آنسوؤں میں بھی ایسا ترنم پیدا کر دیتے ہیں جس میں ایک سرور آگیں لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں،

اشکوں کے تبسم میں، آہوں کے ترنم میں
معصوم محبت کا معصوم فسانہ ہے
جلوہ جو اُن کے رُخ کا مری چشمِ تر میں ہے
شادابیٔ بہار کا عالم نظر میں ہے

غمِ ہجر کی کیفیت بیان کرتے ہیں،

کٹے گی شبِ غم بڑی راحتوں سے
تری یاد ہوگی ترا دھیان ہوگا

وہ "دنیا" کو "ایک خواب" نہیں تصور کرتے بلکہ "جائے عمل" اور "کارزارِ حیات" سمجھتے ہیں۔ مزید براں وہ زندگی کو خواب و خیال نہیں بلکہ ایک مستقل جد و جہد سمجھتے ہیں۔ لکھا ہے،

کچھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا
حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے،

جگرؔ صاحب انقلابی اور اجتہادی دل و دماغ لیکر آئے ہیں اور قدامت پرستی سے کوسوں دور ہیں زمانے کے مصائب اُن کے مزاج میں قنوطیت نہیں پیدا کرتے بلکہ وہ ان کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی شاعری میں یہی پیغام بھی دیتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں وہ زمانے کے حوادث اور اپنے جذبات میں کتنی لطیف ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو،

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر
میرے لئے بیتاب ہے، معلوم نہیں کیوں

نظریۂ حسن و عشق۔ جگرؔ محبوب کے آستانہ پر جبیں سائی کرنا اور اپنی عاشقانہ عظمت کو مجروح کرنا نہیں پسند کرتے۔ وہ اپنی خودداری کو صدموں سے بچاتے ہیں ان کا عشق حسن کا حریفِ مقابل ہے۔ وہ ایک نیاز مند عاشق نہیں ہیں بلکہ بعض دفعہ خود انکا نیاز عشق ہی مجسم ناز بن جاتا ہے۔

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں
میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں
محبت کے جلوے نہیں حسن سے کم
اُنھیں بھی مرے ساتھ حیرانیاں ہیں
اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

اُن کے نزدیک عشق خلاقِ حسن ہے مگر ساتھ ہی ساتھ "حسن" کی کرمفرمائیوں کے بھی قائل ہیں۔ کہتے ہیں،

پڑا رہ سبزۂ بیگانہ پر تو، صورتِ شبنم
شعاعِ حسن اڑا لیجائیگی خود بال و پر ہو کر

بعض مرتبہ "حسن" کو "عشق" کی کیفیت سے لبریز دیکھتے ہیں

عشق رنگِ حسن سے ہو بے نیاز حسن کیفِ عشق سے خالی نہیں

درحقیقت اسی "نظریۂ حسن و عشق" کی جدت

انفرادیت۔ جگر کے کلام میں "انفرادیت" کا شوخ رنگ بھر دیا ہے جس شاعر میں "انفرادیت" نہیں وہ صحیح معنوں میں شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ خود جگر کے اشعار گویا ہیں کہ ہمارا خالق "جگر" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کے ہر نقش میں خود مصوّر کی روح جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جگر کا تغزل عصر حاضر میں کامیاب ترین ہے اور ان کا آرٹ ممتاز ترین۔

پرانی شاعری کا اثر۔ پرانی شاعری کے ناخدا جگر سے اس لیے خفا نظر آتے ہیں کہ جگر ان کے فرسودہ رنگ میں شعر کیوں نہیں کہتے اور ان کے کلام میں جدت کیوں ہے۔ نئے دور کو پسند کرنے والے حضرات انھیں اس لیے مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ اپنے انفرادی رنگ کو انھوں نے پرانی شاعری کے دھبوں سے کیوں ناپاک کیا۔ اور خود جگر اس کشاکش میں گرفتار ہیں کہ کس سے دامن بچائیں اور کسے اپنے ساتھ لیں۔ غالباً پرانی شاعری کا اثر جو اُن کے کلام میں نمایاں ہے اُن کے ابتدائی دور کی یادگار ہے جس سے اب نئے دور کے شاعروں کو بچنا چاہیے اور پرانے دور کے شاعروں کو خوش ہونا چاہیے۔ بہرحال میں اب اس بحث سے گریز کر کے جگر کی شاعری کے اُس حصّہ کو پیش کرتا ہوں جس میں قدیم "مفروضات" سے آرٹ کو رنگیں بنایا گیا ہے۔ لیکن جس میں زندگی کی حقیقت کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ شاعری انھیں وراثتاً ملی ہے۔

دیدۂ خونبار ملاحظہ ہو:۔

جب کبھی چھیڑا جنوں نے دیدۂ خونبار کو
بھر دیا پھولوں سے ہم نے دامنِ کہسار کو

عالمِ نزع کا تصوّر:۔

نزع میں ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
کاش انھیں ایک نظر دیکھوں میں

"جنوں" کی فتنہ سامانیوں کا منظر دیکھیے:۔

داماں و جیب ہو گئے نذرِ جنوں تمام
باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں

"زندہ در گور" شعرا کے پھیکے ترانے سنیے:۔

سناتے وقت تو انجام تک نظر نہ گئی
کھڑے ہیں اب مری تربت پہ سر جھکائے ہوئے

غرضیکہ جگر صاحب کے ساز سخن میں اکثر وہی سنے سنائے نغمے گونجتے لگتے ہیں جن میں تاثیر مطلق نہیں ہوتی۔ فرضی روایات کا راگ رقص و مستی کا پیغام دینے سے قطعاً مجبور ہے۔ ترقی پسند طبائع پر پرانی شاعری کی بے رنگ و بے کیف زمزمہ سنجیاں گراں گزرتی ہیں۔ تعجب ہے کہ جو شاعر خود ایک نئے رنگ کا موجد ہو وہ اپنے معاصرین کی غلطیوں میں خود کیوں مبتلا ہوتا ہے؟

فن و زبان۔ علاوہ ازیں جگر کے کلام میں "فن" اور "زبان" کی غلطیاں بھی ہیں جنکو میں "اجتہادِ وقت" خیال کرتا ہوں۔ چونکہ زمانہ کتنی قیود سے آزاد ہو چکا ہے اس وجہ سے اُنکا اعادہ کرنا لاحاصل ہے۔ شاعر کی جزئی فروگذاشت اور عارضی لغزشیں اُس کی زندگی کے بعد ادبیاتِ عالم میں "جواہر پاروں" کا خطاب حاصل کر لیتی ہیں۔

آئینۂ حقیقت

خواجہ عزیز الحسن - مجذوب

سرِ دار ہو کر۔ سرِ طور ہو کر
ترے پاس آیا بڑی دور ہو کر

نہ پاس آؤ اتنے۔ لو دور ہو کر
میں کچھ اور کہدوں نہ منصور ہو کر

گھٹا ہے کہ اُمڈی چلی آ رہی ہے
دعا کس نے کی لشتے میں چور ہو کر

تصوّر سلامت۔ تجلّی سلامت
میں بیٹھا ہوں اپنی جگہ طور ہو کر

چھپانے کو ہم تم چھپاتے ہیں دونوں
رہے گا یہ افسانہ مشہور ہو کر

حدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم
کبھی پاس آ کر کبھی دور ہو کر

تنِ یاسمیں پر لباسِ مُصَفّا!
وہ آئے ہیں نورٌ علیٰ نور ہو کر

نظر کیا کروں اب سوئے جام و مینا
تری مست آنکھوں کا مخمور ہو کر

اب اتنی رعایت تو لے آسماں ہو
نئے غم ملیں پچھلے غم دور ہو کر

میں کہنے کو تھا کچھ کہ چپ کر گئے وہ
زباں رہ گئی دارِ منصور ہو کر

وہ خوش بخت و خوش وقت مجذوب ہم ہیں
غموں میں بھی رہتے ہیں مسرور ہو کر

آرزو لکھنوی

سید خورشید احمد بی اے

حضرت آرزو لکھنوی سے کون واقف نہیں ہے، موجودہ زمانہ کے غزل گویوں میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے قبل اس کے کہ ان کے کلام پر تبصرہ کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی سے آج کل جو عام بیزاری پھیلی ہوئی ہے اس کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے

ہر زمانہ اپنے رنگِ شاعری کے لیے مخصوص ہوتا ہے ایک زمانہ تھا جب غزلوں کا دور تھا، اور عہد جدید کی شاعرانہ پیداوار سے درگذر کر کے ہماری شاعری کا تمامتر سرمایہ غزل ہی میں ملتا ہے، شعرا کے جوہر غزلوں ہی کے ذریعہ پرکھے جاتے تھے مگر اب غزلوں سے ہٹکر نظموں کا دور آگیا ہے، غزلوں کی طرف سے ایک عام بیزاری پھیلی ہوئی ہے، ایک مستقل گروہ پیدا ہوگیا ہے جو اس صنف شاعری ہی کی بیخکنی پر آمادہ ہے، اس عہد جدید کی بنیاد غالب کے زمانہ میں پڑتی ہے اور حقیقی معنوں میں اس کا سنگِ بنیاد وہی رکھتے ہیں، کہتے ہیں ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

دراصل غالب نے اس شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے جس کے خلاف اٹھنے والی نسلیں زبردست صدائے احتجاج بلند کرنے والی تھیں یعنی غزل کو غیر معمولی اہمیت دینے کی جو مخالفت ہم اس بیسویں صدی میں دیکھتے ہیں اس کے بانی غالب تھے، یہ ضرور ہے کہ انہیں موافق فضا نہ مل سکی اس وجہ سے وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ کامیاب نہ بنا سکے، ان کے بعد سیاسی انقلاب لے دیکھا، غالب کے شاگرد حالی کے سپرد کیا اور وہ آزاد کی زبردست حمایت اور پھر رفتار زمانہ کی معاونت میں بہت کچھ کر سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب حالات بالکل تبدیل ہوگئے ہیں، سیاست معاشرت اور ماحول سب تبدیل ہو چکے ہیں ہمارا ملک ایک زبردست ہنگامی اور مسلسل تبدیلیوں کے دور سے گذر رہا ہے، اس حشر سامانی میں عیش و عشرت کا ذکر اور عشق و محبت کے راگ الاپنا جو غزل کی مخصوص چیز ہے بے معنی ہی نہیں بلکہ غیر فطری بھی ہوگا، سیاسیات عالم کی مسلسل تبدیلیوں کا اثر ناگزیر طور پر ہم پر بھی ہوا جس کے نتیجہ میں ہمارے ماحول بدلے اور ساتھ ساتھ ہمارے خیالات اور رجحانات میں تبدیلی ہوئی، اس تبدیلی نے ہمارے مطالبات میں ہمہ گیری پیدا کی، چونکہ غزل ہمارے ان خیالات اور رجحانات کے

اظہار کے لیے چھوڑ دوں بلکہ اس بات کی نظموں کی طرف
مائل ہوئے اور روز بروز غزلوں کی اہمیت کم اور نظموں
کی زیادہ ہوتی گئی یہاں تک کہ غزلوں کی مخالفت نے
ایک منظم صورت اختیار کی۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز
نہیں کر سکتے کہ موجودہ سیاسی ہنگاموں اور اس کثرت کار
کی صدی میں جبکہ بسا اوقات مسلسل نظمیں ناممکن ہو جاتی
ہیں یا تازہ کیفیات جن سے شاعر کا دل روزمرہ کسی واقعہ
کو سنکر یا کسی حالت کو دیکھکر اثر پذیر ہوتا ہے اس وقت
غزل، رباعی یا قطعہ سے بہتر اور کوئی صنف اس کے اظہار
کے لیے نہیں ہو سکتی پھر موضوع غزل بھی احوال کے
ساتھ بدل چکا ہے، اسمیں عشقیہ مضمون کے علاوہ تصوف
اخلاق مواعظ اور سیاسیات بھی شامل ہو گئے ہیں، اس
صورت میں غزل سے کلیتاً انحراف محض شاعرانہ تعصب ہے،
موجودہ دور میں بکثرت ایسی غزلیں ملیں گی جن میں ہماری
بے چینی کا اظہار صاف و صریح طور پہ کیا گیا ہے جگر مراد آبادی
کہتے ہیں ؎

یہ کیا ہے کہ پہلو میں وہ بھی ہیں لیکن — شب ماہ پھر بھی سہانی نہیں ہے

سرمایہ داری کے مظالم اور غربت کی بے بسی کا کیسا
دلدوز مرقع آرزو نے اس غزل میں پیش کیا ہے۔

عجب زندگی ہے عجب زندگی ہے — کہ ہر ظلم پر ظلم اور بے بسی ہے
کمائی کسی کی ہے قبضہ کسی کا — جدھر دیکھیے الٹی گنگا بہی ہے
اگر بند ہیں تم تو کیوں دل لہیجے — انھی آنسوؤں سے تو کھیتی ہری ہے
غریبوں کا نخل آرزو جل رہا ہے — امیروں کے گھر ہر طرف روشنی ہے

حضرت آرزو ان چند با کمال اساتذہ میں ہیں جنہیں کلام پر
ہر طرح کی قدرت حاصل ہے۔ جہاں آرزو فن شاعری کے
تمام نکتوں پر حاوی ہیں وہاں زبان پر بھی پوری پوری
قدرت رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ زبان داں ہیں جس لفظ کو
صحیح کہ دیں وہ صحیح ورنہ ٹکسال باہر اسی وجہ سے اُن کی
غزلیں عموماً کامیاب رہتی ہیں وہ مضامین اور زبان کی
خوبیوں کے ساتھ مل کر کچھ ایسا اثر کرتی ہیں کہ ہم متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتے۔

آرزو کی سب سے بڑی خوبی حسیات و جذبات کی مرقع کشی
ہے، وہ ماہر نفسیات کی طرح انسانی فطرت کی گہرائیوں تک
پہونچتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اسے محسوس بھی کرتے ہیں
یہی وجہ ہے کہ اثر اور جذب ان کا حصہ ہوتا ہے ہر ہر قدم
پر داخلی شاعری کا پہلو اُجاگر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اظہارِ مدعا کے لیے آسرا ہے شرط
جب تک وہ دیکھتے رہے آنسو بہا کیے

قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی سے اظہارِ مدعا کرنا چاہتے ہیں
تو ایسا عنوان اور ایسا پیرایہ تلاش کرتے ہیں کہ سننے والے
پر گراں نہ گذرے، اُس کے لیے طبیعت کی موزونی شرط ہوا
کرتی ہے اگر سننے والے کی طبیعت موزوں رہی تو سب کچھ
ورنہ کچھ بھی نہیں، پھر معشوق کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے،
وہاں ہر آن یہ خطرہ ہوتا ہے کہ نہ معلوم کونسی بات خلاف
مزاج ہو جائے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے، آرزو نفسیات
کے اس راز سے واقف ہیں۔ چنانچہ معشوق کو ہمدرد پاکے
عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا بلکہ آنسو اسکے دل کی ترجمانی

کہتے ہیں۔ اور ہوتا بھی یہی ہے کہ ناکامیوں اور مصیبتوں کے وقت ہمدرد ملنے پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں پھر آرزو یہ بھی جانتے ہیں کہ ؎

ہاں میں واقف ہوں کہ آنسو بے وجہ تیغِ آبدار
سنگ و آہن میں اتر جاتی ہے جس کی نرم دھار

ایک جگہ خود کہتے ہیں ؎

ملا کے آنکھ سمجھ لو نہ مدعا پوچھو
انہیں سے دل میں جو حسرت بھری نگاہیں ہے

دیگر مجھ سے نہ کر حال پوچھنے بیٹھے میں اشک تو بہنے دو
میں سے بڑھے دل کی بے چینی اتنی تسلی رہنے دو

دیگر گرنا چاہے اچانک آنسو چونک کے اُن کا ہنس پڑنا
بوند ذرا سی تھی پانی کی جس سے بھنڈا پھوٹا ہے

اس شعر میں اگرچہ اس بات کو صاف صاف نہیں بتایا گیا ہے کہ معشوق اپنی محبت کو پوشیدہ رکھنے میں ناکامیاب رہتا ہے اور عاشق کے رخصت ہونے کے وقت بالکل غیر ارادی طور پر آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں جس کو وہ ہنس کر ٹالنا چاہتا ہے اور اس طرح اس کی محبت کا راز فاش ہو جاتا ہے مگر الفاظ کی ترتیب، بندش اور طرز ادا نے اس خلا کو پورا کر دیا ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے اس کیفیت کی پوری پوری تصویر کھنچ جاتی ہے جو ایسے موقع پر پیدا ہوتی ہے، حقیقتاً جب بلا ارادہ صرف جذبات سے متاثر ہو کر آنسو نکل پڑتے ہیں تو انسانی فطرت ہے کہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا سمجھ تو نہیں گیا اور فوراً آنسو خشک کر کے ہنس پڑتا ہے مندرجہ ذیل شعر میں بھی کیفیت جنون کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے ملاحظہ ہو ؎

جوشِ جنوں میں وہ ترے وحشی کا چیخنا
ہنداپنے ہاتھ سے در زنداں کئے ہوئے

یا یہ شعر ؎

بے جرم التجا وہ سمجھ لیں گے دل کی بات
ہم یونہی بار بار اگر دیکھتے رہے

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ فی زمانہ غزل صرف اپنے لغوی معنوں تک محدود نہیں رہ گئی ہے جہاں غزل نازک ترین صنف شاعری ہے وہاں اس میں ہر طرح کے مضمون کو بعض وقت نہایت لطیف طریقے پر ادا کیا جا سکتا ہے لیکن جب ہم اس کی تہہ میں نہ پہونچیں اس وقت تک معنی کے آبدار موتی ہاتھ نہیں آسکتے۔ فرماتے ہیں ؎

دل کے ہر ذرہ میں اب ہے پرتوِ برقِ جمال
ایک شیشہ چور ہو کر آئینہ خانہ ہوا

تھا عشقِ مجازی بھی آئینہ حقیقت کا
فانوس کے شیشوں سے ٹکرا گئے پروانے

جذبِ کامل کی بدولت مٹ گیا فرقِ دوئی
اب بجائے شمع لو دیتی ہے پروانے کی خاک

غزلیہ شاعری کا جزو اخلاق بھی تسلیم کیا گیا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ اخلاقی شاعری حد درجہ مشکل بھی ہے اخلاقی شاعری محض واہ واہ میں اڑا دینے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ سننے والے اس سے کچھ عمل بھی کریں پند و وعظ سے گریز تقریباً فطرت میں داخل ہے، شاعر کا بڑا کمال ہوتا ہے اگر وہ اخلاق کا درس دیتے ہوئے بھی کامیاب رہے، لوگ دلچسپی سے کلام پڑھیں اور وہ اُن پر

بار نہ ہو، آرزو کے جو ہر ہمیں پرکھنے ہیں وہ محاسن شعری کے ساتھ درس اخلاق اس طرح دے جاتے ہیں کہ بعض وقت ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ نکتہ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے آرزو کا طرز ادا ایسا سادہ اور انوکھا ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ ہم پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے، مثال کے لئے چند شعر پیش کرتا ہوں

سُن لو آرزو ایسوں کی بھی جنکے منھ پر آنکھ نہیں
جانچنے والے جانچ ہی لینگے کیا سچا کیا جھوٹا ہے

بھید کھلتا ہے بھرم جاتا ہے ہوتی ہے ہنسی
جس سے حرف آئے تمھیں پردہ حکایت نہ کہو

مجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر کہ جو آفتوں کی ہے رہگذر
تمھیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اُترے ہو بام سے

اکثر باکمالوں کی قدر زمانے نے نہیں کی اور وہ اس کے شاکی ہی رہے آرزو کا شمار بھی انھیں میں ہے اگرچہ انھوں نے کھل کر شکایت نہیں کی لیکن جا بجا کلام میں بیدلی کی جھلک موجود ہے، عمر کا بیشتر حصہ پریشانیوں میں گذرا بالآخر وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے اور وطن کی ناقدری نے لیجا کر کلکتہ میں بٹھا یا ہے یہی وجہ ہے کہ کلام کا زیادہ حصہ سوز و گداز سے بھرا ہے اور اسی چیز نے آرزو کو درد و غم اور یاس و حسرت کا مجسمہ بنا دیا۔ کلام کا انداز بتاتا ہے کہ شاعر نے حساس طبیعت اور درد مند دل پایا ہے۔

آرزو اب اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لا کے رکھو تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

جل کے میں راکھ بھی ہو جاؤں تو کوئی نہ چھوئے
راکھ بھی آگ ہی ہے ہاتھ جھلس جائے گا

مندرجۂ بالا اشعار میں حضرت آرزو کی اس بیدلی اور شکایت کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ کی ناقدری کی وجہ سے انھیں ہو سکتی ہے، چند اشعار ایسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جو یاس و حسرت میں ڈوب کر کہے گئے ہیں جس سے ان کے دردمند دل کا پتہ چلتا ہے۔

تارا ٹوٹتے دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹا ہے

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں کلی ڈلی

دورِ مسرت آرزو اپنا کتنا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منھ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

اگرچہ آرزو کے کلام میں قنوطیت غالب ہے لیکن رجائیت کے عنصر سے خالی نہیں، ان کے یہاں ہمیں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں رجائی جذبہ ابھارا گیا ہے، کچھ بھی ہو جائے مگر وہ آن میں فرق نہیں آنے دیتے اور خودداری کو کسی قیمت پہ بیچنا گوارہ نہیں کر سکتے چنانچہ ان کے کلام میں جا بجا خودداری کا سبق ملتا ہے۔

ہاں میری ڈبڈبائی آنکھ دیکھ بندھی ہے یہ دھاک
وہ بھی لگائے جائے آگ تو بھی لگی بجھائے جا

مان لی کس نے اپنی ہار خود یہ تھکن بتائے گی
میں یوں ہی تڑپے جاؤنگا تو یوں ہی مسکرائے جا

آرزو کے یہاں ایک خاص چیز جو ہمیں ملتی ہے وہ اُن کے

ام کا ترنم ہے، کوئی شعر کیف و ترنم سے خالی نہیں ہوتا،
نانچہ ان کے کلام میں ایسے اشعار ملیں گے جن میں نہ جذبہ
ں ترجمانی ہے نہ واردات قلبیہ کا تذکرہ، محض شاعری ہی
شاعری ہے پھر بھی کیفیت و ترنم کو ہاتھ سے جانے نہیں
دیا ہے مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں :-

بن سنے اس لئے بجلی بھی آنکھ جھپکا دو
دل کے جھپیں بھی رہ گئے ہو سامنا کرتے

ہنستے ہو اشک دیدہ پر یہ سوچتے نہیں
کس کس طرح غریب نے مطلب ادا کئے

دوسری بات جو خاص طور پر ان کے کلام میں نمایاں
ہے وہ ان کی انفرادیت ہے، یہ انفرادیت محض جدت
ادا ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ جدت خیال و مضامین بھی
آرزو کے یہاں ملتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ہمارے متقدمین نے
کون سی بات باقی رکھی ہے جس سے علیحدہ ہو کر کوئی مضمون
یا خیال پیش کیا جائے مگر کیا بلحاظ طرز ادا اور کیا بلحاظ تخیل
آرزو کی انفرادیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی، مثال کے طور پر
چند شعر لکھتا ہوں

اپنی قسمت کے ساتھ مرا فسانہ بار دد
اتنے ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں !

بھری آتے ہی کس نے چپکے سے سسکی
یہ لئے لگا کروٹیں، مرنے والا

مجھے جس جس نے نبھا لیا مرے حسن ظن میں وہ بات نہ تھا
اسے دل نہ دوں تو کروں میں کیا جو طلب ہے تیری نام سے

اک غازہ رنج نا کرم ہو کہ سے سبب قبول جس سے تو بیزار ہے ایسی نہ کر شامل مجھے

سلامت، روانی، بندش، ترنم الفاظ کے انتخاب اور
انفرادیت کے علاوہ آرزو کا سب سے بڑا کمال ان کی
مضمون آفرینی اور جدت ہے متقدمین کی حیثیت دنیا شاعری
میں ایک موجد کی ہے، انھوں نے ہماری شاعری میں
ایک نئے باب کا اضافہ کیا جو "خالص اُردو" کے نام سے
یاد کیا جاتا ہے، شاعری کے اس نئے رخ میں الفاظ عربی
فارسی اور ٹھیٹھ ہندی سے بچ کر ہر شعر خالص اُردو میں کہا
گیا ہے پھر بھی روانی باقی اور سلاست موجود ہے، تمام
دقتوں کے باوجود اپنی شان گویائی قائم رکھنا آپ ہی بہت
بڑی کامیابی ہے جس کا استحقاق آپ کو قدرت کی طرف سے
عطا ہوا ہے۔

جناب آرزو نے غزلوں کا جو نیا رخ پیدا کیا ہے اس میں
ہندی لفظوں کے سوا عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں ہوتا
آپ کی زبان دانی اور قدرت بیان کی کیا تعریف ہو سکتی
ہے کہ اس سخت قید کے باوجود ایسی فصیح اور شیریں اُردو
میں اپنے خیالات ظاہر کر دیتے ہیں کہ کسی کو اس قید کا علم بھی
نہیں ہو سکتا ہے۔

خالص اُردو یعنی ٹھیٹھ ہندی، عربی اور
فارسی الفاظ سے مبرا غزلوں کی مشکلات سے انکار نہیں کیا
جا سکتا مگر اس سخت قید کے ساتھ حضرت آرزو کی خالص غزلوں
کی زبان فصیح لکھنوی اُردو ہوتی ہے۔ اہل نظر حلقوں میں
آرزو کی یہ انوکھی چیز بیحد مقبول ہوئی، جو لوگ قدامت پسندی
کی دھن میں زمانے کی آواز نہیں سن سکتے وہ ان غزلوں کے
بارے میں جو جی چاہے کہیں لیکن جو لوگ زمانہ کی اقتضا پر نظر

رکھتے ہیں اور اُردو ہندی کا جھگڑا چکانے کے لئے بے چین ہیں
وہ حضرت آرزو کی اس کوشش کو فال نیک سمجھیں گے اور
دل سے اس کی داد دیں گے۔

حضرت آرزو کی خالص اُردو کے قیود انھیں کے عائد
کردہ ہیں مختصراً یہ ہیں:-

(۱) غیر ہندی الفاظ استعمال کئے جائیں گے لیکن صرف
وہی جو ٹکسالی اُردو کے جزو ہو چکے ہیں

(۲) جو غیر ہندی الفاظ صورتاً یا معناً یا دونوں طرح اپنی اصل
سے بدل گئے ہیں اُردو کے حکم میں داخل سمجھے جائیں گے

(۳) وہ ہندی الفاظ جو انفراداً اُردو میں داخل نہیں ہیں
اور وہ غیر ہندی الفاظ جو اپنی اصل پر قائم ہیں جب کسی
محاورہ کا جز ہو جائیں گے تو داخل اُردو سمجھے جائیں گے

(۴) جو الفاظ ہندی اور غیر ہندی میں مشترک ہیں ان سے
احتراز نہ کیا جائے گا۔

مندرجۂ بالا قیود کے ساتھ جناب آرزو کے مخصوص طرز کے
کلام کا ایک مجموعہ "سریلی بانسری" کے نام سے شائع ہو چکا
ہے، جا بجا سے نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے انکی
شان گویائی، روانی، قدرت، زباں دانی، فصاحت اور
شیرینی کا اندازہ ناظرین فرما سکتے ہیں:-

موتی یہ بھرم کا ہے آنسو نہ اسے جانو
آنکھوں نے گرایا تھا پلکوں نے سنبھالا ہے

او جی جلانے والے منہ تمتما اٹھا کیوں
چپ ہو رہا تھا میں تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کے

جینا ہے تو دکھ بھی ہیں سکھ بھی ہیں یاں ہنسنا بھی ہے رونا بھی ہے
بین ایک ہی ہوتی ہے جس پر سب راگ بجائے جاتے ہیں

چپ ہیں تو یہ کہ چپ ہو کیوں، "اچھا تو ہاں" یہ کیا کہا
بھید ہی بھید تو ہیں سب کس کو بتائیں کیا بتائیں

آخر میں یہ بتانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود جناب
آرزو کا نظریہ شاعری کیا ہے، ان کے زاویہ نگاہ سے عشق
کے کیا کیا مدارج ہیں اور عشق کی تکمیل کن کن چیزوں سے
ہوتی ہے اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

شاعری کچھ کھیل بچوں کا نہیں جو سبھی جھوم آئیں جماڑ دھائیاں
جو سخن ہے اک نیا پیغام ہے وحی تو ممکن نہیں الہام ہے

شاعر کے متعلق فرماتے ہیں:-

گر دکھائے حسن کی سرمستیاں عشق بھی لینے لگے انگڑائیاں

یہ تو جناب آرزو کا نظریہ شاعری تھا اب ملاحظہ کیجئے کہ
محبت، عشق اور وفا کے متعلق ان کا ایمان کیا ہے:-

محبت نہیں آگ سے کھیلنا ہے
لگانا پڑے گا بجھانا پڑے گا

اُف رے پاسِ نازبرداری گلا گھٹنا قبول
دور ہو سر سے مصیبت یہ دعا ہوتی نہیں

پڑے ہیں گو سوزِ غم کے پالے نہ کھا کے چرکے کریں گے نالے
حیا کے پابند ضبط والے جلیں گے لیکن دھواں نہ ہوگا

زباں بہ غم دل جو لانا پڑے گا شکایت کا پہلو بچانا پڑے گا

بحرِ الفت کے شناور ڈوب کر ہوتے ہیں پار
موج جب اُٹھی نظر آنے لگا ساحل مجھے

محسوسات

نشتر سندیلوی

جلوہ بہاراں سے، موسمِ بہار اُن کا جانِ منتظر انکی، دل امیدوار اُن کا
دم لبوں پہ پھرتی ہے، جانِ بیقرار، اُن کا اور کچھ نہیں حسرت، صرف انتظار اُن کا
لاکھ حسبِ سابق ہو، یوں نہیں انتظار اُن کا کیا کریں، نہیں جاتا دل سے اعتبار اُن کا
تابعِ نظر نکلا، رنگِ روزگار اُن کا خار کو بھی گل کردے حسنِ نو بہار اُن کا
گو مرے تڑپنے پر ہنس دہ دیں تجاہل سے حال دل کا کہتا ہے، رنگِ بیقرار، اُن کا
وہ نگاہِ عشرت خیز، وہ تبسمِ گلریز اک اشارۂ رنگیں، موسمِ بہار، اُن کا
اے فلک بجواسِ دل سے خاک ہو کے لپٹے ہیں قسمتِ رسا اُن کی، بخت سازگار اُن کا
وہ رلائیں یا تڑپائیں، خیر، یہ خوشی اُن کی ہم ہیں دل کے قابو میں، دل پہ اختیار اُن کا
ایسی سیکڑوں راتیں کاٹ دی ہیں آنکھوں میں اور ابھی دکھائے کیا، دیکھیں، انتظار اُن کا

گو چھٹے ہوئے اُن سے مدتیں ہوئیں نشتر!
ہے مگر خیال اب تک، دل سے ہمکنار اُن کا

ہماری شاعری

سوز۔ شاہجہانپوری

ہماری شاعری آجکل جس دور سے گذر رہی ہے وہ دور نہ صرف شاعری ہی کے لیے پُرآشوب اور قیامت بدوش ہے۔ بلکہ زبان کے لیے بھی تباہ کن ہے۔اس لیے کہ شاعری اور زبان دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ایک ہی شے کے دو نام یا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ لہٰذا اُن کے معائب اور محاسن کا اثر ایک دوسرے پر پڑنا ضروری ہے۔یعنی اگر زبان تباہ ہو رہی ہے تو اصولاً شاعری کو بھی تباہ ہونا چاہیے اور اگر شاعری تباہ ہو رہی ہے تو یہ سمجھئے کہ زبان بھی دم توڑ رہی ہوگی۔ مثل مشہور ہے کہ زیادتی ہر چیز کی بُری ہوتی ہے اور حدِ اعتدال سے گذر جانا ہر حال میں مضرت رساں ہے قطع نظر اس سے میرا اپنا بھی یہ ہی خیال ہے کہ جب کسی شے کے پرستاروں کی تعداد اعداد و شمار کی رہینِ منت نہیں رہتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن اُن کا وہ مرکز خود انھیں کے ہاتھوں مٹ کر رہ جاتا ہے اور دنیا والے ان نااہلوں کا کچھ دن ماتم کر کے بیٹھ رہتے ہیں چنانچہ یہ طالبان ذوق کی اللہ ری تشنہ لبی، کے مصداق۔ خدا نظرِ بد سے بچائے ہماری شاعری کے پرستار بھی کچھ اسی حد تک پہونچ گئے ہیں۔اب یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان حضرات کی بدولت ادب کو کہاں تک نقصان پہنچ چکا ہے یا غیر مانوس ترکیبوں اور بے معنی الفاظ کی بھرمار سے زبان کی گت بن چکی ہے بلکہ مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آجکل عرفِ عام میں کس معجون مرکب کا نام شعر ہے اور اس میں کس طرح زبان کی نوک پلک اور بانکپن کو حل کر کے تشنہ کامانِ ادب کو سیراب کیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ ان اجزا کو سمجھئے جن سے عام طور پر آجکل کا شعر مرکب ہوتا ہے اجزا سے میری مراد وہ اِنے گنے الفاظ ہیں جو تھوڑی سی ردو بدل کے بعد ہر شعر میں نظر آتے ہیں۔اس لئے کہ اس قسم کے تمام اشعار ہمیشہ معنی کی لطافتوں سے پاک ہوتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ہی طرح کے تمام الفاظ ہر شعر میں کس طرح نظم کئے جا سکتے ہیں۔ وہ الفاظ یا وہ اجزا یہ ہیں سازِ نفس۔ خوابِ مرگ۔ کیف آور۔ مجاز و حقیقت ۔۔۔ جلوہ ہائے حسن۔ جذبِ نہاں۔ بیخودیِ شوق۔ جوشِ بہار حدیثِ دل۔ نازآفریں۔ گدائے حسن۔ کیفِ رخسار نکہتِ رنگ و بو۔ غنچۂ شاداب۔ افق کے کنارے۔ کہساروں پر۔ نغمۂ بے ہنگام۔ شباب۔ مستی وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو ہوئے وہ اجزا جن سے شعر کو مہمل یا با الفاظ دیگر
بے معنی بنایا جاتا ہے۔ اب ذرا ان ٹکڑوں پر بھی ایک
سرسری نظر ڈالیے جن کو برائے بیت استعمال کیا جاتا
ہے یا جن سے شعر کی معنویت پہ احسان کیا جاتا ہے مثلاً
خوابوں کے جزیرے۔ روح بہیں، رومان ظلمت کے
کھیت۔ تنویر مرمریں۔ رباب حسن۔ گمشدہ خواب —
چمن زار۔ شعاع نور۔ فضائے شاداب۔ محو پرواز۔ نکہت بے
شفق اندام۔ خواب کا پھول وغیرہ وغیرہ۔ بس جناب
یہ ہے موجودہ شعر و سخن کی کل کائنات جس کے بل پر
بڑے بڑے پہلوان سخن خم ٹھونکتے ہیں۔ ایک بات رہ گئی
اور وہ یہ کہ جس طرح اس شاعری کے حرکات سکنات
مختلف ہوتے ہیں بالکل اسی طرح اس کے نام بھی مختلف
ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اب بجائے تضمین مخمس رباعی
قطعہ وغیرہ کے "ان سے" "ان کو تنہا دیکھکر" "دریا کے کنارے"
"کھیت کی مینڈ پر" "آغوش تخیل میں" وغیرہ وغیرہ قسم کے
عنوانات کے تحت طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ اور جس طرح
یہ شاعری بجائے خود صنادید عجم کی حیثیت رکھتی ہے ٹھیک
اسی طرح اس کی قسمیں بھی عجوبہ روزگار ہیں مثلاً جذباتی
شاعری، فطری شاعری، جمالیاتی شاعری، نفسیاتی شاعری
اور خدا معلوم کون کون سی شاعری۔ یہاں پر ایک نکتہ یہ
بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس بوقلموں شاعری کے زمانے میں
سب سے کامیاب شاعر وہی سمجھا جاتا ہے جو مہمل گوئی
اور گلے بازی میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔

ان حضرات سے قطع نظر کر کے کچھ —
بعض محبت سے فقط ہیں مبتلائے شاعری
کے تحت میں آتے ہیں یا جن اور شاعری میں بعد المشرقین والمغربین
ہے وہ اعلیٰ پروازان ادب بھی جو اپنی ترنم ریزیوں سے فضائے
شاعری پر زبردستی چھائے ہوئے ہیں — مہمل گوئی
کو جان شاعری جانتے ہیں۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ
جہاں تک ہو سکے شعر مہمل سے مہمل تر بنا دیا جائے۔
تشبیہ و استعارات، تناسب الفاظ، رعایت لفظی،
الفاظ و معانی میں ربط، عبارت آرائی، یہ اور اسی قسم
کی تمام چیزیں آجکل لغو قرار دے دی گئی ہیں۔ رہ گیا فن وہ
بیچارہ اس بنا پر مورد الزام ہے کہ اس سے فطری
شاعری تباہ ہوتی ہے۔ لہذا اس سے اور شاعری سے
کوئی واسطہ نہیں چلئے چھٹی ہوگئی۔ اب باقی کیا رہ گیا چند
غیر مربوط الفاظ کو کھینچ تان کر نظم کر دینا جن کی ترکیبیں دور
از کار اور جن کا مفہوم دور از قیاس ہو۔ زبان یا تو آدھا
تیتر آدھا بٹیر قسم کی ہو یا پھر بازاری۔ اب شعر اگر قطعی
"مہمل" "[illegible]" ہوا ہے تو فلسفے کے سر تھوپا جائیگا اور اگر سادہ
ہے تو یقینی طور پر ایک لطیف قسم کا کوک شاستر ہو گا۔
مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جو مشتے نمونہ
از خروارے کے مصداق ہیں۔

ناز سے دامن اٹھانا یاد ہے	دل کا اٹھکر بیٹھ جانا یاد ہے
اُس مجسم برق حسن و ناز کا	سر سے پا تک مسکرانا یاد ہے

دلنشیں ہے کمسنوں کے نرم لہجے کی کھٹک
مست فوارے کے قطروں میں ترنم کی نوا

قید کو توڑ کے نکلا جب اٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

ماضی سارا ہو کے فراہم جس نقطہ پر رہتا ہے
سارا عالم بے سمجھے بھی حال اسی کو کہتا ہے

نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

محبت جب کسی کے جذبِ دل کو گدگداتی ہے
نہیں کرتی ہے فرقِ شہر و صحرا ماہتاب آسا
چلی آتی ہے ہر دھڑکن سے بلبیں حباب آسا
اور آکر ساز کے تاروں کی نسوں میں مسکراتی ہے
فضا میں موجزن لمعات کا نظارہ ہوتا ہے
اور اک اک نغمہ سوزِ عشق کا گہوارہ ہوتا ہے

تین مصرعہ اور ملاحظہ ہوں

یہ موتی یہ جبیں یا انجم و مہتاب کا عالم
پریشاں خواب کا سا گیسوئے شب تاب کا عالم
چمن زار شعاعِ نور عکسِ دلنشیں تیرا

دیکھا آپ نے اس کو کہتے ہیں شاعری جس کو سن کر ایک مرتبہ روحِ ادب تھرا اٹھتی ہے اور مذاقِ سلیم دم دبا کر بھاگ جاتا ہے اور لطف تو یہ ہے کہ بیچاری شاعری کا اس طرح کند چھری سے گلا کاٹنے کے عوض ہر مہمل شاعر اپنی جگہ "پیشوائے المہملین" بننے کا آرزو مند ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقتی سیلاب میں وہ حضرات کیوں بہے جاتے ہیں جن کے دم سے ابھی کچھ نہ کچھ رونقِ محفل باقی ہے اور جن سے علم و ادب کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اب اسے ادبِ اردو کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر اس کے اپنے بھی غیر ہوتے جا رہے ہیں۔

یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قارئینِ کرام کہیں مجھے قدامت پسند نہ سمجھ لیں۔ میں ہرگز قدامت پسند یا لکیر کا فقیر نہیں ہوں۔ میں خود بھی جدّت پسند ہوں مگر ایک حد تک۔ غزل کو اگر زیادہ ضروری نہیں سمجھتا تو اس سے گریز بھی نہیں کرتا۔ اصل میدان میرا بھی نظم ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود بھی میرا نظریہ ذرا مختلف ہے اور اس کو آپ ظریف مرحوم کی زبان سے سنئے۔

ربط الفاظ و معانی میں اگر باہم نہیں
قائل ایسی شاعری کے بندہ پرور ہم نہیں

جوہرِ سیماب

سروش عسکری طباطبائی

دُور آلودگیِ خواب ہوئی جاتی ہے
زندگی جوہرِ سیماب ہوئی جاتی ہے

کس کی کشتی تہِ گرداب ہوئی جاتی ہے
موج خود ماہیِ بے آب ہوئی جاتی ہے

خوابِ الفت کی جو تعبیر نظر آئی تھی
اب وہ تعبیر بھی اک خواب ہوئی جاتی ہے

قلزمِ عشق کی اللہ رے طوفاں خیزی!
زندگی چشمۂ پایاب ہوئی جاتی ہے

کون ہے ٹوٹتے ہوئے دل کی وفا کا پُرساں؟
یہ وہ دولت ہے کہ نایاب ہوئی جاتی ہے

جام میں سایہ فگن ہے رخِ رنگیں کس کا؟
پانی پانی جو مئے ناب ہوئی جاتی ہے

جانِ بیتاب ترے شوق میں اے بحرِ کرم
رو کشِ گوہرِ خوش آب ہوئی جاتی ہے

اُف وہ طوفان کہ اُمڈا ہی چلا آتا ہے!
آہ وہ کشتی کہ تہِ آب ہوئی جاتی ہے

ڈوبی جاتی ہے لئے مجھ کو مرے دل کی اُمنگ
یہ ہے وہ موج کہ گرداب ہوئی جاتی ہے

اور ہر جنس ہے بازارِ جہاں میں لیکن
اک محبت ہے کہ نایاب ہوئی جاتی ہے

ہاتھ دکھتے ہوئے پہلو پہ یہ کس نے رکھا؟
فطرتِ درد سکوں یاب ہوئی جاتی ہے

نجف سے بغداد تک!

ماہر القادری

غالب نے کس حسرت سے کہا تھا کہ:۔

زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گذرد

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تمام لذتوں میں طویل ترین لذت "سیر و سیاحت" ہے۔ دنیا کی دوسری لذتوں سے لطف اٹھانے کے بعد آدمی اپنا بہت کچھ کھو دیتا ہے لیکن "سیر و سفر" کی لذت، آدمی کے دامن ہوش و تفکر میں اپنی طرف سے کچھ ڈال دیتی ہے۔ سفر، عبرت اور تجربہ کی امتحان گاہ ہے۔

میں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں عراق کا سفر کیا تھا، اس بات کو آٹھ سال ہو گئے، مگر مجھے ایک ایک واقعہ اس طرح یاد ہے جیسے یہ کل ہی کی بات تھی، اور میرا تصور جب چاہتا ہے بغداد کی گلیوں اور عراق کے نخلستانوں میں مجھے پہونچا دیتا ہے۔ کاش! تصور اور حقیقت ایک دوسرے میں سمو دئے جا سکتے۔

کوفہ میں میرے سفرنامہ کا یہ ورق جو آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، اتفاق کی بات ہے کہ نجف اشرف سے شروع ہوتا ہے۔ بمبئی سے بصرے اور بصرے سے بغداد اور وہاں سے نجف اشرف تک پہونچنے کی تفصیل گزشتہ اوراق میں درج ہے

ہاں! تو ہم صبح کے وقت ناشتہ کر کے، نجف اشرف سے موٹر کار میں روانہ ہوئے اور تھوڑی سی دیر میں کوفہ آ گئے کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل قاصد حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کے مزار پر فاتحہ پڑھی، اس کے بعد حضرت ہانی بن عروہ کی قبر پر پہونچے جو حضرت مسلم کے مقبرے کے محاذ میں واقع ہے۔ یہاں سے رخصت ہو کر کوفہ کی اس مسجد میں داخل ہوئے جو اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مسجد کا صحن بہت فراخ اور وسیع ہے صحن سے گذرتے ہوئے، ہم اُس مقام پر پہونچے! جہاں ابن ملجم نے حضرت سیدنا مولا علی کرم اللہ وجہہ کو نماز پڑھتے میں شہید کیا تھا، اسی مقام کی محراب پر یہ شعر کندہ ہے:

بسجود بود بدرگاہ خالق وہاب
زوند تیغ بہ فرق علی دریں محراب

قتل گاہ علی کو دیکھ کر دنیا کی شقاوت اور بد طینتی کا اک منظر نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ وہاں سے باہر آنے کے لئے پلٹے تو ہمارے عراقی گائڈ نے مسجد کے ایک حوض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ طوفانِ نوح اسی تنور سے اُبلا تھا۔ واللہ اعلم

مسجد سے باہر آ کر ہم موٹر پر سوار ہو گئے، اور چند فرلانگ

کے بعد جب کوفہ آگیا اسلام کے قرونِ اول میں کوفہ اچھا خاصہ شہر تھا اور علم و فضل کا مرکز اور جائے پناہ تھا لیکن اب تو اس کی حیثیت معمولی قصبہ کی رہ گئی ہے۔ آبادی کے آس پاس کھجور کے باغ ہیں، قریب ہی دریائے فرات بہتا ہے موجودہ کوفہ کی بستی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد مسعود کی یادگار ہے۔ اسی خاک سے امام ابوحنیفہ جیسا فاضل اجل پیدا ہوا، جو اسلامی قانون کا "ہیرو" تھا

حضرت ذوالکفل کا مزار

کوفہ سے چل کر "ذوالکفل" پہونچے، جہاں پر حضرت ذوالکفل پیغمبر کا مزار مبارک ہے بستی بھی آپ ہی کے نام سے موسوم ہے، مزار کے صدر دروازے سے باہر ایک مینار ہے جس کے طوفانِ نوح کے بعد کی تعمیر بتایا جاتا ہے، یہ مینار کہنگی اور انقلاب زندگی کی آپ ہی اپنی نظیر ہے حضرت ذوالکفل کے مزار کی عمارت بھی بہت قدیم معلوم ہوتی ہے، مقبرے کی اندرونی دیواروں پر عبرانی کتبات منقش ہیں۔ گنبد کے اندر چند یہودی توریت پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی سگرٹ پیتے جاتے تھے۔ اس مزار کی مجاور اور متولی یہودی عورتیں ہیں، بستی میں یہودی بھی آباد ہیں، مکانات کچے پکے دونوں طرح کے ہیں، بازار مسقف ہے، جہاں اچھی خاصی چہل پہل رہتی ہے۔

بابل کے کھنڈروں میں

تقریباً ایک گھنٹہ میں حلہ پہونچے، حلہ بڑی پر فضا بستی ہے، بستی کے اندر دریا بہتا ہے، یہ ضلع کا صدر مقام ہے۔ یہاں کے حاکم اعلیٰ کو "متصرف"، کہتے ہیں تجارت کی منڈی بھی حلہ میں ہے، اس لیے یہ شہر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے حلہ کے ہوٹل میں بیٹھ کر شربت پیا، نگاہوں کے سامنے دریا بہہ رہا تھا، اور ہم مزے لے لیکر ٹھنڈا اور مزیدار شربت پیتے جاتے تھے، تھکان نے بدن کو چور چور کر دیا تھا، شربت کے چند گھونٹوں نے آبِ حیات کا کام دیا اور ہم پھر تازہ دم ہوگئے۔

حلہ سے روانہ ہوکر بابل کے کھنڈروں میں پہونچے، ایک عراقی چپراسی نے "گائڈ" کے فرائض انجام دیے بابل کے تمدن و تہذیب کے متعلق بہت کچھ کتابوں میں پڑھا تھا، مگر انقلابات نے اس شہر کو جسے یونان کے مشہور مورخ ہیرو ڈوس نے "تعمیر کا معجزہ" کہا تھا، خاک کے تودوں کی شکل میں تبدیل کردیا۔ بابل اب چند ٹوٹی پھوٹی دیواروں، ریت کے تودوں اور گہرے غاروں کی صورت میں باقی رہ گیا ہے۔ معلق باغوں ( ) کے چند ستون شاہی قصر کی عظمت کا کچھ اتا پتا دے رہے ہیں، ورنہ ا—

خاک کے کچھ ڈھیر ہیں باقی خدا کا نام ہے

بغداد واپس

بابل کے کھنڈروں میں بہت دیر تک گھومنے کے بعد موٹر پر سوار ہونے کے لیے واپس ہوئے تو ہم پسینہ میں شرابور تھے دھوپ کافی تیز تھی، ڈرائیور نے موٹر اسٹارٹ کرتے ہی جو اڑان بھری ہے، تو ہوا اور ریت کے دھوئیں اڑا دیے، راستہ میں عراقی قریوں سے گذرنا پڑا بعض

درمیان میں چھوٹے چھوٹے قہوہ خانے نظر آئے جہاں لوگ قہوہ پی رہے تھے۔ راستہ میں ادھر کھجوروں کی قطاریں نخلستان اور خس پوش مکانات کو دیکھ کر قدیم عربی تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ موٹر تیزی کے ساتھ مسلسل چلتی رہی، یہاں تک کہ بغداد شریف کے مکانات نظر آنے لگے اور دجلہ کے پل پر ہوا کے نم آلود جھونکوں نے بدن کو گدگدا کر کہہ دیا کہ "منزل آگئی" اب ہم بغداد کے خوشنما بازاروں سے گذر رہے تھے۔ باب الشیخ پر پہنچ کر موٹر رکی، اور جب ہم موٹر سے اُترے ہیں، تو پنیر اور کھجور بیچنے والے آوازیں لگا رہے تھے۔

ساقی

یحییٰ اعظم گڈھ

ادھر بھی بخش دے اک جرعۂ کیف آفریں ساقی
تری مخمور آنکھوں پر فدا دنیا و دیں ساقی

مئے رنگیں سے اب چھلکا دے تو بھی ساغر رنگیں ساقی
گھٹاؤں سے برستی ہے شراب آتشیں ساقی

ہر اک موج صبا اب موج صہبا بن کے آتی ہے
فضائیں بن گئی ہیں میکدہ کی سرزمیں ساقی

برستا ہے زمیں پر آب حیواں ابر باراں سے
بہا دے تو بھی اٹھ کر جوئے شیر و انگبیں ساقی

گھٹائیں جھوم کر اٹھیں تو میکش یہ پکار اُٹھے
کسی نے کھول دی ہے اپنی زلف عنبریں ساقی

تخیل تیرے جلووں کا تصور تیری آنکھوں کا
یہ عالم ہے کہ ہے اب رقص میں جانِ حزیں ساقی

تجلی ہر طرف ہے بزم میں یہ جام رنگیں کی
فروغ انگیز ہے یا تیری تابندہ جبیں ساقی

ترے ساغر سے جس دم ریزش انوار ہوتی ہے
فلک کیا جھومتا ہے کیف میں عرش بریں ساقی

تجلی کا وہ عالم اور وہ دستِ ناز میں ساغر
کہاں یہ تاب رندوں میں کہوں تیرے قریں ساقی

رنگِ تغزل

سید آل رضا۔ رضاؔ

جی لبھایا۔ آنکھ کے تارے ہوئے　　حسن والے۔ اور بھی پیارے ہوئے
جی چکے اب جاہ کے مارے ہوئے　　دل کے دشمن۔ جان سے پیارے ہوئے
التفاتِ شوق و چشم نیم باز　　رات کیسے کیسے نظارے ہوئے
اشک ٹپکے اور دامن میں کھِلے　　ٹوٹے تارے اور مہ پارے ہوئے
امتحانِ عہد دل کا رُخ بدل　　جیتے جاتے ہیں۔ زباں بارے ہوئے
حسن کا جلوہ ادب کی چھاؤں میں　　دیکھتے ہی رہیئے جی مارے ہوئے

باغ میں یاد آتا ہے کیا کیا رضاؔ
پھول بھی قسمت سے انگارے ہوئے

نغمۂ احساس

حسن یاور نقوی۔ یاورؔ

رُک رُک کے دل نے اپنی تباہی کا سانحا　　اُسکو بھی آج سازِ نفس پر سُنا دیا
دل کی جراحتوں کے تبسّم میں ہے مزا　　تجھ کو ترے ستم کی قسم مسکرائے جا
چھینٹوں سے میں نے خونِ تمنا کے جابجا　　رومانِ حسن و عشق کو رنگیں بنا دیا
پیغمبر سکونِ محبت ہے تیرا غم　　ممکن نہیں ہے دل کے لئے تجھکو بھولنا
معصومیت سے تیری شکایت ضرور ہے　　شکوہ نہیں ترے عدمِ التفات کا

بیچین ہو گئی ہے فضاؤں کی شعریت
یاورؔ اس اہتمام سے اپنی غزل نہ گا

فریب انتظار

سید مرتضیٰ علی نقوی۔ بی اے

(۱)

دور سڑک پر ایک موٹر کی آواز ۔۔۔ جیسے آ کے موٹر ٹھہر گیا ہو۔ خاموش لیکن چاند سے منور فضا میں ۔۔۔ قدموں کی آہٹ ۔۔۔ دل کہتا ہے وہ آگئے ۔۔۔ احساسات میں امید کا تبسم ۔۔۔ نگاہوں میں کیف انتظار۔ نہیں غم انتظار ۔۔۔ کمرے کے باہر کوئی نہ تھا۔ مایوسی ۔۔۔ مایوس ہونے پر بھی ۔۔۔ خلش انتظار

کتنا ستم پرور گمان ہے

(۲)

ساون کا مہینہ آیا۔ دھواں دھار گھٹائیں آسمان پر چھانے لگیں۔ روح افزا ہوائیں مستانہ وار چلنے لگیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ باغوں میں سہیلیوں نے جھولے ڈالے ۔۔۔ ملہاروں کی تانیں اڑنے لگیں ؎

پھر شگوفے مسکرائے پھر چھپی سینے میں سانس
بوئے یاد یار پھر بے اختیار آنے لگی

کتنا خوشگوار موسم ہے ۔۔۔ جس کی رعنائیوں میں لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی جا رہی ہوں۔ کسی نے پیچھے سے آنکھیں بند کرلیں۔ میں سہم گئی وہ ہنس پڑے ۔۔۔ عجب انداز سے میری طرف دیکھنے لگے ۔۔۔ میری آنکھیں نیچی ہوگئیں۔ انھوں نے پھولوں کا ایک خوشنما ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ وہ تبسم سے کچھ کہہ رہے تھے کہ یکایک بڑی زور سے بجلی کڑکی میں چونک پڑی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں لیکن انکی صورت نظروں سے اوجھل ہوگئی ۔۔۔ کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ دل کی آس ٹوٹ گئی۔ آنسوؤں کے جھرنے بہہ نکلے

پی کہاں! پی کہاں! او نادان پپیہے تو نے بھی بہ پی ہُک بھڑکا دی۔ تن بدن پھونک دیا ۔۔۔ پروائی کا جھونکا آیا ۔۔۔ سلگتے ہوئے انگارے دہک اٹھے۔ دل کی چوٹیں تازہ ہوگئیں ۔۔۔ خبردار اب کوئی جھونکا ادھر نہ آئے۔

اے بادل۔ بس اب نہ گرج ۔۔۔ جلد جلد جا اس دیس سے گذر جا

(۳)

چھٹ پٹا وقت ہوگیا۔ پھول کملائے چمکا ہوا کا رنگ پھیکا ہوگیا۔ دریا کی مضطرب لہریں سکون پذیر ہو چلیں۔ ساحل پر افسردگی چھا گئی۔ پرندوں کے غول

سے کہ غول با غول گھروں کی طرف بسیرے کے لیے چل دیے
شفق آسمان پر رنگ بدلنے لگی۔ تارے بھی چمکنے لگے
بن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس وقت میری
نگاہیں تمہاری منتظر تھیں۔ یکایک نظر مشرق کی طرف
گئی۔ ایک اٹھتا ہوا اجالا دکھائی دیا۔ میں سمجھی تم
آرہے ہو۔ مشتاق نگاہیں استقبال کے لیے بڑھیں
لیکن نہیں۔ تم نہیں آئے۔ یہ تو چاند نکل رہا ہے ——
کتنا رنگین فریب ہے۔

(۴)

چاند نصف شب کی مسافت طے کر چکا ہے۔ درخت
دم بخود ایک سنتری کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے ہیں
دور تک سناٹے کی حکمرانی ہے۔ گویا وقت کی رفتار
بھی مدھم ہو گئی ہے۔ ساری دنیا گہری اور میٹھی نیند
سو رہی ہے لیکن میں تمہارے انتظار میں بے چین۔ ہجر
کی اندھی جوانی کو سلانے کے لیے کروٹیں بدل رہی
ہوں۔ دفعتاً زاغ کی صدائے بے ہنگم نے خوابیدہ
دنیا کا سکوت توڑا۔ میری تخیل کی روانی میں بھی خلل
ہوا۔ لیکن میں ایک آہ بھر کے اپنے خیالوں میں کھو گئی
یکایک ایک تیز روشنی کی جھلک کا احساس ہوا جیسے
بجلی چمک گئی ہو۔ دل بول اٹھا "تو وہ آگئے یہ انھیں کی
تابندگی روشنی ہے" لیکن آہ میں نے کیا دیکھا کہ سامنے
آسمان پہ ایک روشن ستارہ ٹوٹ رہا ہے جس کے
نقش قدم کی ایک لکیر باقی ہے یہی لکیر میرے دل
میں نشتر کا کام کر گئی۔ مشتاق آنکھیں خون رو دیں
میری امید کا ستارہ ٹوٹ گیا۔ کیا وہ اب بھی
نہ آئیں گے۔

(۵)

افق مشرق کی لو تھرتھرانے لگی۔ ستارۂ صبح کی
رسیلی آنکھ جھپکنے لگی۔ عروسانِ چمن دھانی پوشاک
میں ملبوس ہیں۔ نسیم سحر انکو جھولا جھلا رہی ہے۔
بزم سحر کے مطرب نغمہ زن ہیں۔ قمریاں رقص کر رہی
ہیں۔ کلیاں اس عالم کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہیں۔ میں سمجھتی
ہوں کہ تم آرہے ہو

کھٹک کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں کسی کی آواز آرہی ہے

اب زمین و آسمان روشن ہونے لگے۔ دل کہتا
ہے کہ تم ضرور آرہے ہو لیکن آہ کیا دیکھتی ہوں کہ آفتاب
کی درخشاں کرنیں جلوہ ریز ہیں اور تم نہیں آئے۔

کون؟

سلام کی اس نظم میں اسلوب نگارش کی جدت آپ اپنی مثال ہے ممکن ہے ہمارے بعض بزرگ اس شوخی کو برداشت کر سکیں لیکن جدت طبع اور شگفتگی بیان کی داد تو دینی ہی پڑے گی۔

اس دور میں مے اور ہے۔ جام اور ہے جم اور ہے۔ ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور۔ اقبال "مدیر"

کون؟

ہاں، یار نہ کیجئے مری دیواروں کو :
آپ تو چڑھتے ہی آتے ہی ادھر ہی رہیئے!
کیا مزا آپ کو دی جائے یہ خود ہی کہئے!
دیکھئے یوں نہ مرے حسن کے نظاروں کو!
ہے نگہباں کی نظر
آپ کی اس جرأت پر !
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

اندر نہ قدم رکھئے عنایت ہو گی
آپ رکتے ہی نہیں، ہوش میں ہیں یا کہ نہیں؟
مجھکو ڈر ہے کہ نہ غصہ مجھے آجائے کہیں!
کیا مرے پردے کو بھی چھونے کی جرأت ہو گی؟
کمرے کے پیچھے وہاں
جیسے ملازم ہے عیاں!
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

پھلواری میں کیوں آپ چلے آتے ہیں؟
آپ تو بڑھتے ہی آتے ہیں ذرا رک جائیں
خود ہی تجویز خطاؤں کی سزا فرمائیں !
کیوں مرے جوہی چنبیلی کی طرف جاتے ہیں؟
باغباں بھی ہے کھڑا
دیکھ کے وہ سوچے گا کیا؟
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

کمرے میں در آجانے کی جرأت کیجئے !
آپ رکتے ہی نہیں، کیا کوئی سودائی ہیں؟
آپ اب میرے لئے باعث رسوائی ہیں !
میرے گلدستے کو چھونے کی نہ رغبت کیجئے !
خادمہ آ جو گئی؟
آپکو وہ پا جو گئی؟
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

اب وقت نہ یوں کیجئے بیکار مرا!
مانتے ہی نہیں بڑھتے ہی چلے آتے ہیں!
آپ اٹھیئے یہ غمزے کسے دکھلاتے ہیں!
ہاں یہ کیوں چھوتے ہیں جو یہاں کسیں ہار مرا!
مسکراتی ہے کھڑی
اک سہیلی وہ مری!
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

کیوں کرتے ہیں اسطرح پریشان مجھے
آپ کیا ٹھان کے آئے ہیں ارادہ کیا ہے؟
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ منشا کیا ہے!
دیکھیئے اتنا نہ یوں کیجئے حیران مجھے!
کیا کہے گا یہ جہاں!
اور میں جاؤنگی کہاں؟
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

سلام مچھلی شہری

جذب تصور

وسیم صدیقی

آ! کہ اب اشکبار ہے کوئی ۔۔۔ ہمہ تن انتظار ہے کوئی
اے محبت! اسکوں کے پردے میں ۔۔۔ کسقدر بیقرار ہے کوئی
یہ بناوٹ کی ہے ہنسی، ورنہ ۔۔۔ غم کا آئینہ دار ہے کوئی
ہاں نہ چھیڑ، اے نسیم صبح! نہ چھیڑ ۔۔۔ آج خود اشکبار ہے کوئی
اور کا اس جہاں میں ذکر تو کیا ۔۔۔ اپنی ہستی پہ بار ہے کوئی
بنکے دیوانہ، کیا تماشہ ہے! ۔۔۔ رونق کوئے یار ہے کوئی
پارۂ برق و پارۂ سیماب ۔۔۔ دل سے بے اختیار ہے کوئی

اے وسیم! اہلِ دل ہیں قدر شناس
یوں تو مٹ کر غبار ہے کوئی!

ہوائی چھاتے (پیراشوٹ)

سید محتشم حسین زیدی (پائلٹ)

محتشم صاحب ایک اچھے ہواباز ہیں۔ اور ساتھ ہی مضمون نگار بھی۔ ہم آپکی قلمی معاونت کے ممنون ہیں۔ ہندوستان میں ابھی یہ موضوع بالکل نیا ہے اور خاصکر اردو میں تو ابھی ہوابازی پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون ہمارے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ ثابت ہوگا۔ اگلے صفحہ پر آپکی تصویر بھی شائع کی جارہی ہے —— مدیر

آج کل بیاہ برات میں اکثر رنگ برنگ کے غبارے آسمان پر اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ان جہازوں کی ابتدائی درجہ بدرجہ ترقی اور اس ترقی کے موجودہ نتائج پر غور کرتے ہوں گے۔ کون اس بات پر دھیان دیتا ہے کہ یہی غبارے ترقی کرکے ہوائی جہاز بن گئے ہیں۔ آج کل اگر ان غباروں کو زمین سے اٹھتے وقت دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں روشنی جلائی جاتی ہے جس کی وجہ سے گیس پیدا ہوتی ہے اور جب گیس غبارے میں بھر جاتی ہے تو وہ اس کے زور میں اوپر اٹھنے لگتا ہے۔ ہوائی جہاز کی ایجاد سے پہلے لوگ انہی غباروں میں اڑتے تھے اور اترنے کے لئے بڑے بڑے چھاتے (پیراشوٹ) استعمال ہوتے تھے۔

پیراشوٹ کا خیال اگرچہ بہت پرانا ہے اور یورپ کے پرانے قصوں اور ایشیا کی مشہور کہانیوں اور داستانوں میں بھی اسکا ذکر ملتا ہے لیکن اٹھارھویں صدی سے ختم تک اس کا استعمال صرف یہیں تک محدود تھا کہ آدمی کسی اونچی عمارت مینار یا پل پر چڑھ جاتا اور وہاں سے بڑے بڑے چھاتے لیکر پھاند پڑتا۔ ایک طرف زمین کی کشش اسے اپنے طرف کھینچتی اور دوسری طرف نیچے سے اوپر اٹھتی ہوئی ہوا چھاتے اور اس کے ساتھ اس آدمی کو جدا سے لئے یا باندھے ہوتا ہے اوپر لیجانے کی کوشش کرتی۔ چونکہ آدمی کا وزن اور زمین کی کشش میں ہوا سے زیادہ طاقت ہوتی ہے اس لئے آدمی نیچے ہی کی طرف آتا ہے چھاتے میں بھری ہوئی ہوا ایک طرف سے بریک کا کام کرتی اور اس لیے وہ ایک دم سے گرنے کے بجائے آہستہ آہستہ اترتا ہے

سب سے پہلے ۱۷۹۷ء میں فرانس اینڈری گارنرین نامی ایک شخص چھاتے کی مدد سے ایک غبارہ سے پھاندا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے انگلستان آکر اپنے کرتب کا مظاہرہ کیا۔ گارنرین نے اپنے ابتدائی تجربوں میں جو چھاتے استعمال کئے اسمیں چوٹی پر ایک سوراخ

ہوتا تھا کہ اترتے وقت آدمی ہچکولے نہ کھائے لیکن بعد کو اس نے سوراخ کرنا چھوڑ دیا۔ مگر اس کے بہت دنوں بعد ہوا بازوں کے تجربے نے سوراخ کی اہمیت دوبارہ ثابت کر دی اور پرانا طریقہ پھر رائج ہو گیا۔ گارنرین کے زمانہ میں چھاتے غباروں میں لگے رہتے تھے ۱۸۰۸ء میں ان کو الگ رکھکر بھی تجربہ کیا گیا۔

ان تجربہ کرنے والوں میں میجر تامس بالڈون نامی ایک امریکن کا نام بہت مشہور ہے اسی نے سوراخ والے چھاتوں کو رائج کیا ایک دفعہ بالڈون اپنے کرتب کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک غبارہ سے چھاتا لے کر کودا۔ ہوا چھاتے کے اندر بھر گئی اور جب اسے اوپر نکاسی نہیں ملی تو چھاتا ہچکولے کھانے لگا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی جناتک کے جھولے پر بیٹھکر پینگ لیتا ہے۔ اس سے بالڈون کو پتہ چلا کہ اگر ہوا کو نکاسی کے لئے راستہ مل جائے تو یہ ہچکولے کم ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ گارنرین کے پرانے طریقے پر کاربند ہو گیا۔

ہوائی جہازوں کی ایجاد کے بعد سے اگرچہ پرواز آسان ہو گئی مگر چھتری بازوں کے لیے ہوائی جہاز سے اترنا بہت مشکل تھا لیکن متعدد تجربوں کے بعد لوگوں نے اس کی بھی صورت نکال لی۔ سب سے پہلا کامیاب تجربہ لیسلی۔ ایل۔ ارون نامی ایک شخص نے ۱۹۱۹ء میں کیا۔ اس نے اپنا چھاتا لپیٹ کر دوا۔ واضح رہے کہ ان چھاتوں میں ہماری دھوپ اور پانی سے بچانے والی چھتریوں کی طرح دستہ اور تیلیاں وغیرہ نہیں ہوتیں بلکہ صرف ایک بڑا سا اور بہت مضبوط کپڑا اور اتنی ہی مضبوط ڈوریاں ہوتی ہیں جن کی مدد سے وہ کپڑا پیراشوٹ آدمی کے بدن پر باندھ دیا جاتا ہے) ایک بورے میں کر کے ہوائی جہاز پر رکھ لیا اور ایک ڈوری سے اسے اپنے بدن کے ساتھ باندھ لیا۔ جب وہ ہوائی جہاز پر سے پھاندا تو اس کا چھاتا بورے میں سے نکل کر ہوا میں پھیل گیا۔ انگلستان میں سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں ولیم نیول نامی ایک شخص چھاتے کی مدد سے ہوائی جہاز سے اترا تھا۔ اس پرانے طریقہ میں اب ایک جدید اصلاح یہ ہوئی ہے کہ جب آدمی ہوائی جہاز سے پھاندتا ہے تو تھوڑی دور تک اس کا چھاتا نہیں کھلتا بلکہ ایک اس سے چھوٹا چھاتا نکلتا ہے جو تھوڑی دور پہنچکر اپنے کھنچاؤ سے بڑے چھاتے کو بھی کھول دیتا ہے۔ اس طرح اس بات کا کوئی خطرہ نہیں رہتا کہ چھاتا ہوائی جہاز سے پھنس جائیگا۔ جو چھاتے باز زیادہ ماہر ہوتے ہیں وہ بہت دور تک بغیر چھاتا کھولے چلے آتے ہیں اور جب زمین سے ہزار فٹ کے قریب رہ جاتے ہیں تب چھاتا کھول دیتے ہیں۔

چھاتے کی مدد سے پھاندنا اور زمین پر صحیح وسلامت پہنچ جانا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر اترتے وقت بدن کا توازن ذرا بھی بگڑ جائے یا پہلو ذرا بھی غلط ہو جائے تو سخت سے سخت چوٹ آجانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اکثر اوقات ہوا باز زندگی بھر کے لیے بیکار ہو جاتا ہے اسی لیے اس فن میں ٹریننگ پر خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ روس اور جرمنی میں چھاتے بازوں کی ٹریننگ کا بہت اچھا انتظام ہے اور ان ہی دونوں ملکوں نے اس

فن میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ روس کے بنئے سوویٹ نظام میں اس کو صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ملکی حفاظت اور فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے بھی اس سے کام لیا گیا ہے۔ جرمنی نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے۔ اس کا نمونہ تو ہمیں موجودہ لڑائی ہی میں دکھائی دے رہا ہے۔ روس میں خاص طور پر اس فن کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ وہاں کے ایک شہر لینن گراڈ میں ایک پبلک پارک میں نوجوانوں کو اس طرف رجوع کرنے کے لیے عام مظاہرے کئے جاتے ہیں اور ایک جدید ترین مشین کی مدد سے کام بھی سکھایا جاتا ہے۔ اس مشین میں پنکھے لگے ہیں جو بہت تیزی سے اوپر کی طرف ہوا پھینکتے ہیں۔ تیلی چھاتے باز ایک آگے کی طرف نکلے ہوئے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا ہے۔ نیچے مشین چلتی ہے اور ہوا باز ہوا کے زور سے ایک دم ڈھائی سو فیٹ اونچا چلا جاتا ہے۔ وہاں سے وہ ہوا میں پیرتا ہوا آہستہ آہستہ اترتا ہے۔

پچھلی جنگ عظیم میں اس فن کا کوئی خاص مظاہرہ نہیں ہوا تھا۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ یہ کام لیا جاتا تھا کہ خندقوں میں پھنسی ہوئی سپاہ کو رسد یا معمولی سا جنگی سامان پہنچا دیا جائے۔ اور اس کے بعد بھی ۱۹۳۵ء تک ہوا باز پیراشوٹ کو ہوائی جہاز خراب ہو جانے پر صرف اپنی جان بچانے کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن اس کے برخلاف آجکل کی لڑائی میں پیراشوٹ کا یہ استعمال بہت محدود ہے اس لیے کہ جنگی ہوائی جہازوں کی مشینیں اتنی اچھی اور اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ ان کے خراب ہونے کا امکان ہی نہیں ہوتا اور ہوائی جہاز شکن توپ یا جنگی ہوائی جہاز کی مشین گن کی گولی کھا کر ہوا باز کے ہوا س ہی اتنے باختہ ہو جاتے ہیں کہ اسے پیراشوٹ کھولنے اور پہننے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن اس کے علاوہ پیراشوٹ کے استعمال کی اور بھی بہت سی نئی نئی ترکیبیں نکل آئی ہیں مثلاً اکثر اس کی مدد سے ہلکی ہلکی توپیں اور مشین گنیں میدان جنگ میں اتار دی جاتی ہیں۔ اور اگر پیراشوٹ غیر معمولی طور پر مضبوط اور بڑا ہو تو چھوٹے چھوٹے ٹینک بھی اتارے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیراشوٹ کا ایک جدید ترین استعمال یہ ہے کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے پیراشوٹ جنہیں ڈوری کی جگہ تار لگا ہوتا ہے ایک بڑے سے گولے میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور گولا اوپر پھینکا جاتا ہے جہاں اس کے پھٹنے پر اندر سے چھوٹے چھوٹے پیراشوٹ نکل پڑتے ہیں اور ہوا میں تیرنے لگتے ہیں۔ ان سے ہوائی جہازوں کے بچ کر نکلنے میں مدد ملتی ہے اس لئے کہ ان کا تار ہوائی جہاز میں پھنس کر اس کو بیکار کر دیتا ہے۔

پیراشوٹ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز استعمال جرمنی نے کیا ہے۔ وہ ۱۹۳۵ء ہی سے اپنی چھتری باز فوج تیار کر رہا تھا۔ شروع میں نازیوں کے جاسوسی ہوائی دستے میں صرف ایک بٹالین چھتری بازوں کی بنائی گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ تعداد بڑھتی گئی اور اب کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس چھتری بازوں کا ایک پورا ڈویژن یعنی تین رجمنٹ موجود ہیں۔ چھاتے بازوں کے زیادہ تر

دو کام ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اچانک پہنچ کر دشمن کے ہوائی مستقر پر قبضہ کر لیتے ہیں تاکہ پیچھے سے باربردار ہوائی جہاز پیادہ فوج لاکر اتار سکیں۔ اٹلی نے البانیہ اور جرمنی نے ناروے اور ہالینڈ میں یہی ترکیب چلی۔ ان کا دوسرا اور بہت بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے ملک میں جاکر بے ترتیبی پھیلا دیتے ہیں اور دشمن کی فوج کو رسد اور سامان جنگ پہنچنے کے راستے بند کر دیتے ہیں۔ ہالینڈ، ڈنمارک اور ناروے میں جرمنی اسکا بھی مظاہرہ کر چکا ہے۔

چھتری باز کو جس ملک میں جانا ہوتا ہے اسے اس کے مخصوص ہتھیاروں کا استعمال، وہاں کی زبان، طرز معاشرت اور تفصیلی جغرافیہ بھی سکھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اترتے ہی ہر چیز سے پوری طرح مانوس ہو جاتا ہے۔ ہالینڈ پر جرمنی کے اتنی جلد قبضہ کر لینے کا سہرا در اصل اس کی چھتری باز دستوں کے سر ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے پہلے سے پہنچکر جرمن جاسوسوں اور اپنے خفیہ کارندوں سے مل کر ملک میں ایک عام بے چینی پھیلا دی اور وہاں کے سمندری بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر ہے اگر ان ہوابازوں کو ہالینڈ کے جغرافیہ میں اچھی مہارت نہ ہوتی تو وہ اتنی جلدی سمندری بندھوں کو بیکار نہیں کر سکتے تھے۔

دوڑنے بھاگنے کے لئے چھتری باز المونیم کی بنی ہوئی ہلکی اور تورٹ کی بائیسکل لے جاتا ہے ایک موٹر سائیکل بھی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ وہ پوری طرح مسلح ہوتا ہے اور پستول اور خنجر کے علاوہ اکثر چھوٹی مشین گن بھی لیکر اترتا ہے۔

پیراشوٹ کو نوع انسان کے فلاح اور بھلائی کے کاموں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کہیں کہیں استعمال کیا بھی جاتا ہے مثلاً روس میں اسکے مدد سے دور دراز کی جنگلی اور دشوار گذار بستیوں میں جہاں آمد و رفت کے کوئی ذرایع نہیں ہیں طبی امداد پہنچائی جاتی ہے لیکن آجکل کی دنیا میں جبکہ پاگل حکمران اپنی لوٹ کھسوٹ کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کی فکر میں دنیا کی ہر چیز اور ساری دولت کو اپنے نجی فائدے کی خاطر صینٹ کر دینے کو تیار ہیں اس قسم کی باتیں محض خواب و خیال ہیں۔

شعاع امید

کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو زبردست نغمہ گونج رہا ہے اسے آج میرے بربطِ دل پر بجانے کی سعی کیوں مشغول ہو؟
کیا میرے بربطِ دل کے تار اس زبردست نغمہ کے متحمل ہو سکیں گے؟
اے نادان! اس کا بھی تو خیال کیا ہوتا —— !
لیکن ان تاروں کو توڑ کر پھینک دوں! یہ بھی تو میرے نازک دل سے ممکن نہیں —! کیونکہ ابھی یہ امید زائل نہیں ہوئی ہے کہ دنیا میں میری یہ منتشر پنکھڑیاں بہار لانے میں کامیاب ہوں گی —— !!

ماہ طلعت بنارس — ترجمہ ٹیگور۔

نقوشِ ماضی

آمنہ نسیم

مجھے آجتک یاد ہے وہ زمانہ
گذرتی تھی جب زندگی والہانہ

فضاؤں میں رقصاں مسرت کی لہریں
محبت میں ڈوبا ہوا تھا زمانہ

ہراک بات تھی دلنوازی کے شایاں
ہراک فکر تھی نکتۂ شاعرانہ

ہراک ذوقِ باطن ہراک شوقِ پنہاں
وفا کی حقیقت ۔ جنوں کا فسانہ

نظر روحِ سرشار کا اک تبسم
نفس بربطِ عشق کا اک ترانہ

منانا کہوں یا بگڑنا کہوں میں
خفا ہو کے وہ دردِ سر کا بہانہ

کبھی نرم لہجوں میں رنگیں شکایت
کبھی دشمنی میں کرم کا فسانہ

کبھی شوخ و رنگیں جوانی کی باتیں
مذاقِ محبت کبھی عارفانہ

کبھی روح پرور ادائیں تمھاری
کبھی برہمی تھی سخن گسترانہ

تغافل کے پردے میں دل کی لگاوٹ
تجاہل۔ محبت کا رنگیں بہانہ

مگر اب وہ پرکیف باتیں نہیں ہیں
وہ دن اب نہیں ہیں۔ وہ راتیں نہیں ہیں

زینت

اختر انصاری

محبت ایک خواب ہے رنگین، پرکیف اور دلآویز!

ہم محبت کرتے ہیں تو کس کس طرح اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں! تخیلات کے محل بناتے ہیں۔ تصورات کی جنتیں تعمیر کرتے ہیں۔ ایک نئی دنیا بساتے ہیں۔ ایسی دنیا جو حقیقت اور واقعیت سے دور ہوتی ہے۔ ہماری اصل زندگی کے مکروہات اور معمولات سے بہت پرے! ایسی دنیا جس میں غم روزگار کی کثافتیں بار نہیں پاتیں، جہاں محبت اور محبت کی حلاوتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر ہے۔ گرم، سنسان اور طویل! وقت ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا۔ چائے پی رہا ہوں اور رومال سے پسینہ خشک کرتا جاتا ہوں کسی فلمی گانے کا ایک بول زبان پر ہے۔ دھیمے دھیمے سروں میں الاپ رہا ہوں۔ یکایک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے، اور نعیم صاحب مسکراتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔

یہ میرے نئے دوست ہیں۔ پڑوس میں جو ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اُن کے چھوٹے بھائی۔ علیگڈھ میں قانون پڑھتے ہیں اور آج کل گرمیوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے ہیں۔

"آئیے نعیم صاحب! تشریف لائیے۔ چائے پیجئے — ارے عنایت! ایک پیالی اور لاؤ۔"

"جی نہیں، میں چائے نہیں پیوں گا" نعیم صاحب کہتے ہیں، "میں تو آپ کا گانا سننے کی غرض سے آیا ہوں"

"گانا؟ میں گانا کب جانتا ہوں؟" میں حیرت کے ساتھ سوال کرتا ہوں۔

"اور یہ ابھی کون گا رہا تھا؟ میں بہت دیر سے آپکے گانے کی آواز سن رہا تھا۔ آپ تو اکثر گایا کرتے ہیں"

"آپ اس کو گانا کہتے ہیں؟" میں ہنسکر جواب دیتا ہوں' "مجھے تو صرف گنگنانا آتا ہے۔ ایک عادت سی ہوگئی ہے، ہر وقت گنگنایا کرتا ہوں"

"خیر وہ گنگنانا ہو یا گانا، آواز آپ کی بہت خوب ہے"۔ نعیم صاحب کہتے ہیں۔

میں اُن کی تعریف کو نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیتا ہوں، "اصل میں مجھے تنہائی بہت ستاتی ہے۔ اور تنہائی کا علاج میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ سگرٹ پیتا رہوں یا گنگناتا رہوں"۔

نعیم صاحب کی آنکھیں جھکنے لگتی ہیں، اور وہ ہوشیار اور مستعد ہو کر فرماتے ہیں "تنہائی کا جو اصلی علاج ہے وہ آپ کیوں نہیں کرتے"؟

"وہ کیا؟"

"شادی" وہ یوں مسکرا کر کہتے ہیں گویا کوئی بہت ہی شوخی آمیز بات کہہ رہے ہوں، "تنہائی کی مصیبت سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہے شادی!"

میں بھی اس طرح مسکراتا ہوں گویا انکی بات سنکر بہت محظوظ ہوا ہوں۔

"ہاں، بات تو صحیح ہے"، میں جواب دیتا ہوں، "مگر میں فی الحال شادی نہیں کر سکتا"۔

"کیوں؟ کیا تامل ہے"؟

"تامل یہی ہے کہ میں ابھی روزگار کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میری پریکٹس ابھی ایسی نہیں ہے کہ ......"

نعیم صاحب زور سے ہنستے ہیں "جہاں تک میں نے دیکھا ہے وکیل لوگ اپنی آمدنی بڑھا چڑھا کر بتایا کرتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے آپ کی روش بالکل اسکے برعکس ہے۔ آپ ......"

"نہیں، یہ بات ہرگز نہیں"، میں جواب دیتا ہوں، "میری آمدنی فی الحقیقت اتنی معمولی ہے کہ خود میرے اخراجات کے لیے بمشکل کافی ہوتی ہے"

نعیم صاحب پھر ہنستے ہیں، اور کہتے ہیں، "یہ محض آپکا خیال ہے وکیل صاحب! آپ کی پریکٹس بہت اچھی ہے اور آپ یقیناً ایک بیوی کا بار اُٹھا سکتے ہیں"۔

"بار تو بیشک اٹھا سکتا ہوں۔ اور بار جب پڑتا ہے اٹھایا ہی جاتا ہے مگر میرا مطلب یہ ہے کہ ... یعنی ... ازدواجی زندگی کا جو معیار میرے ذہن میں ہے میں سمجھتا ہوں اس کے مطابق میں زندگی بسر نہ کر سکونگا"

"تو اس کے معنی ہیں کہ آپ نے ازدواجی زندگی کا جو معیار قائم کیا ہے وہ بہت ہی بلند ہے"۔

"ممکن ہے بلند ہو — ضرورت سے زیادہ بلند! مگر فی الحال میں شادی کے مسئلے پر اسی طرح غور کیا کرتا ہوں"

شام کا وقت ہے۔ میں اپنے پڑوسی، ڈاکٹر صاحب سے بحیثیت ایک پڑوسی کے ملنے آیا ہوں۔ پُرتکلف ڈرائنگ روم ہے، ڈاکٹر صاحب ہیں، اُن کے چھوٹے بھائی نعیم ہیں، اور میں ہوں۔ ریڈیو کی دلنواز موسیقی کمرے میں گونج رہی ہے — دہلی سے مس چٹرجی کا گانا نشر ہو رہا ہے۔

تھوڑی دیر میں گانا ختم ہوتا ہے، اور اعلان کیا جاتا ہے،

"..... اب مسز رفعت علی تقریر فرمائیں گی۔ تقریر کا موضوع ہے — ہندوستانی سماج میں عورت کا درجہ!"

اعلان سنتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

"نعیم ذرا زینت کو بلا لو۔ وہ اس تقریر کو سننا چاہتی تھی"

نعیم صاحب میری طرف دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اُن کا مطلب سمجھ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں "بلا لو، کیا ہرج

ہے، وکیل صاحب تو اپنے ہی آدمی ہیں؟"

نیم صاحب اٹھکر اندر چلے جاتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں "یہ پردہ بھی کتنی مہمل چیز ہے۔ لاحول ولا قوۃ"!

میں خاموش رہتا ہوں اور کوئی جواب نہیں دیتا۔ مسز رؤف علی اپنی تقریر شروع کرچکی ہیں۔ اُدھر کان لگادیتا ہوں۔

ایک لمحہ کے بعد نعیم صاحب واپس آکر اپنی کرسی پہ بیٹھ جاتے ہیں۔ اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے پیچھے کوئی اور بھی آیا ہے۔ ایک اُچٹتی ہوئی اور بے پروا نظر زینت پر ڈالتا ہوں، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کسی عورت کا کمرے میں اچانک آجانا میرے لئے سراسیمگی کا باعث نہیں ہوتا، اور یہ کہ زینت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، نہ ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد تقریر سننے میں محو ہوجاتا ہوں، یعنی یہ ظاہر کرتا ہوں کہ تقریر سننے میں محو ہوں۔ جب مسز رؤف علی کوئی ہنسنے کی بات کہتی ہیں تو مسکرا کر ڈاکٹر صاحب، یا نعیم صاحب کی طرف دیکھتا ہوں۔ زینت کی طرف بالکل نہیں دیکھتا، گویا اُس کی موجودگی سے قطعی بے خبر ہوں۔ مگر یہ سب کچھ دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک پیکر ناز و زیبائی کے قرب کا احساس جیسا کچھ ایک نوجوان کے دل میں ہونا چاہئے میرے دل میں بھی ہے۔ مجھے اس وقت دنیا ایک حسین تر اور رنگین تر جگہ معلوم ہو رہی ہے۔ روح کی گہرائیوں میں کوئی چیز کروٹ لیکر بیدار ہو رہی ہے۔ کان اگرچہ مسز رؤف علی کی آواز پر لگے ہوتے ہیں، لیکن ذہن اُن کے بیشتر الفاظ کو معنی کا جامہ پہنانے سے انکار کر رہا ہے۔ وہ یہ بتا رہی ہیں کہ ہندوستانی سماج میں عورت کا کیا درجہ ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے دل میں عورت کی کتنی محبت ہے اور ہوسکتی ہے۔

تقریر ختم ہوجاتی ہے۔

"اچھی تقریر ہے"، ڈاکٹر صاحب تبصرہ فرماتے ہیں۔

"جی ہاں، خوب ہے" میں اُن کی رائے سے اتفاق کا اظہار کرتا ہوں۔

"کہو زینت! تمھاری کیا رائے ہے"؟ ڈاکٹر صاحب اپنی لڑکی سے پوچھتے ہیں۔

وہ جواب میں صرف نظریں جھکاکر مسکراتی ہے لیکن مجھے اُس پر ایک بھرپور نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے، اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ ایک ہی نظر میں اُس کے حسن کی تمام رنگینیوں کو سمیٹ لیتا ہوں، اور پھر کمال بے نیازی سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوجاتا ہوں۔

مسز رؤف علی کی تقریر کے بعد موسیقی کا پروگرام پھر شروع ہوگیا ہے۔ کوئی پیشہ ور مغنی اپنے فن کے اظہار میں گلے کا سارا زور صرف کر رہا ہے۔ ہم یعنی ڈاکٹر صاحب، نعیم صاحب اور میں، متفقہ طور پر فیصلہ کرتے ہیں کہ ریڈیو بند کردیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ کمرے میں یک لخت سکون ہوجاتا ہے، ایسا سکون جو اکثر ریلوے اسٹیشن پر گاڑی گزر جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے

"اچھا بیٹی، تو تم اب جاؤ۔" ڈاکٹر صاحب زینت سے کہتے ہیں۔

وہ خاموشی سے اٹھکر چلی جاتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کمرے میں شام ہو گئی۔

آج میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں شب کے کھانے پر مدعو ہوں۔

ڈاکٹر صاحب ایک تیسرے شخص کے ذریعے مجھے اپنی فرزندی میں لینے کی خواہش ظاہر کر چکے ہیں۔ میں نے اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی ہے لیکن کوئی مایوس کن جواب بھی نہیں دیا ہے۔ میں آجکل اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مجھے محظوظ کرنے اور اپنی محبت و شفقت جتانے کے لیے ہر ممکن ذریعے سے کام لے رہے ہیں۔ آج کا ڈنر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کھانے کی میز پر ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب کی بیگم، اور نعیم صاحب کے علاوہ زینت بھی موجود ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھی ہے اس کی نظریں اس طرح جھکی ہوئی ہیں گویا اس نے مجھے دیکھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں بھی اس کو بیباکانہ دیکھنے سے اجتناب کر رہا ہوں۔ مگر موقع پاتا ہوں۔ تو دیکھ ہی لیتا ہوں۔ اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیتا ہوں۔ وہ میری گرمیٔ نگاہ کو محسوس کرتی ہے اور اسکے حسن میں شرمگینی کی ایک اور جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بچی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ سب بیک وقت اس سے مخاطب ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگتے ہیں۔

"اب تک تم کہاں تھیں شوکت؟"

"تم نے کھانا کھا لیا بیٹی؟"

"اور کھاؤ گی؟"

"یہ پھل رکھے ہیں، لو گی؟"

میں یہ دیکھ کر کہ سب کی توجہ شوکت کی طرف ہے، خود زینت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ بریانی کی ایک قاب میز کے بیچ میں، میرے اور اس کے درمیان رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس میں سے بریانی لے رہی ہے۔ میں قاب کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہوں اور چمچا اس کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ شرم کی سرخی سے اس کا چہرہ گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔

"ذرا وہ چمچہ دیجئے۔" میں سنجیدہ منہ بنا کر اس سے کہتا ہوں۔

وہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ چمچہ میری جانب بڑھا دیتی ہے۔

"آپ نے یہ نہیں لیا۔" ڈاکٹر صاحب ایک مخصوص کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہتے ہیں "یہ زینت کا تیار کیا ہوا ہے۔ اِن کے سوا ہمارے ہاں اس چیز کو اور کوئی نہیں پکا سکتا۔"

"اچھا! بہت خوب" میں جواب دیتا ہوں "تو ان کو وقت مل جاتا ہے ان کاموں کے لیے بھی؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، "لکھنے پڑھنے سے جو وقت بچتا ہے وہ انھیں کاموں میں

صرف ہوتا ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں وکیل صاحب! جو اپنی لڑکیوں کو گھر کے کام کاج سے بالکل بے بہرہ رکھتے ہیں بلکہ تو یہ ہے کہ لڑکی تعلیم بھی حاصل کرے اور گھر کے کام میں بھی ماہر ہو۔ اب یہ زینت ہی! ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہیں اور کھانے پکانے، سینے پرونے میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی بیگم اپنے شوہر کی بات کاٹ دیتی ہیں، اور زینت کے خانگی کمالات پر روشنی ڈالنے لگتی ہیں۔ نعیم صاحب حتی الامکان اُن کی مدد کرتے ہیں۔ جب یہ دونوں بول چکتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب دوبارہ اپنے خیالات کا اظہار شروع کرتے ہیں۔ غرضیکہ زینت کی خوبیوں کا بیان مسلسل جاری رہتا ہے

میں سب کچھ سنتا ہوں اور تحسین آمیز نظروں سے بار بار زینت کو دیکھتا ہوں۔ اُس کی صندلی پلوں کا حسن میری نظروں میں کُھبا جا رہا ہے۔

"اچھا بتاؤ تم نے آپا سے وہ بات کہہ دی تھی؟" میں شوکت سے سوال کرتا ہوں۔

وہ مسکراتی ہے اور سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتی ہے۔

"کیا کہا تھا؟"

وہ خاموش رہتی ہے اور شرما کر سر جھکا لیتی ہے میں ایک ہاتھ اُس کے شانہ پر رکھتا ہوں اور دوسرے ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا چہرہ اوپر اٹھاتا ہوں۔ "کیوں بتاؤ شوکت! کیا کہا تھا تم نے اپنی آپا سے؟"

"ہم نے کہا تھا۔۔۔" وہ پھر شرما کر رہ جاتی ہے۔

"ہاں کیا کہا تھا؟"

"ہم نے کہا تھا کہ وکیل صاحب نے کہا ہے کہ ہم تمہیں پڑھانے آیا کریں۔"

"تم نے کہا تھا ہی؟" میں شوق بھرے لہجے میں اس سے پوچھتا ہوں۔

"ہاں۔" وہ جواب دیتی ہے۔

"سچ کہتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ پھر جواب دیتی ہے۔

"اچھا پھر کیا کہا تمہاری آپا نے یہ سُن کر؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو کہا ہی ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں کہا۔"

"تو اس کے معنی ہیں کہ تم نے ہماری بات کہی ہی نہیں اپنی آپا سے۔"

"کہی تو تھی۔" وہ قدرے برہم ہو کر جواب دیتی ہے۔

میں فرطِ خوشی سے اُس کو گود میں اٹھا لیتا ہوں اور اُس کی پیشانی چومتا ہوں۔

برسات کے موسم کی ایک شام ہے، اور میری ازدواجی زندگی کی صبح!

ہم دونوں ۔۔۔ میں اور زینت ۔۔۔ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو رہے ہیں۔ ہمارے سفر کی ابتداء ایک سفر سے ہوتی ہے ہم اپنا ماہِ عسل گزارنے کے لئے پہاڑ پر جا رہے ہیں۔

انجن سیٹی دیتا ہے گاڑی چھوٹتی ہے اور آن کی آن میں اسٹیشن سے نکل جاتی ہے [illegible] الوداع کہنے والے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

ریل کا ڈبہ ہے۔ زینت ہے اور میں ہوں!

اس وقت میری ساری زندگی سمٹ کر زینت میں مرکوز ہو گئی ہے۔ میں اُس کے برابر بیٹھ جاتا ہوں، اور اسکا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ باتوں کا سلسلہ شروع کرتا ہوں جو سفر کے آخر تک قائم رہتا ہے

ہم نینی تال کی سرد اور پرسکون بلندیوں پر مقیم ہیں۔ مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ میرا پرانا دوست اور بچپن کا ساتھی زبیر بھی آجکل یہیں ہے۔ میں اُس سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

ایک دن فون پر اُس سے گفتگو ہوتی ہے۔ وہ نینی تال میں میری موجودگی کی خبر سنکر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے "مجھ سے فوراً آکر ملو، یا اپنا پتہ بتاؤ کہ میں آسکوں"

میں جواب دیتا ہوں "نہیں میں خود تم سے آج سہ پہر کو ملوں گا اور تمھارے ساتھ چائے پیونگا۔ اور ہاں — ایک بات اور ہے، میری بیوی بھی میرے ساتھ ہوں گی"۔

"اچھا" زبیر چلا اُٹھتا ہے "یہ کب سے ؟ گویا چپ چاپ شادی کر لی اور ہمیں خبر بھی نہ کی"

"اب یہ سب باتیں ملاقات کے وقت ہونگی" میں جواب دیتا ہوں۔

"ٹھیک بات ہے۔ تو آج چار بجے آؤ۔ میں انتظار کروں گا"

سہ پہر کے قریب ہم زبیر سے ملنے کے لئے روانہ ہوتے ہیں

میں دل ہی دل میں یہ سوچکر خوش ہو رہا ہوں کہ زبیر میری [illegible] مرعوب ہوگا۔ وہ تو شاید یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اسکی بیوی ہوگی۔ کوئی برقع میں لپٹی لپٹائی عورت جو ایک گٹھری کی طرح لڑھکتی پھڑکتی، میری طرف دیکھے بغیر گھر میں گھس جائیگی اور بیگم صاحبہ کے پاس جا بیٹھے گی۔ مگر بچارے کے ہوش ٹھکانے آجائینگے جب وہ دیکھیں گے کہ یہ تو ایک تعلیم یافتہ عورت ہے بیسویں صدی کی ایک مہذب خاتون!

ہم زبیر کے مکان پر پہنچتے ہیں۔ وہ زینت کو دیکھکر واقعی گھبرا سا جاتا ہے۔ یقیناً وہ ایسی ملاقات کے لئے تیار نہ تھا۔

"میری شریکِ حیات زینت" میں زبیر سے اپنی بیوی کا تعارف کراتا ہوں۔

وہ بدحواس ہو جاتا ہے۔ میں اُس کی سراسیمگی سے بے انتہا لطف حاصل کرتا ہوں۔

بلدے وہ اپنے آپکو سنبھالتا ہے، اور دو چار لفظوں میں اپنی مسرت کا رسمی اظہار کرتا ہے۔ اسکے بعد ہم اسکے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں۔

یہ وہ خواب ہیں جو میں شب و روز دیکھا کرتا ہوں

جی ہاں، یہ سب خواب ہیں۔

اور حقیقت ؟

حقیقت صرف اسقدر ہے کہ میں نے زینت کو یعنی اُس لڑکی کو جسکا نام میں نے زینت رکھدیا ہے — دو تین مرتبہ موٹر سے اُترتے یا موٹر پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

اُف جوانی کی خود فریبیاں اور محبت کی فریبکاریاں !

فردوسِ محبت

نذیر احمد — نذیر

خیالِ محبت میں کچھ غم نہیں ہے
جو سب کا ہے وہ میرا عالم نہیں ہے
مرے دل کی دنیا میں ماتم نہیں ہے
مرا غم مسرت سے کچھ کم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

مرے آنسوؤں میں ہے اُن کا تبسم
نگاہوں میں رقصاں ہیں مہتاب و انجم
یہ شیریں بیانی - یہ رنگیں تکلم
یہاں دکھ نہیں ہے. یہاں غم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

تصور میں راتوں کو آتا ہے کوئی
بصد ناز یوں مسکراتا ہے کوئی
کہ ہر اک غم بھول جاتا ہے کوئی
یہاں آرزوؤں کا ماتم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

وہ الفت کہ جس میں ہے رونا جفا کا
جہاں زندگی ہے فسانہ ریا کا
جہاں کوئی پرساں نہیں ہے وفا کا
وہ رشتہ محبت کا محکم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

نرالا ہے عالم مری چشمِ تر کا
مجھے دل کا رونا نہ رونا جگر کا
کرم چاہتا ہوں بس اُن کی نظر کا
مرا زخم محتاج مرہم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

نہیں کرتے شکوہ محبت کے بندے
ذرا شکر بھی او شکایت کے بندے
یہی کرتے آئے ہیں الفت کے بندے
نہیں ہے ارے ابنِ آدم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

لیان ٹراٹسکی!

حبیب الرحمن بی۔اے

۲۲ر اگست ۱۹۴۰ء کو میکسیکو سے یہ خبر آئی ہے کہ ٹراٹسکی پر ایک یہودی نے ہتھوڑے سے حملہ کیا۔ زخم اس قدر کاری لگا کہ وہ اس سے جاں بر نہ ہو سکا۔ اور چند گھنٹوں میں اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ ٹراٹسکی کی موت انقلابی دنیا میں ایک ایسے دلچسپ اور رنگین باب کا خاتمہ ہے۔ جس کی شاید کوئی اور مثال نہ مل سکے۔

ٹراٹسکی ۱۸۷۹ء میں روس کے صوبہ اوڈیسا میں پیدا ہوا۔ اُس کے والدین متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور مذہبا یہودی تھے۔ اُس کا اصلی نام برانسٹین تھا۔ اُس کی تعلیم اوڈیسا کے اسکول اور یونیورسٹی ہی میں ہوئی۔ وہ بچپن ہی سے انتہائی منچلا اور ذہین واقع ہوا تھا۔ اسکول اور یونیورسٹی میں باوجود ایک اچھے طالب علم ہونے کے پروفیسروں سے اُس کی کبھی نہیں بنی۔ ابھی اُس کی تعلیم ختم نہ ہوئی تھی کہ روس میں بے چینی پھیلنا شروع ہو گئی۔ عوام زار روس اور عیاش نوابوں کے ظلم سے تنگ آ چکے تھے اور ایسی ظالم حکومت سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کرنا چاہتے تھے ٹراٹسکی اِن حالات سے بہت متاثر ہوا اور اُس نے حکومت کے خلاف سازشوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۸ء میں جب کہ اُس کی عمر ۱۹ سال کی تھی وہ سائبریا جلا وطن کر دیا گیا۔ مگر اُس کی بے چین فطرت نے اُسے نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ چار سال کی جلا وطنی کے بعد ۱۹۰۲ء میں وہ سائبریا سے بھاگ نکلا۔ اور ٹراٹسکی کے جعلی نام سے وہ انگلینڈ پہنچا۔ انگلستان میں پہلی مرتبہ وہ مشہور انقلابی لیڈر لینن سے ملا۔ اور اس کے ساتھ اِسکرا (چنگاری) نامی انقلابی اخبار میں کام کرتا رہا۔ اس زمانہ میں ٹراٹسکی کو یورپ کے بیشتر انقلابیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اُس نے اپنی حسنِ قابلیت سے اِن تمام لوگوں پر اپنی ذہانت و ذکاوت کا سکہ بٹھا دیا ۱۹۰۵ء میں وہ روس پھر واپس آیا۔ اس وقت روس میں انقلابی تحریک کافی طور پر نمایاں ہو چکی تھی ٹراٹسکی سینٹ پیٹرزبرگ میں مزدوروں کی مجلس کا صدر منتخب ہوا۔ اُس وقت تک ٹراٹسکی بالشویک پارٹی کے ساتھ نہ تھا۔ لیکن اُس کی ہمدردی بالشویک پارٹی سے زیادہ تھی۔ ۱۹۰۵ء کا انقلاب ناکامیاب رہا۔ ٹراٹسکی معہ کمیٹی کے گرفتار کر لیا گیا۔ اور دوسری مرتبہ سائبیریا بھیجدیا گیا۔ وہاں سے پھر ایک مرتبہ بھاگ کر

وہ ویانا پہنچا۔ وہاں پر وہ پراودا (جو آجکل روس میں کمیونسٹ پارٹی کا اخبار ہے) اور دوسرے انقلابی اخباروں میں ایڈیٹر یا نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں وہ نامہ نگار کے طور پر قسطنطنیہ گیا اور ۱۹۱۴ء میں وہ زیورچ اور پیرس کے مخالف انقلابی اخباروں کے لیے کام کرتا رہا۔ اسی زمانہ میں اس نے جنگ عظیم پر جرمن زبان میں ایک کتاب لکھی جس پر حکومت جرمنی نے اسے آٹھ ماہ کی سزا دے دی۔ سزا بھگتنے کے بعد وہ فرانس پہنچا۔ اور وہاں بھی جنگ کی مخالفت شروع کر دی جس کی وجہ سے وہ فرانس سے نکال دیا گیا۔ اب وہ بلا پاسپورٹ اسپین پہنچا وہاں کی گورنمنٹ نے اسے گرفتار کر لیا مگر اس کی درخواست پر اسکو امریکہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ امریکہ میں بھی اس نے اپنا انقلابی پروپیگنڈا جاری رکھا۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں جب کہ تمام روس انقلابی شعلوں سے بھڑک رہا تھا۔ ٹراٹسکی امریکہ سے روس کے لیے روانہ ہوا۔ مگر انگلینڈ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور روسی گورنمنٹ کی کافی کوششوں کے بعد اس کو رہائی ملی۔ وہ روس پہنچا اور انقلابی تحریک میں کافی زور و شور کے ساتھ حصہ لیتا رہا۔ مگر ابھی تک وہ بالشویک پارٹی کا ممبر نہ تھا۔ جولائی ۱۹۱۷ء میں وہ بالشویک پارٹی میں شامل ہوا۔ اور نہایت ہی سرگرمی کے ساتھ پارٹی کے نظام و قیام اور انقلابی تحریک میں حصہ لیتا رہا۔ سوویٹ گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد وہ وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ مگر اس کی پالیسی جرمنی سے معاہدہ بریسٹ لیٹوسک کے موقع پر ناکامیاب ثابت ہوئی۔ اس لیے وہ وہاں سے ہٹا کر وزیر جنگ مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنے زمانہ وزارت میں باوجود مخالفت نہایت قابلیت کے ساتھ سرخ افواج کو منظم کیا۔ پھر ریلوے لائن کو کافی ترقی دی۔ تاکہ افواج کو منتقل کرنے میں دقت نہ ہو۔

لینن کی زندگی میں ۱۹۲۴ء تک ٹراٹسکی سوویٹ روس کے لیے نہایت انہماک سے کام کرتا رہا۔ اس کی عالی دماغی۔ تدبر اور علمی قابلیت کی دھاک صرف روس ہی نہیں بلکہ تمام یورپ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر ۱۹۲۴ء میں لینن کی موت کے بعد ٹراٹسکی اور اسٹالن میں برسر اقتدار ہونے کی کشمکش شروع ہو گئی۔ پہلے کچھ اصولی اختلافات ضرور تھے۔ مگر ٹراٹسکی کو جب اپنی تنہا پسندی اور غرور کی وجہ سے شکست ہوئی۔ تو اس نے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اور اب وہ ہر بات کی مخالفت کرنے لگا۔ ۱۹۲۷ء میں اس کو کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا مگر اس کی ریشہ دوانیاں بڑھتی ہی گئیں۔ ۱۹۲۸ء میں اسے ورنی اور وہاں سے ۱۹۲۹ء میں قسطنطنیہ جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ تیسری بار جلاوطن کیا جا رہا تھا۔ مگر اس مرتبہ اسے وہ حکومت بن باس دے رہی تھی جس کو اس نے خود مضبوط بنایا تھا۔ ترکی حکومت نے اسے قسطنطنیہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ یورپ بھر میں سوائے ناروے کے اور کسی ملک -

ایسی خطرناک ہستی کو پناہ دینا منظور نہ کیا۔ مگر بلد ہے میں بھی وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا۔ اور سویٹ گورنمنٹ کی درخواست پر وہ ناروے سے [illegible] گیا۔ اس مرتبہ اُسے میکسیکو نے پناہ دی۔ جہاں وہ اپنی عمر کے آخری لمحوں تک رہا۔ اور اپنی عمر کا آخری حصّہ اُس انقلاب اور سویٹ روس کو کمزور بنانے میں صرف کیا۔ جس کو اُس نے خود اپنی زندگی کا بڑا حصّہ صرف کر کے طاقتور بنایا تھا۔ اُس نے تیسری انٹرنیشنل کے خلاف چوتھی انٹرنیشنل قائم کی۔ اور اُس کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ اُس کی تصانیف اُسکی قابلیت اور ذہانت کا نمونہ ہیں۔ ٹراٹسکی کی زندگی پر کئی حملے کئے گئے۔ جس کا نتیجہ۔ اس آخری حملہ کی شکل میں اُس کی موت ہوئی۔

بزمِ خیال

فضل الرحمن ندوی

ساقیٔ دلنواز دیکھ ابر بھی ہے بہار بھی
فکر نہ کر پلائے جا چھوڑ مآلِ کار بھی

میں بھی ہوں بزمِ عیش بھی دل بھی ہے حسنِ یار بھی
حاصل دید ہے مرا عالمِ انتظار بھی

دل کی تڑپ کے ساتھ ساتھ لذت خوشگوار بھی
تیرا خیال جاں نواز ہم نہیں ہے غمگسار بھی

لالہ و یاسمن کھلے پھول کھلے چمن کھلے
دل کی کلی نہ کھل سکی بیت گئی بہار بھی

میرے خدایہ آج پھر چھیڑا ہے کس نے سازِ غم
روح بھی ہے بکھر اُٹھی ہل گئے دل کے تار بھی

داستانِ زندگی!

نیرہ خاتون

گم ہوا ہے اس طرح کچھ کاروانِ زندگی
مر کے ہی شاید ملے اب تو نشانِ زندگی

کسقدر پر لطف تھی شرح بیانِ زندگی
سو گیا خود سننے والا داستانِ زندگی

سجدۂ دیر و حرم سے مجھکو نسبت ہی نہیں
خود مرا نقشِ جبیں ہے آستانِ زندگی

ذوقِ خرمردہ کی یہ جدت طرازی دیکھنا
کر دیا شاداب غم سے گلستانِ زندگی

چھا گئی ہیں موت کی نیندیں فضائے دہر پر
نیرہ اب کیا کہوں میں داستانِ زندگی

تشنۂ محبت

شفیق بانو

میں شمی کو اچھی طرح جانتی تھی اس وقت سے جبکہ
وہ کالج میں ایف۔ اے کا پہلا سال پورا کر رہی تھی
کوئی بڑی بات بھی تھی لیکن اس کی خود فراموش فطرت
کو میں کبھی نہ سمجھ سکی۔ اس کی بعض عادتوں سے
مدت تک تو میں پریشان رہی۔ وہ کچھ عجیب طبیعت کی لڑکی
تھی محبت کے نشہ میں ہر وقت کھوئی رہتی ہے
اور بعض وقت تو کچھ ایسا جنون جو مشابہ کراپنے
تو اس میں کوئی شک نہیں رہتی —— مجھے یہ معلوم کر کے
بہت دکھ ہوا تھا کہ یہ اس کا اب آخری سال ہے
اور اس کے بعد وہ اپنے وطن واپس چلی جائیگی
اس لئے میں اب اس کے پاس روزانہ جانے لگی
کبھی تو صبح ہی صبح سات بجتے ہی جا پہونچتی اور "شمی
کیا میں آسکتی ہوں" کہتی ہوئی کمرے کے اندر داخل
ہو جاتی۔ اکثر وہ آرام کرسی پر لیٹی کتابیں پڑھتی ہوئی
ملتی اور سامنے میز پر چائے رکھی ہوتی میں ہزار کہتی
"شمی! میں ابھی پی کر آئی ہوں" لیکن اس کے
اصرار سے مجبور ہو جاتی —— عجیب عادت تھی کسی
چیز کو ہاتھ لگا کر کہہ دو کہ یہ پسند ہے فوراً مصر ہو جاتی۔
زبردستی سر منڈھ دیتی —— کھانے کی۔ پہننے کی۔ نمائش کی
روپیہ پیسہ غرض کسی چیز کے دینے میں اسے عار نہ تھا
خود ایسا لباس پہنتی کہ میں اکثر مذاق سے کہتی "ایم
اے، کی اسٹوڈنٹ ہو کر ذرا کپڑے تو ڈھنگ کے
پہن لیا کرو۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتی "کیا ہوا میرے
کپڑوں کو، اچھے خاصے تو ہیں"
"ہوں ذرا دیکھو تو — دس آنے کی چپل ——
ایک پاسوا کی ساری۔ کھدر کا بلاؤس۔ موٹے کپڑے
کا پیٹی کوٹ —— بھلا یہ تمہارے قابل کپڑے ہیں؟
"کھدر تو آجکل عزت کا لباس ہے۔ چپل بھی
آرام دہ ہیں" میں جب بحث کرتے کرتے تھک
جاتی تو خود ہی خاموش ہو جاتی۔

ایک دن شام کو دل گھبرایا —— سیدھی اس کے
کمرے میں جا پہونچی میرے اور اس کے کمرے میں
بیس کمروں کا فرق تھا۔ ہوسٹل میں کل دو سو کمرے تھے
اور وہاں سے کوئی دو فرلانگ پر کالج تھا —— اپنی
عادت کے مطابق وہ لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی —
میں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا "شمی جب دیکھو کتاب
—کیا مصیبت ہے، کسی وقت تو تفریح بھی کرنی چاہئے
ہر وقت دماغ تھکانے سے کیا حاصل ——"
"میری کہیں آنے جانے کو طبیعت نہیں چاہتی
کیا کروں"

دیکھوں طبیعت کو کیا ہوا؟ اگر یہی حالت رہی تو تمھیں گھر بھیجنا پڑے گا۔"

"اچھا ہی ہوگا۔ میں پاگلوں کو اور پاگل ہوجاؤنگی ۔ تم آئیں اور پڑھنا شروع کرلیا ۔ اچھا یہ بتاؤ ہو جاؤں کہاں؟ ۔ یہاں ہوسٹل کے کمروں میں جھانکنے کی مجھے عادت نہیں ۔ بہت جی گھبرایا تو تمھارے کمرے تک چلی آتی ہوں"

میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا ۔ تو آنکھیں ایسی معلوم ہوئیں جیسے کہ ابھی آنسو خشک کئے ہیں ۔ رونے سے آنکھیں سُرخ ہورہی تھیں میں نے کہا "ہیں سٹی! کیا تم روئیں تھیں؟"

"نہیں تو ۔ جب پڑھتے پڑھتے میری آنکھیں تھک جاتی ہیں تو دوا ڈال لیتی ہوں اسی لیے آنکھیں سُرخ ہونگی شاید"

میں ایک ٹھنڈا سانس لیکر خاموش ہوگئی ۔ وہ بات ٹالنا چاہتی تھی آنکھوں سے مایوسیوں کی جھلک صاف نمایاں تھی ۔ میٹرن کا سخت حکم تھا کہ کوئی ایک دوسرے کے کمروں میں دس بجے کے بعد نہ جائے اور نہ لائٹ ہو ۔ لیکن سٹی اسکی پابندی نہ کرتی اور اکثر یا تو مجھے بُلا کر لیجاتی یا خود آجاتی ۔ کبھی کبھی وہ میرے بستر پر ہی سوجاتی ۔ رات بھر میرا لحاف اپنی طرف گھسیٹتی رہتی اور سوتے میں بلی کی طرح نرم نرم ہاتھ میرے بالوں پر ۔ میری گردن پر ۔ اور میری آنکھوں پر رکھدیتی ۔ میں مذاق کرتے ہوئے کہتی، "سٹی! اگر میں مرد ہوتی تو تمھارے ساتھ شادی کرتی،" "وہ ہنستے ہوئے کہتی" مجھی ام رام میں تو آپ سے کبھی نہ کرتی ۔ آپ بڑی گندی ہیں گوشت کھاتی ہیں" میں ہنسنے لگتی "سٹی تم روز دیکھتی ہو میں صرف ترکاریاں کھاتی ہوں"

"میں گوشت نہیں کھاتی ۔ میری سب ملنے والیوں سے پوچھ لو"

ہوسٹل کی ایک لڑکی نے کہا "سٹی نا مذہب ہے اور خدا تک کو بُرا کہتی ہے آپ اُس سے نہ بولا کیجئے" میں نے کہا "میرے سامنے تو کبھی اُس نے ایسا نہیں کہا"

اس لڑکی نے مجھے یقین دلانے کے لیے سٹی سے مذہبی باتیں شروع کردیں ۔ سٹی نے جھنجھلا کر اُلٹے سیدھے جواب دیے جو منہ میں آیا بک گئی ۔ میں نے دونوں کو سمجھایا ۔ سٹی کو چپ کیا "سٹی کیا واہیات بات ہے ۔ مذہب کو بُرا نہیں کہتے ۔"

"تو آخر مجھ سے یہ ہمیشہ کیوں مذہب! مذہب! کرتی رہتی ہیں"؟

آج میں نے دیکھا کہ سٹی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں ۔ میں نے بالوں پر ہاتھ پیار سے پھیرتے ہوئے، "سٹی" کہا اُس نے ہاتھ ہٹا دیے ۔ دیکھا تو آنسو رخساروں سے ڈھلک کر اُس کے دامن کو تر کر رہے ہیں ۔

"ہائیں سٹی! یہ کیا؟ تم رو رہی ہو"

"مجھے رونے دو ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے"

"میں تو تمھیں رونے نہ دوں گی"

"آپ مجھ سے ... پوچھئے"

بہت ... آنسو ... وہ ہچکیاں لیتی
ہوئی شکایت کرنے لگی
"... کی بعض لڑکیوں سے میں بالکل الگ
تھلگ رہتی ہوں لیکن وہ مجھ سے ہمیشہ چھیڑتی
رہتی ہیں ... باتیں ...
کتنی ... اور بے اعتبار ہو گیا۔ برسوں سے میں ...
کو بالکل بھول چکی — ...
ہاں اللہ ... تو ہے تھی نہیں ... تو وہ ...
... میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے
میں جس کو چاہتی ہوں اسے ایشور مجھ سے کیوں
چھین لیتا ہے" اس نے رخساروں کے آنسو پونچھے
اور سنبھل کر بیٹھ گئی "بچپن میں مجھے ماں کا
پیار بھی نہیں ملا۔ میں پیدا ہوئی تھی ... ماں اور ...
میں مصروف تھیں اس لئے کبھی مجھے خوشی نہیں
ہوئی۔ میں خود ہی جا کر ان سے لپٹ کر پیار کرتی وہ
جھڑک دیتیں کہ بہت کام کرنے ہیں۔ ذرا بڑی
ہوئی کہ مر گئیں۔ باپ ہمیشہ باہر رہتے تھے انہوں
نے مجھے اٹھا کر بورڈنگ میں پھینک دیا جہاں محبت
کا ذکر ہی فضول ہے ایک لڑکی تھی میری سہیلی خورشید۔
وہ بھی شادی کے بعد اپنے گھر چلی گئی اور اب خط تک
نہیں لکھتی لیکن میں اپنے دل سے مجبور ہوں جب
جی گھبراتا ہے تو اس کی تصویر دیکھ کر دو آنسو گرا لیتی
ہوں۔ چھٹیوں میں جب گھر جاتی ہوں تو باپ اجنبی
کی طرح مزاج پوچھ لیتے ہیں۔ میں ان میں بھی محبت
نہیں پاتی۔ خرچ البتہ بھیج دیتے ہیں۔ اور لڑکیوں کے
ماں باپ ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میرے باپ کے پاس جتنے
بھی شادی کے خط آئے ان سب میں کسی نے میری
تعلیم کا خیال نہ کیا اب میری صورت پر گئے۔ انہیں
میری طبیعت سے زیادہ پتا کی دولت کی کھوج ہے۔
تب میں نہیں چاہتی کہ روپیہ کی لالچ میں کوئی مجھ سے
شادی کرے — مجھے اپنی تعلیم کا گھمنڈ نہیں بلکہ افسوس
ہے کہ تعلیم سے احساس میں زیادتی ہو گئی — چھوٹے
... میں وہ صرف مجھ سے نمائش کرنا چاہتے ہیں۔
کبھی سوچتی ہوں اگر چھوٹی بہن ہوتی تو شاید محبت کرتی
— میں اپنی بہلنے والی بہن سے پوچھتی ہوں کیا تم
مجھ سے محبت کرتی ہو۔ لیکن دل کو یقین نہیں آتا اب
مجھے دھوکا دیتی ہیں — کتنے کو کہہ دیتی ہیں کہ ہاں ہم محبت
کرتے ہیں لیکن ... سے کیسے پریم ہو سکتا ہے
اب تو من میں کسی کی بات نہیں بھتی۔ اب رونا اور پڑھنا
یہ دو کام میرے لئے رہ گئے ہیں" سلمٰی کی آنکھوں
میں دو بڑے آنسو بھر آئے تھے میری طرف آنکھیں اٹھائیں
اور کہا "کیا آپ بھی مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔ کیا آپ
بھی مجھ سے ایسی ہی باتیں کرتی ہیں جیسی کہ دنیا کی اور
ہستیاں؟ میں حسین نہ سہی لیکن میرا دل حسن آفریں
ہے — اچھا! تم بھی مجھے ستا لو۔ دھوکے میں رکھو
مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوگی" یہ کہتے کہتے وہ
رو پڑی اور میرے ہاتھوں پر سر رکھ دیا میں اس کے
دلی جذبات سے متاثر ہو کر تڑپ گئی اور بے اختیار
گلے میں ہاتھ ڈال دیئے "میری سکھی میں تمہیں دھوکا

نہیں دے رہی — میرے دل میں واقعی تمہاری محبت ہے۔ مجھے تمہاری صورت کی ضرورت نہیں تمہاری سیرت کی شیفتہ ہوں — خدا نے چاہا تو تمہاری شادی کسی اچھے آدمی سے ہوگی یہ میری دعا ہے — شمی بچوں کی طرح میرے شانوں پر سر رکھے دیر تک ہچکیاں لیتی رہی —

کتنی معصوم — محبت کرنے والی ہے میری شمی!!

لوگ کہتے ہیں مصیبت کا بدلہ ملتا ہے۔ صبر کا پھل ملتا ہے لیکن میں، شاید اس عقیدہ کی قائل نہیں رہی۔

شمی کی شادی ہوئی۔ خط آیا۔ گھر میں اپنی زندگی کی الجھنوں میں کچھ اس طرح گرفتار رہی کہ باوجود کوشش کے اُسے دیکھنے نہ جا سکی ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ مجھے تار کے ذریعہ اُس کی علالت کی خبر ملی — جلدی جلدی میں نے اپنا سامان سفر درست کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کے گھر پہونچی۔

اُس کی طبیعت خراب تھی میں دیکھکر حیران رہ گئی کہ اتنی جلدی اُس کی یہ حالت کیونکر ہوگئی — وہ مجھے دیکھکر مسکرائی — اُس کی فسردہ نگاہوں میں زندگی کی آس دم توڑتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

بیماری میں بھی فوراً چار کا تقاضا ہوا۔ چاء پینے کے بعد میں اُس کی تیمار داری میں مصروف ہوگئی — اُسے کھانسی آنے لگی — شوہر کہیں تیار ہو کر جا رہے تھے بولی "دیکھئے وہ کھانسی کی دوا لیتے آیئے گا"

"ہاں اگر ڈاکٹر کی دکان کی طرف گیا تب — اس وقت تو میں دوسرے کاموں سے جا رہا ہوں"

شمی کی سانس سینے میں گھٹ کر رہ گئی — شوہر چلا گیا تو مجھ سے مخاطب ہو کر بولی دیکھا تم نے میری زندگی۔ اب بھلا دنیا میں اور کہاں محبت کی بھیک مانگنے جاؤں جس پر سہارا تھا۔ اس کی بے رخی کا یہ حال ہے — اور آج کیا تھ و سات دن سے — ابتک شاید تمھیں دیکھنے کے لئے میں زندہ تھی — یہ کمرہ ہے اور میں ہوں۔ جب تک اچھی تھی تو خیر کسی وقت ہنس بول بھی لیتے تھے اور اب تو میرے سایہ سے بھی بچتے ہیں۔ الگ کمرے میں رہتے ہیں۔ کیونکہ میری ہائے ہائے سے آنکھ کھل جاتی ہے

میری زندگی آس پر قائم تھی — اب ختم ہوگئی۔

دنیا میں اچھا دل لیکر آئی تھی پر کسی نے سمجھا نہیں — محبت مانگتی رہی۔ اور محبت مجھے کسی قیمت پر بھی نہ مل سکی میں اپنا بنانے کی آرزو میں مٹی ہو گئی لیکن کسی نے مجھے اپنا نہ کہا!!

شاید دنیا کی یہی ریت ہو۔ یہی فلسفہ ہو کہ برباد کو برباد کیا جائے — کمسخن کو کچلا جائے۔ بےبس کو تاراج کیا جائے۔

میری آشا ختم ہو چکی۔ اب میں بھی ختم ہو رہی ہوں۔

مجھے اسکی ساری زندگی معصومیت کی ایک دردناک داستان معلوم ہوتی تھی اسکی باتیں بالکل بچوں کی سی تھیں تمام عمر دنیا کو محبت کا ایک کھلونا سمجھتی رہی۔ لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ یہاں ہر ہر قدم پہ دل پامال کئے جاتے ہیں — اُس وقت جبکہ وہ بستر غم پر پڑی ہوئی دم توڑ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے فریب کے پردے اُٹھ چکے تھے — اور میں اس کی طرف اس بےبسی سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے قیدی پرند قفس کی تیلیوں کو — !!

آرٹ اور فلم

عادل رشید میمونی ایڈیٹر شاہد دہلی - بمبئی

آرٹ اس قدر دلکش اور عام فہم لفظ معلوم ہوتا ہے۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اپنی دانست میں آرٹ کے معنی اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر اس چیز کو جو اسے اچھی معلوم ہو آرٹ کا خطاب دے دیتا ہے۔

"یہ تصویر مجسم آرٹ ہے"۔ "فلاں فلاں آرٹ کی زندہ تصویر ہے"۔ "یہ سبزہ زار کتنا آرٹسٹک ہے" وغیرہ۔ اسی طرح کے مختلف نعرے مختلف جگہ مختلف موقع اور محل پر استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہمارے بزرگ، ایسے حضرات جو پرانی وضع قطع کے پیرو اور نئی تہذیب و تمدن کے سخت خلاف ہیں اور ہمارے وہ بزرگ بھی جو باوجود اس نئی تہذیب کے مخالف ہونے کے اس سے وقتاً فوقتاً استفادہ حاصل کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی نیم عریاں تصویر کو دیکھکر بیساختہ چیخ اٹھتے ہیں "لعنت ہو اس تصویر پر، لاحول ولا قوۃ"، "یہ ہے آجکل کے نوجوانوں کا آرٹ" اسے آرٹ کہتے ہیں یہ عریاں تصویر آرٹ ہے واہ! خوب! یہ میوزیم بدنی ہے مجالی خدا جو نہ دکھائے تھوڑا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

کاش وہ آرٹ کے صحیح مفہوم کو سمجھتے ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ حقیقتاً نیم عریاں تصاویر نیم آرٹ اور بالکل عریاں تصاویر مکمل آرٹ ہوتی ہیں۔ خواہ وہ تہذیب نیز شرم و حیا سے بغاوت ہی کیوں نہ کرتی ہوں حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ ہو چھپائی نہیں جا سکتی۔

کوئی صاحب جو نئی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہیں ترقی کے سو فیصدی واحد ذمہ دار، کوٹ پتلون ہیٹ اور ٹائی کے عادی، حسینان جہاں کے والا اور شیدائی، لپ اسٹک، پاؤڈر اور گیسو بریدہ کے سچے قدردان سے حامی، اکثر فلم میں بڑے بڑے سنسنگز دیکھکر سنیما ہال ہی میں چیخ اٹھتے ہیں What an art what an art (مارولس) Marvellous سینما ہال سے باہر نکلکر وہ ہر شخص سے محض اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کے لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ "بھئی واہ کیا آرٹ پیش کیا گیا ہے فلاں تصویر میں"، "یہ فلم تو آرٹ کا مکمل نمونہ ہے اگر آرٹ کا مکمل نمونہ دیکھنا ہو تو یہ فلم ضرور دیکھو"

غرضیکہ آجکل کا ہر فرد آرٹ کا والہ اور شیدائی ہے اپنی دانست میں، اپنے وہم و خیال میں ہر فرد آرٹ کا سو فیصدی ماہر اور اس کے معنی و مفہوم کا صحیح جاننے اور پرکھنے والا ہے۔

مگر کیا آرٹ کے شیدائیوں میں سبھی اس "آرٹ" کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہے یہ ایک تلخ حقیقت ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ ان آرٹ! آرٹ!! کے چیخنے والوں میں تقریباً نوّے فیصدی ایسے افراد ہیں جو آرٹ کا صحیح مفہوم، اس کے صحیح معنی آجتک نہیں سمجھ سکے۔ وہ نہیں جانتے انکو علم ہی نہیں کہ آرٹ ہے کیا بلا، بس جو چیز طبیعت کو بھلی معلوم ہوئی، جس کو دل نے چاہا وہ آرٹ بنکر رہ گیا

فلم کو مجسّم آرٹ ہونا چاہیے اور ایک کامیاب فلم ہوتا ہی مجسّم آرٹ ہے اس لئے کہ فلم کی بنیاد ہی آرٹ پر رکھی گئی ہے، اور وہی فلم ناکام ہیں تصوّر کئے جاتے ہیں جن میں آرٹ کا فقدان ہوتا ہے جن میں ڈائرکٹر اپنی عدم واقفیت اور ناتجربہ کاری کی بنا پر آرٹ کا خون کر دیتا ہے ایسی ہی تصاویر جب آپ کے سامنے آتی ہیں تو آپ انھیں عزت نہیں بلکہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ان کی سرپرستی آپ اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلم فیل ہو جاتی ہے۔

اب آپ کے دل میں سوال یہ پیدا ہو رہا ہوگا کہ آخر آرٹ ہے کیا بلا؟ آرٹ کہتے کسے ہیں؟

دنیا کی ہر وہ چیز آرٹ ہے جسے عین ماحول، اُس کی عین فطرت کے مطابق پیش کر دیا جائے اسکو مزید واضح کرنے کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ فلم میں وہی سین آرٹ کا مکمل نمونہ کہا جا سکے گا جو اپنے صحیح ماحول کا مضحکہ نہ اڑا رہا ہو۔ فرض کیجئے کہ ایک فلم میں ڈائرکٹر نے دیہاتی بازار کا منظر پیش کیا ہے مگر وہ اپنی ناواقفیت اور جہالت کی بنا پر اس بازار کے سین میں بڑی بڑی عالیشان دوکانیں، دوکانداروں کے صاف ستھرے قیمتی لباس، اور انھیں شہری رنگ میں رنگا ہوا پیش کرے یہی نہیں بلکہ بازار میں خرید و فروخت کرنے والے بھی سب کے سب شہری لباس میں ہوں اکثر و بیشتر حضرات مکمل سوٹ میں نظر آئیں بس یہی خون ہے آرٹ کا، یہیں پر ڈائرکٹر نے فلم کی قدر و قیمت میں کمی پیدا کر دی بیچارے کو اس کا علم ہی نہیں کہ دیہاتی بازار ہوتے کیسے ہیں، وہ دیہاتیوں کی طرز معاشرت سے نابلد محض ہے یہ آرٹ نہیں ہے بلکہ آرٹ کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اس جگہ، ہاں اگر یہی سین دیہاتی بازار کا مکمل نمونہ ہوتا، اس میں وہی چیزیں ہوتیں جو کہ دیہاتی بازاروں میں عموماً پائی جاتی ہیں تو یہ سین آرٹ کا مکمل نمونہ ہوتا، اور ہم فخر کے ساتھ بلا خوف و خطر کہہ دیتے کہ یہ سین آرٹ کا زندہ جاوید مرقع ہے۔

اب آپ میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے اور آپ نے آرٹ کی صحیح تعریف بھی سمجھ لی ہوگی کس فلم کے "کاس ٹیوم" اور اس کے اعلیٰ سٹنگ آرٹ کے علمبردار نہیں ہوتے بلکہ فلم کا ماحول! ہمارے سامنے اس کی پیش کی ہوئی طرز معاشرت، دراصل مستحق ہے آرٹ کا خطاب پانے کی۔

چونکہ فلمیں ہمارے سامنے نمونہ پیش کرتی ہیں ہماری طرز معاشرت کا، وہ عکس کامل ہوتی ہیں ہماری

تہذیب و کلچر کی ہندا اکا مجسم آرٹ ہونا چاہیے اور اور اگر وہ اس میں سو فیصدی کامیاب نہیں ہیں تو وہ [illegible] فن اور آرٹ کا ایک [illegible] دھبہ ہیں ہماری طرز معاشرت پر

فلموں میں مناظر کے ترتیب دینے والے اور ماحول کو اصلی رنگ میں پیش کرنے والے کو آرٹ ڈائرکٹر کہتے ہیں ایسا ڈائرکٹر جو ماہر ہو آرٹ کا، جو دنیا کی تمام تہذیب و تمدن کا حقیقی واقف ہو، جو ہر مذہب و ملت کے رسم و رواج کو اچھی طرح سے جانتا اور سمجھتا ہو، جو دنیا کی ہزاروں، لاکھوں سال کی پرانی تہذیب سے آشنا ہو، جو جانتا ہو کہ اب سے ۵ ہزار سال پہلے دنیا میں کیا تھا، اس وقت کا ماحول طرز معاشرت اور تہذیب، تمدن کیا تھی۔ غرضیکہ ایک کامیاب آرٹ ڈائرکٹر وہی ہوتا ہے جو ان تمام مناظر سے گزر چکا ہو۔

پکار ہندوستان کی ایک ایسی تصویر ہے — جسے ہم آرٹ کا مکمل نمونہ کہہ سکتے ہیں اور اس کا سہرا منروا کے آرٹ ڈائرکٹر مسٹر [illegible] کے سر ہے جن کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے مغلوں کی طرز معاشرت، اُن کے باغات و محلات نیز اُن کے دربار اور رسم و رواج کا صحیح نقشہ فلم میں مسٹر [illegible] نے ہی ترتیب دیا تھا۔

اسی طرح "اچھوت کنیا" بھی دیہاتی طرز معاشرت کی ایک مکمل تصویر تھی، اور اسی لیے اُسے بھی آرٹ کا مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ تو ہوا فلم کے ان لوازمات کا ذکر جنہیں ایک سین میں ترتیب دینے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً محلات باغات، مکانات، جھونپڑیاں اور شہر چھوٹے چھوٹے معمولی دیہات، دربار، جیل وغیرہ وغیرہ اور ان چیزوں کا تعلق زیادہ تر آرٹ ڈائرکٹر سے ہوتا ہے اور وہی اُن چیزوں کی صحیح ترتیب و آرائش کا سو فیصدی ذمہ دار ہے۔

علاوہ تعمیری ماحول کے فلم میں ایک اور بھی سب سے بڑا اور اہم ماحول پیش کرنا ہوتا ہے جس کی ذمہ داری آرٹ ڈائرکٹر پر نہیں بلکہ سو فیصدی فلم ڈائرکٹر پر عائد ہوتی ہے اور یہ ہی ایک ایسا ٹیڑھا مسئلہ ہے جس کے حل میں ہندوستان کے ۹۵ فی صدی فلم ڈائرکٹر ٹھوکر کھاتے ہیں وہ مسئلہ ہے زبان نیز لب و لہجہ کا۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک دیہاتی سین ہے، دیہاتی جمع ہیں آپس میں کسی مسئلہ پر پُر جوش بحث ہو رہی ہے مگر اس بحث میں مثالیں دی جا رہی ہیں امریکہ اور یورپ کی، زبان نہایت ہی صاف اور شہری استعمال ہو رہی ہے، موقعہ ہے نہایت ہی نرم لہجہ میں سمجھا کر بات کرنے کا اور ڈائرکٹر صاحب اس جگہ آرٹسٹ پر زور دے رہے ہیں کہ وہ چیخ چیخ کر غصے کے لہجے میں بات کرے۔ غرضیکہ اس قسم کے مختلف سین جو بلحاظ مکالمے اور جذبات نگاری بالکل غیر فطری ہوتے ہیں بارہا گزرتے ہیں آپ کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ پر اور آپ اکتا جاتے ہیں ایسی فلموں سے آپ کو بجائے دلچسپی کے کوفت ہونے لگتی ہے یہ بھی خون ہے آرٹ کا

اس جگہ بھی آرٹ کا خون ہوا ہے مگر آرٹ ڈائرکٹر کے ہاتھوں نہیں بلکہ ایک ناتجربہ کار اور نااہل ڈائرکٹر کے ہاتھوں۔

ہماری ہندوستانی فلم سازی نے کافی سے زیادہ ترقی حاصل کرلی ہے مگر ہنوز یہاں فلموں میں آرٹ کا خون نہایت ہی دیدہ دلیری سے نااہل ڈائرکٹرز کے ہاتھوں ہوتا رہتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی ڈائرکٹر ایسا نہیں ہے جس نے اپنی تصاویر میں کم و بیش آرٹ کا خون نہ بہایا ہو۔ ماسوا ہندوستان کے دو قابل فخر ڈائرکٹر مسٹر شانتارام اور مسٹر بروا کے

مسٹر شانتارام کی تصویر "آدمی" آرٹ کی زندہ جاوید تصویر ہے ایک ایسی تصویر جسے آرٹ کا مکمل نمونہ کہا جاسکتا ہے "آدمی" کا ہر سین مکمل، عین ماحول کے مطابق اور انسانی فطرت کا صحیح آئینہ دار ہے، مسٹر شانتارام نے ایک ایسے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا تھا جس کا حل سوا ان کے ہندوستان کے کسی ڈائرکٹر کے پاس نہ تھا۔ ایک تھرڈ کلاس طوائف کا کیرکٹر ایک پولیسمین کا مزاج، اس کے عادات و اطوار اور ایک شریف گھرانے کا کیرکٹر، زبان، لہجہ، طرزِ گفتگو، ان سبھوں کی طرزِ معاشرت غرضیکہ شانتارام نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی انھوں نے آرٹ کا خون اپنی تصویر میں نہیں ہونے دیا۔

اسی طرح مسٹر بروا کی تصویریں "دیوداس" اور "ادھیکار" آرٹ کا مکمل نمونہ تھیں۔ اسٹیجی ڈھنگ نہیں بلکہ گھریلو بات چیت اور گھریلو طرزِ معاشرت کا مکمل نمونہ آرٹ کی کامیاب ترین تصاویر، اور نہ صرف دیوداس و ادھیکار بلکہ مسٹر بروا کی ہر تصویر فن آرٹ کی جیتی جاگتی تصویر ہے ——— "آرٹ کیا ہے"؟ میرا خیال ہے کہ اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہونگے کہ کسی تصویر میں اصل صحیح ماحول، صحیح طرزِ معاشرت اور صحیح لب و لہجہ جو کہ عین اسی ماحول کے مطابق ہو ایک آرٹ ہے نہ کہ فلم کے لمبے چوڑے شاندار سینگز اور زرق برق لباس کی چکاچوند جو کہ اپنے اصلی ماحول سے کوسوں دور ہو۔

فلم ایک ایسا فعل ہے جس کی بنیاد آرٹ پر رکھی گئی ہے جو مجسم آرٹ ہے!!!

ضروری اطلاع۔ ہمارے پاس اس مرتبہ حسب ذیل کتابیں تبصرہ کیلئے آئی ہیں لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان میں سے کسی پر بھی اظہارِ خیال نہ کرسکے۔ آئندہ اشاعت میں ہم ان تمام کتابوں پر مفصل لکھیں گے۔ ہم ان اصحاب سے جنھوں نے ہمیں کتابیں بھیجی ہیں اس بار معذرت چاہتے ہیں

پس پردہ (مکتبہ جامعہ) ہندوستانی (مکتبہ جامعہ) مضامین محمد علی (مکتبہ جامعہ) مغلوں کا مدوجزر (مکتبہ جامعہ) بی بی عائشہ (مکتبہ جامعہ) انگلستان کا طریقۂ حکومت (مکتبہ جامعہ) اسلام کیسے شروع ہوا (مکتبہ جامعہ) فرہنگ عامرہ (مکتبہ جامعہ) حفیظ جونپوری (کتاب گھر جونپور) ماہر القادری کے سو شعر (مکتبہ علمیہ حیدرآباد دکن) ظہور قدسی (مکتبہ علمیہ حیدرآباد دکن)

اسی سلسلہ میں ہم یہ بتادینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ کی وہ کتابیں جن پر ہم تبصرہ کرتے ہیں۔ اور جو اوپر درج ہیں یہ سب دفتر ماہنامہ اضطراب۔ لکھنؤ کے پتہ سے بھی منگائی جاسکتی ہیں۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔ (ادارہ)

"چین کے مسلمان"

ثریا خاتون

تقریباً ایک صدی کی مسلسل کوششوں کے بعد چیانگ کائی شیک کی جمعیتہ اسلامیہ نے اپنے تعمیری مقاصد کے ماتحت، چین میں دو کروڑ مسلمانوں کا اضافہ کیا ہے۔ عقائد اور رسومات کے لحاظ سے چین میں صرف دو مذہب ہیں۔ عیسائیت اور اسلام۔ کنفوشیت کو مذہب کے بجائے اگر صرف اصول فلسفہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ حکیم لاؤ تزے کا مذہب جس کا تقریباً پانچ سو برس قبل مسیح آغاز ہوا اور جو مذہب تاؤ کے نام سے موسوم ہے اب زوال پذیر ہے۔ یہی حالت بدھ مذہب کی بھی ہے۔ حالانکہ اس وقت بھی بدھ مذہب کے پیرو اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ روسی سرحد پر جہاں اشتراکی خیال کے لوگ زیادہ ہیں کہیں کہیں ایک حد تک دہریت بھی پھیل رہی ہے۔

چینی مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ محمد صلعم کے زمانے ہی سے یہاں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی تھی اور اس کے آثار تقریباً ہر صوبے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن آزاد چین میں اس کا زیادہ عروج ہے۔ بہر صورت اگر ہم اس عقیدے سے بحث نہ کریں تب بھی یہ کامل یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی ابتدا یہاں [illegible] بعد مسیح سے ہوئی جبکہ عرب تاجر ترکستان کی طرف سے خشکی کا سفر طے کر کے یہاں پہنچے۔ [illegible] بعد مسیح ایک دوسرا گروہ بحری طرف سے بحری سفر کے ذریعہ مغربی ساحل پر اترا۔ اور لوگوں کو دین نبوی کی تلقین کی۔

گو کہ اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے کافی آسانیاں نہیں بہم پہنچ سکی ہیں لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کے قدامت پرست طبقہ سے جہالت اور تاریکی دور ہوتی جا رہی ہے اور خصوصاً جاپانیوں کے موجودہ حملے نے انھیں اور بھی بیدار کر دیا ہے۔ اب تک حکومت کے دستور و نظام میں عیسائیوں کا بہت عمل دخل ہے مگر پھر بھی جنرل پائی چیانگ سی جو کانگسی کے نام سے مشہور ہیں۔ مسلمانوں کے ان چند سپہ سالاروں میں سے ہیں۔ جن کے کارنامے کسی طرح بھی صفحۂ تاریخ سے مٹائے نہیں جا سکتے۔ عیسائیوں میں چیانگ کائی شیک بہت مشہور ہیں اس کے علاوہ حکومت کے معین و مددگار سونگ خاندان کے بہت سے اور بھی افراد ہیں۔ جن میں سے ڈاکٹر ل۔ ح۔ کنگ وزیر مالیات۔ جو سونگ خاندان کی تینوں بہنوں

ہیں سب سے بڑی بہن کے شوہر ہیں۔ اور ڈاکٹر ہالنگٹن سو، زیر دفتر خارجہ و محکمہ اشاعت۔ زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عیسائی حکومت کے دفاتر میں ذمہ دار عہدوں پر فائض ہیں۔

چین کے مسلمان حکومت جمہوریہ سے قبل بہت رجعت پسند اور قدامت پرست تھے جس کی وجہ یہ بھی کہ پچھلی حکومت اپنے مفاد کے لحاظ سے مسلمانوں کو آلۂ کار بناکر انہیں دوسرے مذہب کے پیروؤں سے لڑاتی رہتی تھی۔ اس طرح اس نے تنگ نظری کو فروغ دے کر تعصب کی بیجا آگ کو بھڑکا دیا تھا لیکن آزاد چین میں اب ایک خوشگوار فضا پیدا ہوگئی ہے۔ اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع ہیں۔ اب یہاں نہ فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہیں اور نہ مذہب کے نام پر یہاں ایک انسان دوسرے انسان کا خون بہاتا ہے۔ اس آزاد حکومت میں تمام مذاہب کے لوگ ایک عالمگیر برادری کی شکل میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ جہالت اور افلاس کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ اور مسلمان روز بروز ترقی کی رفعتوں پر پہونچتے جارہے ہیں خصوصاً اب جاپان کے حملے کی وجہ سے ان میں اور زیادہ اتحاد پیدا ہوگیا ہے۔

اضطراب عالم

عشرت علی صدیقی

جنگ کی برسی | یکم ستمبر کو یورپ نے جنگ کی پہلی برسی منائی۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ ابھی اسے کتنی برسیاں اور منانا پڑیں گی اس لئے کہ ابھی تک ان مسئلوں کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جن کے الجھاؤ نے یورپ کے سر یہ بلا نازل کی ہے۔ فریقین کے تھک جانے یا ایک فریق کے غالب آجانے کے بعد بھی یہ مسئلے بدستور رہیں گے۔ یہ لاوا یوں ہی پکتا رہیگا اور جب یہ پکتے پکتے ایک حد تک پہنچ جائے گا تو پھٹ کر اپنے زہر سے دنیا میں پھر وہی بربادی اور تباہی برپا کردے گا جو آج سال بھر سے برپا ہے اور اس سے پہلے ۱۹۱۴ء۔۱۸ء میں برپا ہوچکی ہے۔ جب تک یہ لوٹ کھسوٹ کا نظام قائم ہے اور ایک ملک دوسرے ملک پر قبضہ جمانا اپنے ملکی اور قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھتا ہے اس وقت تک دنیا کو امن نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر ملک کو برابر کی آزادی حاصل ہو۔ اسلحہ بندی کی لعنت ختم ہوجائے اور ایک قوم دوسری قوم کو ہڑپ کرنے کا ارادہ ترک کردے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ہر ملک میں صحیح معنوں میں قومی حکومت قائم ہو اور اس پر عوام کا قبضہ ہو نہ کہ اوپر کے لالچی طبقوں کا جو اپنے

مطابق مفاد اور ذاتی فائدوں کو ملک اور قوم کی بھلائی اور دنیا کے امن پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا ان کے لئے ہے۔ نہ وہ دنیا کے لئے۔

یہ چند موٹے موٹے اصول ہیں جو دنیا کے امن پسند عاقلوں کی طرف سے بار بار پیش کئے جا رہے ہیں اور یہاں پر اُن کے ذکر کا مقصد صرف جنگ زدہ لوگوں کے ساتھ اظہار ہمدردی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کسی آئندہ صحبت میں کی جائے گی۔ البتہ اس شرط کے ساتھ کہ موجودہ زبان بندی کے زمانہ میں اضطراب کے ایڈیٹر صاحب اس کی اجازت دیدیں

رومانیہ کی حیثیت رومانیہ کا حکمران شاہ کیرول اور اس کے خفیہ کارندے غلط طریق سے حکومت کر رہے تھے۔ فرانس کی ہار کے بعد بلقان پر سے برطانیہ کا اثر ہٹ جانے پر وہ جرمن دوستی کا جامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس پالیسی میں عوام کو کوئی دخل نہیں تھا اور اسی لیے جب ٹرانسلوانیا کے معاملہ میں جرمنی اور اٹلی نے رومانیہ کو دھوکا دیا تو عوام کی مخالفت نے شاہ کیرول سے اس کا تاج چھین لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ فرانس میں ان کے وزیر کی کمزور خارجی پالیسی اور انگلستان سے علیحدہ صلح جوئی نے ان سے حکومت کی باگ چھین لی تھی

ہنگری رومانیہ سے اپنا ٹرانسلوانیا کا علاقہ مانگ رہا تھا اور رومانیہ انکار کر رہا تھا آخر ربن تراپ (جرمن وزیر خارجہ) اور کیانو (اطالوی وزیر خارجہ) نے ان دونوں کے نمایندوں کو جرمنی بلا کر پنچایت کر دی۔ کیرول میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اس زبردستی کی پنچایت کو نامنظور کر سکتا۔ لیکن عوام اس دھوکہ بازی کو خاموشی سے مان لینے پر نہیں تیار تھے انھوں نے احتجاج کیا اور کیرول کو اپنی عاقل کے بیگمان میں تخت و تاج اپنے بیٹے کو سپرد کرکے خود دیس نکالا لینا پڑا۔

رومانیہ کے عوام میں اتنی طاقت تو تھی کہ وہ اپنے غلط کار بادشاہ کو نکال دیں لیکن ان میں کوئی خاص تنظیم نہ تھی کہ وہ حکومت کا کام خود ہی سنبھال لیتے چنانچہ وہاں ڈکٹیٹری راج قائم ہوگیا۔ کیرول کا لڑکا میکائیل نام کو بادشاہ ہے ورنہ دراصل طاقت وزیر اعظم انٹونیسکو کے ہاتھ میں ہے۔ اور رومانیہ پھر پرانے ڈھرے پر آگیا ہے یعنی اس نے اتنی بڑی ذلت کے بعد بھی جرمنی کی دوستی کا دم بھرنا شروع کر دیا ہے

انگلستان پر حملے رومانیہ کی طرف سے اطمینان کرکے ہٹلر انگلستان کی طرف پھر پوری توجہ دے رہا ہے۔ جس دن کیرول رومانیہ کے تخت سے دستبردار ہوا اسی دن (۶ ستمبر) کی خبر ہے کہ رات جرمن ہوائی جہازوں کے ایک بہت بڑے جھتے نے انگلستان پر دھاوا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی تعداد میں ہوائی جہازوں نے ایک ساتھ حملہ نہیں کیا تھا۔ دوسرے دن کے حملہ میں برطانیہ کے چار سو آدمی جان سے مارے گئے اور تیرہ چودہ سو زخمی ہوے۔ ۱۰ ستمبر کو اور اس کے بعد سے کئی مرتبہ جرمنی کے ہوائی جہاز برطانیہ کے راج محل بکنگھم پیلیس پر بھی بمباری کر چکے ہیں۔

اس دوران میں برطانیہ کے شاہی ہوائی بیڑے

نے بھی جرمنی پر حملہ کرکے اچھا خاصہ بدلہ لیا ہے۔ مہینہ
ڈیڑھ مہینہ میں یورپ میں جاڑے کا موسم شروع
ہونے والا ہے اور جرمنی کی کوشش ہے کہ اس کے
شروع ہونے سے پہلے ہی وہ انگلستان پر لشکر کشی
کردے۔ اس کے ہوائی حملے اسی پروگرام کا ایک
حصہ خیال کئے جاتے ہیں۔ ان حملوں سے اس کا
ایک مقصد تو یہ ہے کہ برطانیہ کی ہوائی طاقت توڑ
دی جائے اور اس کے ساحلی انتظامات کو بیکار
کردیا جائے اور دوسرے یہ کہ دھادھند بمباری
کرکے لندن والوں کی اخلاقی قوت توڑ دی جائے
اور ان کے دلوں میں جرمنی کا ڈر بٹھا دیا جائے۔

حال کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی
عنقریب ہی لشکر کشی کرنے والا ہے مثلاً خبر ہے کہ
ناروے کے ساحل پر جرمنی کی فوجیں جہازوں پر سے
اُترنے اور چڑھنے کی مشق کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ
کہا جاتا ہے کہ ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کے ساحل پر جرمنی
کے بہت سے جہاز جمع کردیے گئے ہیں جن پر سوار
ہونے کے لیے بیشمار فوجیں تیار کھڑی ہیں۔

افریقہ کا حال

جنگ کے زمانہ میں خبروں میں
کاٹ چھانٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے
مگر افریقہ کی خبروں کا جو حال ہے اس سے واقعی حیرت
ہوتی ہے اول تو خبریں آتی ہی بہت کم ہیں اور جو آتی
ہیں ان میں اتنا تضاد ہوتا ہے کہ لاکھ لاکھ کوششیں
کرنے پر بھی صحیح صورت حال کا معمولی سا بھی اندازہ
نہیں ہونے پاتا۔ اس طرف جو کچھ خبریں آئی ہیں ان سے
صرف یہ پتہ چلتا ہے اور شاید خبریں بھیجنے والے ہیں
اتنا ہی بتانا بھی چاہتے ہیں کہ اٹلی مصر پر تین طرف سے
حملہ کرنے والا ہے۔ ایک تو سولوم سے بڑھ کر اسکندریہ
پر دوسرے مصر اور سوڈان کی سرحد پر سے دریائے
نیل کے علاقہ پر اور تیسرے کسالا کے مغرب کی طرف سے
خرطوم پر۔

اٹلی کے اعلان جنگ کے بعد یہ خبر آئی تھی کہ اگرچہ
مصر نے ابھی اعلان جنگ نہیں کیا ہے مگر اس نے یہ
کہہ دیا ہے کہ اگر اس کے علاقہ پر حملہ ہوا تو وہ فوراً ہی
جنگ کا اعلان کر دیگا۔ موجودہ صورت حال یہ ہے
کہ اٹلی نے مصر کی ساٹھ میل زمین جیت لی ہے۔ اور
سولوم پر (جو برطانیہ کے نزدیک کوئی فوجی اہمیت نہیں
رکھتا) اپنے اڈے قائم کرکے اسکندریہ پر چھاپا مار کر
سوئز تک پہنچنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ مگر ابھی تک
مصر نے اس کے خلاف اعلان جنگ کیوں نہیں کیا؟
اس سوال کا جواب اگر تلاش کیا جائے تو شاید دو پچھلی
خبروں کا تجزیہ کرنے سے مل جائے ایک تو برطانیہ
کا اعلان کہ ہم مصر کو اعلانِ جنگ پر مجبور نہیں کر رہے
ہیں اور دوسرے مصری وزارت کی تبدیلیوں کی
متعدد خبریں۔

امریکہ کا سودا

پچھلے مہینے میں نے شنگھائی کی
بین الاقوامی بستی میں برطانوی
فوجوں کی جگہ امریکی فوجوں کی آمد پر لکھا تھا کہ امریکہ نے
یہ ذمہ داری مفت میں نہیں لی ہوگی اب برطانیہ اور
امریکہ کے معاہدے نے اس کی تصدیق کردی ہے اس

معاہدے کی رو سے امریکہ نے اپنے ۵۰ پرانے تباہ کن جہاز برطانیہ کو دیئے اور ان کے عوض اسکو بحر کیریبین کے برطانوی مقبوضات اور برطانوی گائنا میں ہوائی اور بحری اڈے قائم کرنے کی اجازت مل گئی ہے اور نیوفاؤنڈلینڈ کے جنوبی ساحل اور جزائر برموڈا کے مشرقی ساحل پر اڈے قائم کرنے کا حق مل گیا ہے لیجئے امریکہ بھی جانب نو آبادیات میں انگریزی جان و مال کی چوکیداری کرنے کا معاوضہ لے بیٹھے۔

امریکہ لڑائی کے زمانہ میں بھی اپنے بنئے پن سے نہ چوکا۔ اس نے یہ پیش بندی بظاہر اس لئے کی ہے کہ اگر لڑائی میں برطانیہ ہار جائے تو اس کے مغربی کرۂ ارض کے مقبوضات کسی دوسرے کے پاس نہ جانے پائیں۔

فرانکو کدھر؟ تجربہ پہ تجربہ کرنا عقلمندوں کا طریقہ نہیں ہے لیکن برطانیہ کے حکام نے اس کہاوت سے سبق نہیں لیا۔ چیمبرلین صاحب اپنی صلح جوئی کی پالیسی کے ماتحت نازی جرمنی کو منہ بھرائی دیتے رہے لیکن اس کی بھوک نہ مٹنا تھی نہ مٹی بلکہ وہ اور مضبوط ہو کر اب سارے یورپ اور خود انگلستان کو بھی ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔ پھر اٹلی کو جرمنی سے الگ کر لینے اور جنگ میں شامل ہونے سے روکنے کے لئے اس کی طرح طرح سے چاپلوسی کی گئی اور بیشمار تجارتی مراعات دی گئیں۔ لیکن وہ اپنی مقررہ راہ سے نہ ٹلا۔ اب ایک دفعہ پھر اسپینی ڈکٹیٹر فرانکو کو موہ لینے کی کوشش ہو رہی ہے اور سر سیموئل ہور خاص اس کام کے لیے اسپین بھیجے گئے ہیں لیکن اسپین اور جرمنی کا ڈانڈا ڈانڈے سے ملا ہے اور اس کے علاوہ فرانکو جرمنی کا احسان جو اس نے خانہ جنگی کے زمانہ میں کیا تھا بھلا نہیں سکتا۔ اور بھلا دے تو جرمنی کے پڑوس میں رہ کر چین سے حکومت نہیں کر سکتا چنانچہ خبر ہے کہ اسپینی وزیر داخلہ برلن گیا ہوا ہے۔ جہاں وہ ملکی معاملات کے علاوہ دوسری باتوں پر بھی تبادلہ خیال کریگا۔ یہ بھی خبر ہے کہ جرمنی کی بہت سی سپاہ اسپین میں موجود ہے۔ اور اس کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ جبرالٹر کو انگریزوں سے چھین لیا جائے۔

جاپان کا الٹیمیٹم فرانسیسی انڈوچین اور جاپان میں اس مہینہ بھر بات چیت ہوتی رہی اور اب یہ بات چیت بلا کسی نتیجہ پہنچے ختم ہو گئی ہے تازہ ترین (۲۱ ستمبر کی) خبر ہے کہ جاپان نے انڈوچین کو الٹیمیٹم دیدیا ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر جاپان کو اس راستہ سے فوجیں لیجانے اور اڈے قائم کرنے کا حق دیدے ورنہ جاپان زبردستی یہ حق حاصل کر لے گا۔

— آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نسیم سندیلوی بی۔ اے آنرز ایڈیٹر و پبلشر نے خاصی پریس میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ انقلاب چاپلنگ مارٹ نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا



ماہنامہ اضطراب لکھنؤ

دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

ہمارے افسانہ نمبر کے لکھنے والے

افسانے:- علی عباس حسینی
اختر انصاری
چودھری محمد علی
سید احتشام حسین رضوی
حیات اللہ انصاری
تارا شنکر ناشاد
مسیح الحسن رضوی
شفیق بانو شفق

ڈرامے:- آغا لکھنوی
وجاہت سندیلوی

نظمیں:- جوش ملیح آبادی
جگر مرادآبادی
روش صدیقی
دور ہاشمی
مجاز
علی سردار جعفری
مسعود علی ذوقی
آمنہ برجیس
سوز شاہجہانپوری



ادارہ:- نسیم سندیلوی
مسعود اختر جمال

رجسٹرڈ نمبر

جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۶

فہرست مضامین

ہمارا افسانہ نمبر ضرور پڑھئے

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

ماہنامہ اضطراب لکھنؤ

جلد ۱ | دسمبر ۱۹۴۰ء | شمارہ ۶

ہم اور آپ

دسمبر کا پرچہ اس سال کا آخری تحفہ ہے۔ موجودہ جنگ کی کساد بازاری نے ہماری سال کی اشاعت میں بہت دشواریاں حائل کر دی ہیں۔ مگر اس کے باوجود "اضطراب" نے نہایت استقلال کے ساتھ ایک سال کی نصف مسافت طے کر لی۔ نئے سال کے خیر مقدم کے لیے ہم آپ کی خدمت میں اضطراب کا سالنامہ نمبر پیش کرینگے۔

ابتک ہم نے رسالہ کا کوئی خاص معیار مقرر نہیں کیا تھا اور نہ کوئی پالیسی متعین تھی۔ جو مضامین آتے تھے ان کا جزئیہ انتخاب شائع ہو جاتا تھا۔ مگر جنوری سے ہمارا پرچہ ایک خاص ادبی معیار کے ساتھ شائع ہوگا۔ پرچہ کی نگرانی حضرت جگر مرادآبادی نے قبول فرمالی ہے۔ ادارہ اُن کے اس ادبی ایثار کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اُن کی نگرانی میں اضطراب روز بروز ترقی کرتا جائیگا۔

نئے سال سے آپ اضطراب میں ملک کے مشہور و معروف اہلِ قلم حضرات کے مضامین پڑھیں گے۔

رسالے کا ادبی معیار کیا ہے؟

یہ سوال بہت لوگوں سے بار بار پوچھا گیا ہے۔ ابتک اس میں شک نہیں کہ اضطراب کسی خاص پالیسی پر کاربند نہیں تھا لیکن آئندہ سے ہمارے سامنے ایک متعینہ پالیسی ہوگی۔ اور ادارہ نہایت سختی سے اس پر کاربند ہوگا۔ ادبی معیار سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اضطراب میں ہم علمی اور فنی تحقیق و تدوین شروع کردینگے بلکہ اس سے مراد وہ تعمیری ادب ہے جس سے عوام میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کیا جا سکے اور جس کے ذریعہ سے ذوقِ سلیم کی رہنمائی کی جا سکے جو زندگی کی تگ و دو میں ایک کامیاب انسان بنا سکے کیا دنیائے ادب کے وہ درخشندہ ستارے جو آسمانِ شعر و ادب کی لامحدود فضاؤں پر چھائے ہوئے ہیں ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشش کریں گے اور کیا ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکیں گے اس سوال کا جواب زمانے کے متبسم چہرے سے ہمیں خود بخود مل جائے گا۔

ہم اس چھ ماہ کے عرصہ میں اکثر ممتاز اہلِ قلم حضرات سے ملے۔ جنھوں نے قلمی معاونت کا وعدہ کیا ہے۔

پرچہ کی ترویج و اشاعت کے لئے ہمارے نمائندہ خصوصی یو۔پی میں دورہ کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اضطراب کے بہی خواہ اس سلسلہ میں ان کی ہر ممکن امداد کریں گے۔ بالتفصیل پروگرام دفتر سے معلوم کیجیے۔

ڈاک سے پرچہ غائب ہونے کی اکثر شکایتیں آتی رہتی ہیں۔ اس مہینے سے ہم نے اس کی تحقیق شروع کر دی ہے جن حضرات کو رسالہ وقت مقررہ پر نہ ملے انھیں چاہیے کہ فوراً دفتر کو مطلع کریں تاکہ ہم اس کا جلد از جلد انسداد کر سکیں۔

اس پرچہ کے ساتھ خریداری نمبر میں کچھ فرق ہوا ہے۔ اکثر حضرات کے خریداری نمبر بدل گئے ہیں۔ اس کی معذرت ہے۔ دفتر کی چند دشواریوں کی وجہ سے پیش آئی۔ اب آئندہ ہر ایک خریداری نمبر وہی رہیگا جو اس مرتبہ پتہ کے ساتھ بائیں جانب تحریر ہے۔ ہمارے خریدار نوٹ فرمالیں۔

(ادارہ)

مشاہدات :—

آسمان

آسماں ظلمت اور اک دُھندلکا ہے شاید
ایک نادیدہ حقیقت کی خبر ہے شاید
یہی آماجگہِ شام و سحر ہے شاید
چھا گیا ہے جو فضاؤں پہ وہ سیلاب ہے یہ
بس گیا ہے جو نگاہوں میں وہی خواب ہے یہ

شبستاں کے گہرپاش نظارے اس میں
انجمستاں کے سحر خیز شرارے اس میں
کوثرستاں کے شب آثار کنارے اس میں
لوگ کہتے ہیں یہ وہ سقفِ گرانمایہ ہے
جس کا دامن مہ و خورشید کا ہمسایہ ہے

جہل پہ ناز کیا کرتی ہے تقدیر یہاں
خواب ہستی کی بنا کرتی ہے تعبیر یہاں
کھینچ لیتی ہے نظر خلد کی تصویر یہاں
اس کی تاریک فضاؤں کی نہ حد ہے نہ حساب
بحرِ فطرت نے عطا کی ہے اسے شکلِ حباب

ڈوب جاتی ہے یہاں عالمِ حیرت میں نظر
بے حقیقت ہیں یہاں علم و ہنر کے دفتر
تھرتھراتے ہیں یہاں وہم کے سایے اکثر
الٰہیت اس سے عقائد میں ہوئی ہے تبدیل
اسی تخئیل نے کھولی ہے عرفاں کی سبیل

مستیِ کوثر و تسنیم چھلکتی ہے یہیں
روحِ آوارۂ جذبات بھٹکتی ہے یہیں
برقِ عرفانِ سرِ طور چمکتی ہے یہیں
نوعِ انساں کو ملا تاج یہیں پر شاید
طے ہوئی منزلِ معراج یہیں پر شاید

اسی وادی میں کہیں صبحِ ازل ہے بیہوش
اسی وادی میں کہیں شامِ ابد ہے روپوش
اسی وادی میں کہیں رحمتِ یزداں خاموش
ہوتی رہتی ہیں بلائیں بھی یہیں سے نازل
یہیں ہوتی ہیں ہر اک دل کی مرادیں حاصل

لامکاں کے اسی وادی میں نہاں ہیں جلوے
اسی وادی میں جہنم کے بھڑکتے شعلے
اسی وادی میں فرشتوں نے کئے تھے سجدے
یہیں مقبول اسیروں کی دعا ہوتی ہے
اور تقدیر غریبوں کی یہیں سوتی ہے

یہیں آدم بھی گناہوں کے سزاوار ہوئے
دامِ تزویرِ محبت میں گرفتار ہوئے
یہیں دنیائے حقیقت سے خبردار ہوئے
یہیں ابلیس کا پندارِ عبادت ٹوٹا
زہد کے ہاتھ سے تقدیس کا دامن چھوٹا

رات بھی جب رات کو چھا جاتی ہے خاموشی سی
بند ہو جاتی ہے جب ویرانہ کی سرگوشی بھی
اور پھر ٹوٹ کے گرتا ہے جو تارا کوئی
ایک شعلہ سا فضاؤں میں بھڑک اٹھتا ہے
قلب گیتی بھی یکایک دھڑک اٹھتا ہے
یاد آ جاتا ہے ابلیس کا افسانہ پھر
دل دھڑک دہشت سے ہو جاتا ہے بیگانہ پھر
لوٹ جاتا ہے تخیل کا صنم خانہ پھر
یک بیک عقدۂ اوہام بکھر جاتا ہے
ڈوب کر بحر صداقت میں نکھر جاتا ہے

ہر طرف پھر نظر آتی ہے فضائے لامحدود
جس کی ظلمت میں ہے روح عقل و خرد ہے مسعود
جلوۂ ہوش ٹھہرتا ہے جہاں پر مردود
چشم خورشید مگر باز یہاں رہتی ہے
زندگی مائل پرواز یہاں رہتی ہے
وادی انجم کے سفر سے یہی ہوتا ہے گماں
ہے بعید شوق رواں کشتی انوار یہاں
زندگی ہے ــــ بہر آثار یہاں بیکراں
آسماں کچھ بھی نہیں ــــ وسعت بے پایاں ہے
یہی تاریک خلا۔ مرکز نورستاں ہے

مسعود اختر۔ جمال

آئینۂ فنگار

خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

اے فلک یہ کیا تری نیرنگیوں کا رنگ ہے — خرمیٔ مفقود جس کو دیکھئے دل تنگ ہے
دل گرفتہ ہیں شگوفے، پھول مرجھائے ہوئے — مائلِ فریاد و شیون مرغِ خوش آہنگ ہے
آنکھ کھلتے ہی ہوا بادِ مخالف سے دوچار — جامۂ ہستی تنِ گل پر بہانا تنگ ہے
جن کے سینوں میں کبھی تھا جوشِ زن حُبِّ وطن — پست اُن کے حوصلے ہیں پائے ہمت لنگ ہے
طرحِ میخانہ ہے جبنسے خونِ دل پیتے ہیں وہ — اور کم ظرفوں کی خاطر بادہ گلرنگ ہے
صاحبِ مقدور جو تھے آج ہیں ایسے ذلیل — خاک ہے ان کا بچھونا اور بالش سنگ ہے
ناکسوں کا قدرداں ہے، دشمنِ اہلِ کمال — تیری کج رفتاریوں سے عقل میری دنگ ہے
بوالہوس جتنے ہیں ان کو عشق کا سودا ہوا — نام سے اہلِ وفا کے دلبروں کو ننگ ہے
بغض و کینہ دوستوں میں، آشنا ناآشنا — باپ بیٹوں میں عداوت، بھائیوں میں جنگ ہے
یاد ایا میکہ تھا احباب میں باہم خلوص — اب صفائے قلب کے بدلے دلوں میں زنگ ہے
دور کر جانے لگے کوئے ضلالت کی طرف — اور راہِ حق میں اک اک گام سنگِ دسنگ ہے
دل کے بدلے ملک پر ہے حکمرانی کا خیال — فکر ہے جاہ و حشم کی حسرت اورنگ ہے
سعیٔ آزادی میں جب شامل ہوا ذاتی مفاد — بے تکلف خوابِ آزادی خیالِ بنگ ہے
خودنمائی۔ خودفروشی کا رواج ایسا ہوا — راستی خاموش، نیکی سازِ بے آہنگ ہے

قابلِ الزام خود۔ لیکن گلہ تقدیر کا
فعل میں وہ کچھ اثر گفتار کا یہ ڈھنگ ہے

کیفِ بہاراں

سید نواب علی خاں گوہر، ایم اے، ال ٹی

حضرت اخترؔ لکھنوی کی ذاتِ گرامی کسی تعارف
کی محتاج نہیں۔ آپ کا کلام دنیائے ادب میں کافی شہرت
و مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

آپ نے غزل، قصیدہ، نظم، رباعی، قطعہ، مسدس
تضمین، تمام اصنافِ سخن پر طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں
لیکن غزل کا میدان آپ کا خاص جولانگاہ رہا ہے جیسا کہ
خود فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ دلدادۂ اندازِ غزل ہوں اخترؔ
کون شیوہ ہے جو اس کا ذرا فن میں نہیں

ہم بھی اس مختصر مقالے میں صرف "اخترؔ کے تغزل"
سے بحث کریں گے۔

کلامِ اخترؔ کی خصوصیت متنوع مضامین اور خیال کی
گوناگونی ہے "بہاراں" ایسا گلزار ہے جس میں ہر رنگ
اور ہر طرح کی لطیف خوشبو کے تازہ اور شاداب پھول
بکثرت پائے جاتے ہیں اور

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اس کے علاوہ ہر غزل میں اچھے اشعار کی تعداد
کی زیادتی میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز نظر آتے
ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم کوئی خاص غزل پیش
نہیں کرتے جس کو شک ہو وہ "بہاراں" کا مطالعہ کرلے
ہمیں یقینِ کامل ہے کہ ہر غزل میں اچھے اشعار کافی تعداد
میں ملیں گے اور زیادہ تر غزلیں از مطلع تا مقطع مرصع پائی
جائیں گی۔

اخترؔ کی غزل میں ندرتِ خیال، رفعتِ تخیل، نزاکتِ
تخئیل، جدتِ ادا، سلاست و روانی، درد و اثر، سوز و مستی
اور جوش و خروش بدرجۂ اتم موجود ہے مغربی ادب میں
دستگاہ رکھنے کی وجہ سے آپ کے کلام میں مغربی اثر کی
کافی جھلک پائی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مقامی
رنگ کا سررشتہ بھی چھوٹنے نہیں پاتا۔

"بہاراں" میں وارداتِ حسن و عشق، جذبات نگاری
وابندی، محاکات، مناظرِ فطرت کی مصوری، تصوف، فلسفہ
اور سائنس کے مسائل، حبِ وطن، اور سیاستِ حاضرہ سب
ہی کچھ موجود ہے۔ اور اسی سے ہر مذاق اور ہر طبیعت کا
انسان اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

جہاں تک حسن و عشق کا تعلق ہے اخترؔ کا حسن اور عشق
دونوں معیاری ہیں جیسا کہ مندرجۂ ذیل اشعار سے واضح
ہوتا ہے ؎

فطرت کا راز دار کیا جب سے عشق نے ۔ جز حسن کوئی میری نظر میں جچا نہیں

کم و بیش کو ہو دخل اگر تو دلیلِ نقص ہے بے خبر
وہی عشق ہے جو نہ بڑھ سکے وہی حسن ہے جو سوا نہ ہو

نازاں ہوں طبیعت پہ کہ اب دردِ محبت
کم بھی نہیں ہوتا اگر افزوں نہیں ہوتا

ظاہر ہے کہ ایسے معیاری عشق میں آرزو کا گزر کہاں!

کس طرف تیرا دھیان ہے اے دل
عشق میں آرزو کو دخل نہیں

اور اگر کوئی تمنا ہوئی بھی تو ایسی جس کا برآنا اس مادی دنیا میں ممکن نہیں تمنا بھی محبت کی طرح معیاری ہوگی؛

شیفتہ ہوں اُسی تمنا کا
خواب میں بھی جو بر نہیں آتی

جب محبوب معصوم فطرت ہوگا تو اُس کی یہ حالت ہونا لازمی اور ضروری ہے ؎

جو عرض کیجئے فوراً پذیرا
عصمت کی ضامن خود بیحجابی

ایسے معشوق کو عاشق سے بدگمانی نہیں ہو سکتی اگر وہ کسی وقت خاموش رہے تو اس کا سبب، حیا ہوگی نہ کہ بدگمانی ؎

حیا پہ حسن کی نہ جا، نظر سے آشکار ہے
کہ عشق پاکباز کا اُسے بھی اعتبار ہے

عاشق کا خیال معصوم خیال ہوگا، نگاہ معصوم نگاہ ہوگی۔ اس میں کسی طرح کی لوث کا شائبہ بھی نہ ہوگا، یہاں تک کہ وصل میں بھی یہ شانِ معصومیت قائم رہیگی۔

مذاقِ عشق ہے کامل تو صورتِ شبنم
کنارِ گل میں رہے، اور پاکباز رہے

معیارِ وصل ؎

دید کی عشرت، محو تماشا، بیہوشی سرشار کی سی
شوق نے ختم یہیں پہ کیا پُرلطف ملاقاتوں کو

یہ پاکبازی اسقدر نادر اور انوکھی چیز ہے جس پر خود عاشق کو بھی حیرت ہوتی ہے ؎

کہیں کا اس نگہِ مست نے نہ رکھا تھا + یہ معجزہ ہے محبت کا پاکباز رہے

اسی سلسلے میں عصمتِ خیال اور عصمتِ نگاہ کے متعلق چند اشعار اور سن لیجئے۔

بھولے سے نامِ عشق نہ لیتا تھا بوالہوس
جب عصمتِ خیال کا دل پاسباں نہ تھا

ہوس کاری کا اک پہلو نکلتا تھا محبت میں
حیا نے تیری سکھلایا نگہبانِ نظر ہونا

حیا شیوۂ حسن، ادب شرطِ الفت
ملے بھی تو آپس میں پردہ رہیگا

پھول ہو یا کوئی حسیں، دیکھ لے، شاد ہو، گزر
غیرتِ پاک مشربی دستِ ہوس بڑھائے کیوں

پاکبازانِ محبت ہیں یہاں تک محتاط
گل پہ بھی دیدۂ شبنم سے نظر کرتے ہیں

اثر کا محبوب: فارسی شاعری کے تتبع میں اُردو شعراء نے بھی اکثر ایسے اشعار نظم کئے جن سے محبوب کا مرد ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ متقدمین میں یہ وبا عام تھی، موجودہ عہد کے اکثر شعراء نے بھی اکثر اشعار ایسے کہے ہیں جن سے یہ بدنما داغ اُردو شاعری کے دامن پر اور نمایاں ہوگیا۔ لیکن اثر کے تمام دیوان میں کوئی شعر (صوفیانہ اشعار سے قطع نظر کر کے) ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اثر کا محبوب مرد ہے برخلاف اس کے ایسے اشعار بکثرت پائے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اثر کی محبوبہ عورت ہے مثلاً

تو حور ہے کہتا ہے اسے زاہد خوش خو
اصنام کی فہرست میں نام نہیں ہے

ظاہر ہے کہ حور جنت کی عورت ہے غلمان نہیں ہے

نہ اس کے مصحف سے گل مدکملے کی یہ باتیں ہیں
ابھی تک چٹکیوں کے نیل ہیں رخسار سوسن پر

چٹکیاں لینا خاص عورتوں کی فطرت ہے، مرد چٹکیاں نہیں لیتے، اس سے ضمناً معشوق کا عورت ہونا واضح ہوتا ہے

کسی کی چشم فسوں ساز کا ہوں دیوانہ
نظر کے ساتھ لئے پھرتا ہوں پری خانہ

عاشق چشم فسوں ساز کے ساتھ پری خانہ لئے پھرتا ہے اگر محبوب صنف نازک سے نہ ہوتا تو بجائے پری خانہ کچھ اور ہی لئے پھرتا ۔

مجنوں کو سکھاتا ہے ادا جامہ دری کی
انگڑائی بہانہ ہے، وہ مقصود نہیں ہے

خیال کا تجزیہ کیجئے تو سینہ تانے ہوئے ایک پیکر شباب عورت کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جائے گی ۔

میں تصدق ترے پھر پوچھ کہ دل جانے کس طور چلا جاتا ہے

"جانے کس طور" درست ہے یا "نجانے کس طور" اس کو مستند اہل زبان جانیں، ہمارے خیال میں اگر "جانے" کے بجائے "نجانے" ہوتا تو شعر کی تمام خوبی خاک میں مل جاتی اسی "جانے" سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والی سادہ کمسن عورت ہے مرد نہیں۔ یہ زبان خاص عورتوں کی تھی جس کو بالکل اسی طرح نظم کر کے ضمناً یہ واضح کر دیا کہ کہنے والی معشوق عورت ہے۔

ہم اس موضوع کو یہاں زیادہ طول دینا نہیں چاہتے دیگر عنوانات کے تحت میں جو اشعار نقل کئے جائیں گے ایسے مناسب مقامات پر اثر کے محبوب کی صنف کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائیگا۔

حقیقتِ عشق: محبت کیا ہے؟ اس کا جواب فلسفیوں نے کچھ دیا، ماہرین طب نے اور کچھ، صوفیوں نے کچھ اور، گویا عشق کا جواب سب سے جدا رہا، شاعروں نے محبت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اثر نے عشق کو "شورش صبر آزما" سے تعبیر کیا ہے ۔

غرض اک شورشِ صبر آزما ہے کسی انداز کا دیوانہ بن جا

محبت ایک شورش ہے جو طاقت دل کی آزمائش کرتی ہے عشق ایک اضطراب صبر آزما ہے۔ عاشق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ محبت کرنے کے لیے حسن کی ادائے خاص کا انتخاب کرے کسی انداز کا دیوانہ بن جائے اور بس اس کے بعد یہ شورش صبر آزما سرگرم کار رہے گی اور عشق کے مزے دیا کرے گا ۔

نگاہ ناز تیری شوخیوں سے بدگمانی ہے
یہ چنگاری مرے سینے میں تو نے تو نہیں رکھ دی؟

اس شعر میں محبت بجائے شورش صبر آزما کے "شورش صبر آزما" ہے۔

عشق کو خلش کا مترادف مانا ہے ۔

عشق ہے خلش کیسی؟ چین کی خلش دشمن
دار جس کو کہتے ہیں، خوابگاہ سرمد ہے

ایک اور شعر میں عشق کو درد کہا ہے ۔

ازل کو مجھ سے جو پوچھا تجھے ہے کیا درکار
مراد عشق تھی لیکن زباں سے نکلا "درد"

شاید یہ اشارہ کر دینا مناسب نہ ہو کہ شعر میں صنعتِ ایہام کا صرف تعریف سے تعلق ہے۔

ایک اور مقام پر عشق کو امتحان سے تعبیر کیا ہے ۔

عشق کی قوت آزمائش کر — عشق خود امتحان ہے پیارے

باوجود ان تمام تاویلوں کے عشق ایک ناقابل تشریح
حقیقت ہے ؂

رہا ہے جس کو کہنے سننے سے — عشق کیا داستان ہے پیارے

اسقدر ناقابل تشریح ہے کہ حسن بھی حیران رہ جاتا
ہے کہ عشق کا مدعا اور منشا کیا ہے۔

حسن خود نما کو بھی جستجو ہے مقصد ہے
عشق بے مزد یا رہ مطلب مقید ہے

آخر کار عشق ایک جذبۂ خوددار ہے، اسقدر خوددار
کہ حسن سے بھی نہیں جھکتا، اس قدر خوددار کہ حسن کو بھی عشق
خوددار پر عشق مغرور کا دھوکا ہو جاتا ہے ؂

بدگماں ہے کوئی اتنا نہیں کہنے والا
عشق خوددار ہے، خودسر نہیں، مغرور نہیں
عشق میں تمکین بھی ہے، آن بھی، اور شان بھی
عشق کو اک جذبۂ خوددار ہونا چاہیے
کسی کے ناز سے لیتا ہوا نیاز رہے
نیازگی میں بھی اک شانِ اختیار رہے

خلاصہ کلام یہ کہ عشق سب کچھ ہے، اسی سے قوتِ
حیات، یہی وجہ تخلیق ہے، یہی اصل حیات، یہی ایمان ہے
یہی خدا ہے ؂

محبت نہیں ہے تو پھر کچھ نہیں — یہ دولت نہیں ہے تو پھر کچھ نہیں

محبت ہی انسان کو انسان بناتی ہے ؂

انسان کو بے عشق سلیقہ نہیں آتا
جینا تو بڑی چیز ہے مرنا نہیں آتا

محبت ہی ایمان ہے ؂

محبت کے بندوں کو انسان جانا — محبت ہی کو ہم نے ایمان جانا

اسی عشق کی تبلیغ اس دلکش انداز میں کی جاتی ہے ؂

نہیں ملتی جو دولت بیدار — عشق کا اک حسین خواب تو دیکھ

عقل عشق سے عشق تک وہ منزل ہے جہاں اندیشۂ بود و ہست نہیں
فکر کنارا و بست نہیں، اندوہ بلند و پست نہیں
منزلت اپنی کچھ اسے عشق رنگیں! ابھرا
آپ محفل ہے، ترے در خور کوئی محفل نہیں

فریضۂ عشق:۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں
کچھ فریضۂ عشق کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ
نماز پڑھنے سے پہلے طہارت ضروری ہے، اپنے کو اس درگاہ
پاک میں جانے کے قابل بنانے کے واسطے غسل کرتے ہیں
وضو کرتے ہیں لیکن نماز عشق کی منزل اس قدر بلند اور اعلیٰ
ہے کہ اس کے واسطے آب طاہر سے غسل و وضو کافی نہیں بلکہ

کامل ہے جنہیں ادق پہ شہادت جاناں
بے خوں میں نہائے ہوئے سجدہ نہیں کرتے

علاوہ بریں ہر روز پانچ وقت ادائے فرض کر لینا کافی ہے
اس سے زیادہ زحمت شرع نے نہیں دی اگر محبت کا فریضہ ایسا
نہیں جس سے انسان اس آسانی سے سبکدوش ہو سکے، تمام
زندگی بھر ادا کرے پھر بھی یہ ادا نہ ہو گا۔

نہیں پنجگانہ نماز آخر جب وقت وقت پڑھ لیا
یہ فریضۂ عشق کا عمر بھر جو ادا کرو تو ادا نہ ہو

صرف یہی نہیں کہ مسجد میں جا کے قیام و قعود، رکوع و سجود
بجا لائے اور نماز ہو گئی، نماز عشق کا مقام اور ہے عنوان اور ہے

وہ نماز عشق ہے بوالہوس! تہہ تیغ جس کا قیام ہے
نہ رکوع ہیں نہ سجود ہیں نہ قعود ہے نہ قیام ہے

غزل

خواجہ عزیز الحسن مجذوب

غم ہائے دہر مجھ کو پریشاں نہ کر سکے
وہ عشق کیا جو درد کو درماں نہ کر سکے

اس شوخ کو درونِ دل و جاں نہ کر سکے
ہم حسبِ شوق خاطرِ مہماں نہ کر سکے

کچھ عیش کچھ نشاط کا ساماں نہ کر سکے
"دشواریٔ حیات کو آساں نہ کر سکے"

ہم دل میں ضبط سعی ہی یہاں نہ کر سکے
جو اختیار صورتِ جاناں نہ کر سکے

وہ شوق ناتمام ہے۔ وہ عشق خام ہے
جو ہجر اور وصل کو یکساں نہ کر سکے

اس بلبلِ اسیر کی مجبوریاں نہ پوچھ
جو سیر کیسی، ذکرِ گلستاں نہ کر سکے

وہ ننگِ عاشقاں ہے۔ وہ ہے ننگِ عاشقاں
رگ رگ کو دردِ دل سے رگِ جاں نہ کر سکے

کرنے کو کچھ اور مدحتِ بتاں ابھی
لیکن بپاسِ عظمتِ قرآں نہ کر سکے

مشکل کو میری کہہ نہ کشاکش بلائے فلک
کر دے محال ہی اگر آساں نہ کر سکے

مجذوب کی نگاہ میں مجنوں ہی وہ نہیں
ذرّے کو جو نظر میں بیاباں نہ کر سکے

سالِ نو — "کس نے فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت مجھ کو" — علی سردار جعفری

پوری نظم افسانہ نمبر میں پڑھئے

نظریۂ حیات غالب کی نظر سے

سید سجاد علی مہر اکبر آبادی

بک رہا ہوں جنوں میں کیسا کیا کچھ!
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اگر یہ جنون خود ساختہ نہیں تو اور کیا ہے کہ شاہدِ ہستی کو غالب کی نظر سے دیکھنے چلا ہوں اور وہ بھی ذوقِ نظارۂ جمال کے تقاضہ ہائے پیہم سے۔ نوائے غالب کو صفحۂ قرطاس پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر گریہ بمقدارِ حسرتِ دل، اعتراف کم مائگی کے ساتھ قلم اٹھا رہا ہوں۔ اس لیے اغیار کے خندہ ہائے بیجا کا کوئی گلہ نہیں —

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اجزائے نگاہ و آفتاب منتشر ہیں، اُن کو یکجا کرنے کی جرأت کر رہا ہوں —

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ میری آواز حلقۂ اہلِ علم میں سے مجھ کو کوئی خراجِ تحسین وصول نہ کر سکے گی۔ اور نہ اس کی کوئی تمنا یا خواہش ہی تھی۔ ایک شوق تھا جس کی تکمیل کی آرزو، ایک خواب تھا جس کی تعبیر کا انتظار — چونکہ اعتراف کم مائگی کے خود اپنے دل کی ارزانی مجھے کچھ لکھنے سے باز رکھتی رہی مگر تمنا دو چند ... خامہ فرسا کا" چند سطور منصۂ ظہور پر آ ہی گئیں، گو وہ اہلِ بینش کے لئے کوئی دلچسپی فراہم نہ کر سکیں۔

غالب کی تراکیب "جمال دلفروز"، "صورتِ مہر نیمروز" اور "نظارہ سوز" کو غیر مانوس قرار دینے والے۔ اس کے اشعار کو لغو اور بے معنی کہنے والے ذرا اس طرف بھی دیکھیں کہ ایک "شاعرِ مہمل گو"، ہم کو کس قدر بیش قیمت درسِ حیات دے رہا ہے۔ میں اس وقت غالب کے اُن چند اشعار پر اکتفا کروں گا جن کے ذریعہ اس "شاعرِ آتش نفس" نے لوگوں کے ہیجانِ عمل کی آتش کو بھڑکانے اور مقصدِ حیات کو بلند کرنے میں مدد دی ہے۔ اور جن میں حیات کے مختلف پہلوؤں پر۔ زندگی کے نوعی اصولوں پر روشنی ڈال کر اربابِ خرد کے لیے وہ مواد فراہم کیا ہے جو تاقیامت درسِ حیات کی فراہمی میں مدد دیتا رہے گا۔

ہمدردی، اخوت، اور محبت جو نوعِ انسان کی مخصوص صفات ہیں اور جن کے بغیر انسان حقیقی معنے میں انسان کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے، اُس کے اشعار کے لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی ہیں وہ انسانیت و ہمدردی کا ایک ایسا نقش مرتسم کرتا ہے۔ جسے حوادثِ روزگار کے تھپیڑے کسی طرح بھی مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ صرف زندہ رہنے کی خاطر دنیا میں سانس لینا حقیقی زندگی نہیں ہے — ہاں اگر کسی مظلوم کی فریاد پر دل اُس کی مدد

کے لیے آمادہ ہو جائے۔ ہاتھ کسی کی اعانت کے لیے تیار
ہوں۔ پاؤں جادۂ راہِ وفا سے آشنا ہوں، آنکھیں کسی کی مصیبت
اور بے بسی پر گہر ہائے اشک نثار کریں، تو یہ ہے زندگی۔ غالب
کہتا ہے ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اس شعر کے ذریعہ اس نے ہمدردی کا وہ سبق دیا ہے
جو ایک انسان کی زندگی کو کامل بنانے کے لیے کافی ہے۔
انسان کی زندگی بغیر جذبۂ ہمدردی کے یقیناً نامکمل ہے کیونکہ یہی
جذبہ مابین حیوان و انسان طرۂ امتیاز ہے۔ اس شعر میں وہ
کسی خاص طبقہ یا قوم کی تخصیص نہیں کرتا بلکہ محبت کا ایک
عالمگیر پہلو پیش کرتا ہے جو امتیازِ "ما و تو" کو بالکل فنا کر دینے
والا ہے۔ اُس آدمی پر کس طرح لفظ "انسان" کا اطلاق کیا
جا سکتا ہے جو اپنے اندر جذبۂ ہمدردی و ایثار کو فنا کر چکا ہو
اور بنی نوعِ انسان کی تکلیف پر مدد دینے کے لئے آمادہ
ہو جانا تو درکنار لفظی ہمدردی کو بھی کام میں نہیں لاتا اور
پھر ہم کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"
ایسا شخص انسان صورت تو ضرور ہے لیکن انسان سیرت
نہیں۔ خلقت اُس کی تکمیل عمر اور زندگی اُس کی موت کا نام ہے
لیکن اگر غالب کے مندرجۂ بالا شعر پر عمل کیا جائے تو آنکھ
سے گرنے والا ہر ہر قطرہ زندگی کا ثبوت ہو جائے۔

"غم" اور "زندگی" یہ دو الفاظ ایسے ہیں جو ایک دوسرے
سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اس پردۂ دنیا پر ہم کو کوئی نظیر ایسی
نہیں ملتی کہ کسی شخص نے کسی نہ کسی قسم کے غم کا تجزیہ نہ کیا ہو۔
رنج و الم انسان کی زندگی کے جزوِ اعظم ہیں اور یہ ایک ایسی
حقیقت ہے کہ جس سے کسی طرح انکار بھی نہیں کیا جا سکتا
چنانچہ غالب کہتا ہے۔ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حیات و غم اس قدر ایک دوسرے سے متواصل ہیں کہ
سوائے موت کوئی دوسری چیز ان دونوں کو ایک دوسرے
سے علیحدہ نہیں کر سکتی جب تک انسان زندگی کی گھڑیاں گن
رہا ہے اس وقت تک اُسے پیمانۂ الم کو بھی منہ سے لگانا
پڑے گا۔ لیکن غم کے بوجھ سے تھک کے بیٹھ جانا، رنج و آلام
میں ہمت ہارنا یقیناً بزدلی کے مترادف ہوگا۔ غالب ہم کو
مصیبت میں رہ کر زندگی کی دشوار گذار منازل کو طے کرنا
سکھاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دنیا کے بحرِ بیکراں میں کشتیِ حیات کو غم و الم کے تھپیڑوں
کے درمیان کامیابی کے ساتھ کھے لے جانا، یہ ہے زندگی۔
شکایتِ رنجِ گراں نشیں کے بجائے وہ ہم کو قوتِ صبر آزما
پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہمت و استقلال کو کسی حالت
میں بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے یہ ان کے اشعار کے حرف
حرف سے ظاہر ہے۔ مصائب و آلام کا ہمت کے ساتھ مقابلہ
کرنا اُس کے الفاظ الفاظ سے آشکار ہے۔ غرض ہمدردی و محبت
استقلال و ہمت کے وہ گراں بہا اسباق پیش کرتا ہے جو ایک
انسان کو شاہراہِ زندگی کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں کافی
ساتھ دیتے ہیں۔ وہ غم کو کس قدر خندہ پیشانی سے برداشت
کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

وہ نوحۂ غم کو بھی ایک دلچسپی کی چیز سمجھتا ہے۔ اگر نغمۂ شادی اُسے خوش کرنے کے لئے نہیں ہے تو وہ نوحۂ غم ہی کو ذریعۂ رونق بناتا ہے۔ اسی مضمون کو ایک جگہ اور کہتا ہے ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اُسے غم پست نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے ہنگامہ آ کر خوش ہوتا اور غنیمت خیال کرتا ہے۔ تجربۂ ہائے غم کے بعد وہ سراپا ساز آہنگ شکایت نہیں بلکہ گلچیں گلستان تسلی نظر آتا ہے وہ بجائے نڈھال ہونے کے اسی غم کو اپنے لئے دلجمعی اور دلبستگی کا سامان قرار دیتا ہے۔

لیکن پھر بھی وہ اس عارضی زندگی کو جو اسے دی گئی ہے اور جو وہ بہت استقلال کے ساتھ بسر کرتا ہے حقیقی زندگی خیال نہیں کرتا۔ وہ اس مستعار زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتا اور اس کی بلند نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ زندگی جو دراصل ایک حباب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی غالبؔ کی نظر میں سراسر سراب معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس زندگی اور اس کی تمام لطافتوں اور رعنائیوں کو ہیچ خیال کرتا ہے۔ ایک جگہ اسی مضمون کو اور کہتا ہے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

عالم سراپا جو تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے غالبؔ کے سامنے آتا ہے لیکن وہ اُسے ایک نظر کا دھوکا اور وہم خیال کرتا ہے۔ اس پر نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ ایک غیر مستقل اور مستعار زندگی کو لذت آشنا بنانا نہیں چاہتا۔ ؏

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

ایسی موہوم اور بے اعتبار زندگی سے دل لگانا جسے فنا کے تھپیڑے ایک دم میں برباد کر دیں غالبؔ کے نزدیک بالکل بیکار اور لاحاصل ہے۔ وہ جیتا ہے۔ مرنے کی خاطر۔ چنانچہ کہتا ہے :- ؏

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

لذت زندگی صرف خیال فنا ہی سے حاصل کرتا ہے منزل فنا اس کے لئے کس قدر شیریں ہے کہ اس کا خیال ہی زندگی میں اس کے لیے باعثِ زندگی ہے۔ وہ صرف اس خیال سے زندہ ہے کہ "جلوۂ برق فنا" کا نظارہ کرے گا اس کی یہی رعنائی خیال اس کی پریشانی خاطر رفع کرنے کے لیے کافی۔ اور یہی محشرِ خیال اس انجمن ناز میں اس کے لئے وجہ تسکین ہے۔

وہ حیاتِ زندہ کا قائل ہے۔ حیاتِ مردہ کا نہیں۔ حیاتِ زندہ اُسے عالی حوصلگی کا درس دیتی ہے اور حیاتِ مردہ پست ہمتی سکھاتی ہے۔ بلند ہمتی کو انسان کی عین فطرت سمجھتا ہے۔ پست ہمتی اس کی نظر میں ذلیل و خوار ہے۔ وہ دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ انسان کے دماغ میں قدرت نے وہ قوتیں ودیعت کی ہیں جو دنیا کی کسی اور شے میں نہیں۔ وہ انکو صحیح طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ صرف فضا میں سانس لینا زندگی نہیں ہے۔ حیات نام ہے جنبشِ پیہم کا

حیات تلخ ہے اُس آتش سیال کا جو انسان کے جذبہ انسانیت کو جلا کاتی رہتی ہے۔ جدوجہد انسان کی زندگی کے دو مترادف نام ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

شورشیں بیداد کے ہی زندگی کی جان ہیں
سکون اور سکوت میں مزہ کہاں حیات کا

سکون اور خاموشی کے ساتھ تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھنا یہ جینا مرنا ہے ــــ دونوں بازوؤں کی قوت کو جہد البقاء کے لئے استعمال کرنا یہ ہے زندگی ــــ ہیجان عمل کی آتش کو تیز تر کرنا ہی مقصد حیات ہے ورنہ زندگی زندگی کہلانے جانے کی مجاز نہیں۔ درحقیقت انسان کی زندگی بغیر شورش اور عمل کے بیکار ہے حیات کا حقیقی لطف اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب کسی خاص مقصد کے ماتحت جوش اور سرگرمی کا اظہار کیا جائے۔

غالب نے حیات کے مختلف پہلوؤں پر اپنی رائے ظاہر کی ہے کہیں استقلال و صبر کی تلقین کرتا ہے تو کہیں شورش عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ غرض کہ وہ کوئی کسر انسانی ترقی کی کوشش میں اٹھا نہیں رکھتا۔ تمام انسانی کمزوریاں ایک ایک کر کے محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقی شاہراہ پر روشنی ڈال کر انسان کو اُسی پر چلنا سکھاتا ہے۔ انسانی ترقی اور تکمیل انسانیت کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک ایک کر کے گنواتا اور پھر اُن پر عمل کرنا بتاتا ہے وہ انسان کو طرح طرح کے ہوش دلا کر زریں اصولوں پر کاربند ہونے کے لیے اُبھارتا ہے۔ غرض وہ اپنے ان چند اشعار کے ذریعہ ایک ایسا مکمل درس حیات دے گیا ہے کہ جس کی پیروی کرنے والا مظہر انسانیت بن جاتا ہے اور لوگوں کی نظریں اُسی انسان میں صفات انسانیت کو تلاش کرتی نظر آتی ہیں ــــ

عالمِ یاس

شیلے کی ایک نظم "اسٹینزاز ریٹن اِن ڈیجیکشن نیئر نیپلز" کا ترجمہ

احمد مجتبیٰ زیدی فیض آباد

دھوپ کی کرنیں ہے مطلع صاف اور جل کا جوش
نیلگوں ننھے جزائر اور کوہِ برف پوش
بکھرا ہے سرخ ابرِ صبح کو سنہرا آفتاب
اک طرف غنچوں کے گرد و پیش ہے روحِ شراب
گونجتا یہ وقت ہے جس وقت ہر آواز نے
شورِ دریا نے ہواؤں نے پرِ پرواز نے
جذبۂ ناآشنا کا ساز دل میں چھیڑ دیا
لطفِ تنہائی کو ان سب نے دوبالا کر دیا

تہہ نشیں سبزہ اور سیوار ہے یوں پانی میں
جسمِ سیمیں پر نمایاں ہوتی ہیں جیسے رگیں
یوں چمکتی ہیں لبِ ساحل پہ موجیں بحر کی
ماہ پارے جیسے حل کر دے سمندر میں کوئی
اضطرابِ نغمہ اک پیدا ہے موجِ آب سے
آنکھیں خیرہ ہیں مری مہرِ منور تاب سے
بے سکون تنہائی میں میری یہ سب کچھ ہے خراب
بیکسی ہمدم کے یہ نقشِ مناظر ہیں بر آب

کیا کروں شیرازۂ جسمانی ہے بکھرا ہوا
قلب کو راحت نہیں تو یاس کا کیسا گلا
بے نیازی عجزِ فقیرانہ بھی تو حاصل نہیں
درد کا احساس جس کو ہو نہ وہ دل نہیں
لطفِ الفت لطفِ شہرت لطفِ فرصت دوام
پھر مستغنی ہوں یاں سے اور رہیں محروم ہم
زندگی کو جو کہتے ہیں اور ہنس کر عیش سے
اور ہی تریاق بنتا ہے ستم پر سب کے لئے

مشکل کا سوال پھر شوق ساماں ہو نہیں
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"
جی میں ہے لیٹا رہوں کچھ دیر یکسر میں خاک پر
طفلِ اک معصوم کے جو تھک گیا ہو کھیل کر
پھر بہا کر اشکِ غم پہلو کی بیش کچھ کم کروں
بے تابیِ اندوہ کے طوفاں سے بیگانہ ہوں
مجھ پہ طاری موت کی سی نیند تب ہونے لگے
انفاسِ گرم میرے جسم ٹھنڈا ہو چلے

اودھر سے تخیلِ غم مزدہ میں یہ سرسری ہوا
الوداعی راگ کو اپنی بنا جائے قضا!

افیونی

چودھری محمد علی

افیونیوں کا حال سننے سے پہلے تھوڑا سا افیون کا حال سن لیجئے اس میں فائدہ ہی ہے کوئی حرج نہیں ہوا اس کے بعد افیونی کا حال سن کر جی بھر کے ہنس لیجئے افیون کا پودا آپ نے دیکھا ہے یہ ڈیڑھ سے چار فٹ تک بڑھتا ہے اور اس کے سرے پر سفید پھول لگتا ہے پھول کے بیچ میں ایک ڈونڈی ہوتی ہے پنکھڑیوں گرنے کے بعد ڈونڈی میں کسی نوکدار چیز سے لکیریں بناتے ہیں جس میں سے افیون رس کر ڈونڈی پر سوکھ جاتی ہے ڈونڈی کے اندر بیج ہوتے ہیں جس کو پوستہ کہتے ہیں اس سے مٹھائی بنتی ہے اور دوسری طرح کھائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی پھول لال ہوتا ہے آپ نے اردو شاعری میں لالہ کا ذکر سنا ہوگا اسی افیون کے سرخ پھول کو لالہ کہتے ہیں افیون سے بہت سی چیزیں نکلتی ہیں جو دوا کے کام آتی ہیں اس میں کئی طرح کی الکلی کی طرح کی ایسڈ ہوتی ہے اس کا ذکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں! بیہوشی کی دوا بھی اسی افیون سے بنتی ہے۔ افیون کے نقصانات دنیا کو بہت دنوں سے معلوم تھا اور لوگ اس کے روکنے کی کوشش کیا کئے مگر خاص کر چین میں اس کی کھپت بہت رہی اور لوگوں نے فائدہ کی وجہ سے اس کی تجارت کو روکنا پسند نہ کیا صرف ہندوستان سے ۱۰ کروڑ سالانہ تک کی افیون باہر گئی ہے سنہ ۱۹۰۰ء میں انگلستان نے صرف ٹرکی سے کچھ اوپر ۶۴ لاکھ کی افیون خریدی تھی جس سے طرح طرح کی دوائیں بنتی ہونگی ۱۸۹۳ء میں ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا اس میں آٹھ آدمی تھے ۱۸۹۵ء میں ان کی رپورٹ نکلی ۸ میں ۷ آدمیوں نے رائے دی تھی کہ افیون سے بہت نقصان نہیں ہے جن کا فائدہ تھا وہ اس کی تجارت کو کیوں روکتے مگر چین نے جہاں افیون کی کھپت بہت تھی قسم کھائی کہ افیون نہ کھائیں گے لڑائی کے بعد لیگ آف نیشنز نے بھی زور دیا کہ افیون کی کھیتی روک دی جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ چین اس وقت تک جاپان ایسے بہادر ملک کے سامنے اڑا ہوا ہے۔ اب لکھنؤ کے افیونی کی کہانی سنئے :-

ہر جگہ کی کوئی نہ کوئی چیز مشہور ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی انوکھی چیزوں میں لکھنؤ کا افیونی بھی ہے۔ چین نے گلے پھر افیون کی ایسی آؤ بھگت کی کہ اپنے کو تباہ کر کے رکھ دیا مگر ایران کی پوچھئے تو لوگ اس کے ساتھ بیوفائی بھی کی اور ایسی آنکھ پھیری کہ جیسے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی۔ ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا پرانی یادوں سے خاص طور سے کی ایسی آنکھ پھرائی ہندوستان نے بھی جیسا چاہئے ویسا نباہ نہیں کیا مگر اس میں ہندوستان کا بس نہ تھا اگر یہاں کی کا وہ گہرا سہاگ دور ہا تو دوسروں کے ہاتھوں ایسا ہوا جیسے بعض گھروں میں ساس نندیں میاں بیوی میں پھوٹ ڈلواتی

ہیں اسی طرح اچھے والوں نے جہاں کہیں افیم اور افیونی کے
بیچ میں حلوا کر رکھ دی اور دیسے ایسے تاؤ دے تیار کئے کہ سوٹا
رواعلی سے نوبت بگاڑ تک پہونچی۔ بگاڑ سے بڑھی تو ختم
کچھا ہوگیا اگر بالکل ایسا نہیں ہوا تو بات اُس کے لگ بھگ
تو ضرور پہونچ گئی لکھنؤ کا افیونی اس کو ہمارے چنیا بیگم
کہتا تھا اگر یہ اُس کا ٹھیکہ سمجھئے تو لکھنؤ کو اس کی سسرال
جانئے جہاں پہونچکر افیون نے وہ مان جو مالک دوسرے نشہ
کو نصیب نہیں ہوا دوسری جگہ اگر کسی نے اس کو منہ لگایا تو
ڈبیہ میں گولی بنا کر رکھ لی بڑی بڑائی یہ کی کہ خدا اسیدکا پاؤڈر
اس پہ ڈال دیا اور وقت پر نگل گیا نہ زبان کو سواد ملا نہ حلق
تالو نے مزہ پایا کسی افیونی کی ایک ریوڑی کھو گئی وہ پیسہ
دو پیسہ کا تیل لایا اور چراغ جلا کر ریوڑی کو ڈھونڈنے لگا
لوگوں نے ہنسنا شروع کیا کہ میاں دمڑی کی ریوڑی اور اس کے
لئے یہ کھڑاگ۔ ادھے کا تیل جل گیا اتنے میں تو نہ جانے کتنی
ریوڑیاں آجاتیں افیونی نے جواب دیا کہ بھئی ریوڑی گئی
تو گئی تھی جیب میں اور پڑی ہوئی ہیں وہ ریوڑیوں کا کام نہیں
رنج تو اس کا ہے کہ کوئی بے رحم پائے گا دانتوں کے نیچے
رکھکر چبا جائے گا میں بھلا یوں تھوڑی کھاتا ہوں تو اس کو
دہان کے اندر پھیر کر اُس کو چوستا تالو میں چپکاتا زبان سے
دبا کر اُس کی ٹکیہ بناتا پھر زبان ہی کی لوٹ پلٹ سے اسکی
گولی بناتا اُس کو زبان کی نوک پر رکھتا وہ گولی منہ بھر میں
چکر پھیریاں لگاتی گھومتی اُس کا رس گھل گھل کر حلق میں
جاتا جوں جوں گولی چھوٹی ہوتی جاتی سارا مزہ بڑھتا جاتا
آپ جانتے ہماری یہ چنیا بیگم کی فقط پہیلی ٹھہری جب اس کا
یہ پہلو تھا تو اصل چنیا بیگم کی آؤ بھگت کتنی ہوگی لکھنؤ میں

افیون کی گولی کھانا بد تمیزی سمجھا جاتا تھا تعبیر اور لوگ اُس کو
گھول کر پیتے تھے افیون کا گھولنا ہر نو سیکھئے کا کام نہیں جلدی نہ
زور سے پھیرے نہ آہستہ سے یہ جو گولی انگوٹھے اور دو
انگلیوں کے درمیان میں آجائے جلکی پانی میں یوں ڈوبے کہ
گولی انگلیوں میں برابر گھومتی رہے اور پانی کا رنگ گہرا
ہوتا جائے مگر جو کالا یعنی افیون کی کیفیت پانی میں نہ ملنے
پائے جو گھلی ہوئی افیون کو خون کبوتر کہتے ہیں اگر افیون
کم ہوئی یا پانی زیادہ ہوا تو رنگ چوکھا نہیں آسکتا اعلیٰ افیون
کا گھولنا ایسوں ویسوں کا کام نہیں تھا کہتا اور لے دوڑی۔

رستم سے ذرا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
یہ کام نہیں ہے جو ہر کار سے ہر مرد سے

یہ تو وہ افیون ہوئی جو بندھے ٹکے پر وقت پر پی جاتی
تھی ناوقت کی افیون کو ٹھکی کہتے تھے یہ بڑے مزے
کی چیز تھی جب یار دوست اکٹھا ہوگئے تب ہی چلنے لگی
افیون کو لوگ کہتے ہیں کہ سب بیماریوں کی دوا ہے اور خود
بیماری ہے یہ بات تو حکیم ڈاکٹر جانیں ہم نے تو یہ دیکھا ہے
کہ افیونی میں بہت سی باتیں ایسی ہو جاتی ہیں جو بے افیون
کھائے دوسرے میں نہیں دکھائی دیتیں باتوں میں نرمی۔
آپس میں میل محبت غصہ کے اوپر پورا قبضہ۔ چال میں نرمی بھی
والی دوسرے کو کہاں نصیب ہ انگلستان کے مشہور ادیب
ڈی کوئنسی لکھتے ہیں کہ افیم کھا کر مجھکو سب سے زیادہ مزہ
اسمیں آتا تھا کہ شہر کی گلیوں میں پھروں غریبوں کی حالت
دیکھکر میرے دل میں ہمدردی اور نرمی بڑھ جاتی تھی افیونی
کی چال میں وہ ہلکا پن ہوتا ہے کہ دھمک کیسی آدمی پاؤں
کی آہٹ نہ پائے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غبارے پر بیٹھے

چلے جاتے ہیں بھنگ کے نشہ میں یہ عیب ہوتا ہے کہ خیالات
پر قابو نہیں رہتا مگر جس کے خلاف آ گئے تو ہنستے ہی چلے جاتے
ہیں اگر کسی کی باتیں دماغ میں گھس گئیں تو وہی دہراتے رہتے ہیں فرانس
کے مصنف ڈلیبرٹ نے بھی لکھا ہے افیون میں ایسا نہیں یہاں
جس طرح کی بات ہو جو دماغ میں آ گئی پھر اپنے بس میں
کوئی بات محبت کے خیالات کا ہیکو نہ ہیگا۔ افیونی کو بھی
بہت سی باتیں سمجھ کے کھانے میں وہ مزہ آتا ہے کہ بادشاہ کو
نصیب نہیں۔ آصف الدولہ بہادر لکھنو کے نواب جن کی سخاوت
مشہور ہے ان کا نام لیکر لکھنو کے دوکاندار آج تک صبح کو
دوکان کھولتے ہیں ان کے وقت میں بہت سے نشے باز اور
افیونی جو کسی کام کے نہ رہ گئے تھے مفت کی تنخواہیں اور
کھانا پاتے تھے کیونکہ بادشاہ کا فرض تھا کہ اپنی رعایا کی طرح
کی خبر لے۔ آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خان جو بیٹھے۔ یہ
بڑے منتظم تھے انہوں نے دیکھا کہ بہت سے ہٹے کٹے تندرست
مفت خور ہے نشہ بازی کا بہانہ کرتے ہیں کام کاج کے
نکھٹو بیان کرتے ہیں رات کو افیونیوں کے اوپر پہرہ مقرر
کرایا کہ کوئی کھا لے۔ نتیجہ یہ کہ بہتوں نے توبہ کر لی بہت بیمار
ہو گئے کتنوں نے بادشاہ کو صلواتیں سنائیں کچھ ایسے بھی
تھے جنہوں نے بادشاہ کا حکم نہ مانا اور خوب کھایا صبح کو
سب کا حال بادشاہ سے بیان کیا گیا جن لوگوں نے ضبط کر لیا
تھا ان کی تنخواہیں بند کر دی گئیں کہ یہ پکے افیونی نہیں ہیں
اب اگر چاہیں تو اپنی محنت سے روزی کما سکتے ہیں باقی لوگوں
کی تنخواہیں بحال رہیں کیونکہ یہ بیچارے بیکار اور بے بس تھے
افیم کا عمل ایسی عجیب کے کہ جس پہ عمل کرو نہ اچھلتے ہیں
آپ کی چال ٹھیک بنانے میں کمال ہوتا ہے لیکن افیونی جو بھی

تھوڑے سے دن ہوئے مرے ہیں کانپتے تھے کسی نے پوچھا کہ آنکھ
کیسے گئی کہنے لگے کہ نواب صاحب کے یہاں مصاحب تھے تمام
تمام شام چنڈو پیتے رہتے تھے کہ پینک آ گئی اور منہ کے بل
سر کے بل نیچے پڑا رہا جو آنکھ میں گھس گیا ان لوگوں میں میل
محبت کا یہ حال ہے کہ اگر مٹھائی کی ایک ہی ڈلی ہے تب بھی
جتنے یار دوست ہیں ذرا ذرا چکھ لیں گے کل کھلانے پائیں
ذرا نے پائے گا ایسے پیار سے ایک دوسرے سے باتیں کریں گے
تاکہ پھر بولیں گے واللہ کتنا ہوگا تو والا کہیں گے آغا
کہ آغاں کہیں گے مجھے دار باتیں ایسی ہونگی کہ دل موہ لیں
داستان کہنے پہ آ گئے تو وہ سماں باندھیں گے کہ آنکھوں کے
سامنے چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیں اگر پینک میں آ گئے
تو گھنٹہ دو گھنٹہ کی خبر لی پھر کیا مجال جو کوئی یار دوست ٹہوکا
دیکر چونکا دے پینے کا سونا اور سوتے میں اُس کا مسکرانا
دیکھکر ہاں کیا خوش ہوگی جو ایک افیونی دوسرے کی پینک
سے باغ باغ ہوتا ہے اور پینک والا بھی جب چونکا تو
باتوں کا سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے پینک
آئی تھی کیا ممکن جو داستان کے لفظ دوسرے میں کہیں سے
بھول آجائے۔ دو دکی تکلیف ان لوگوں کو بالکل نہیں معلوم
ہوتی قصہ مشہور ہے کہ دو افیونی سو رہے تھے ایک نے
کروٹ لی اور دھم سے زمین پر آ رہا گرنے کی وجہ سے چونک
تو پڑا اگر پھر بھی اپنی جگہ نہ ہلی دوسرے سے پوچھنے لگے۔
"اجی آغا صاحب یہ دھماکا کہاں ہوا؟" دوسرے نے کہا کہ بھئی
واہ تم اب چارپائی پر سے گر پڑے اور تم کو خبر نہیں ہوئی پوچھکر
کہنے لگے ماؤں سچ کہا تم نے بڑی چوٹ آئی جس طرح پینک
میں وقت کا پتہ نہیں چلتا اسی طرح نشہ میں فاصلے کا پتہ بھی

غائب ہو جاتا ہے ایک افیونی کی بات کہ چلم بھرنے کے لئے آگ
کی ضرورت ہوئی چلم بھر لئے، مگر آگ لینے چلے وہاں سے
سے نکلتے ہی سڑک کی بڑی دور کی لالٹین سے کوئلہ جلانے
لگے اور ایک ایک کر کے سب کوئلے پھینک دیئے کہنے لگے
ڈالو ان سب میں بھی کوئلے دو دیکھے دے سکے اور خالی چلم لئے
گھر چلے آئے اسی طرح ان لوگوں کو اپنے تن بدن کا ہوش
نہیں رہتا ایک افیونی کی گھولی ہوئی افیم چوہا آکر پی جاتا تھا
چوہے کے افیون پینے پر آپ تعجب تو کیجئے جیسا کہ منی کے
چوہے سیانے مانے جاتے ہیں تو افیونی کے گھر کے چوہے
افیونی کیوں نہ ہوں انیسویں صدی کے آخر میں جب لکھنؤ کے
چنڈو خانے تالا لگا کر بند کر دیے گئے لوگوں کا بیان ہے کہ ان
مکانوں میں نہ معلوم کتنی چھپکلیاں اور چوہے جنہوں نے
چھت میں بلیں بنا لیں تھیں مر گئے ان کو ہمیشہ سے چنڈو
کے دھوئیں کی عادت ہو گئی تھی آدمیوں نے اپنی جان بچانے
کی کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لی مگر بے چارے افیونی ملا
کر دی اپنی اپنی نکال الگ الگ رکھ لی جانور بیچارے کیا
کرتے ان کی جان پر بن گئی! ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک افیونی
کی گھولی ہوئی افیون چوہا آکر پی جاتا تھا ایک دن اسکو پکڑنے
کی تاک لگائی پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھے اور پٹی کے نیچے
افیون کی کٹوری رکھ دی حقہ کا چیشہ منہ سے نکال کر ہاتھ پر
پر رکھ دیا کہ اسی سے پکڑیں گے! پینک سے چونکے تو اپنے
پاؤں کے انگوٹھے کو چوہے کا سر سمجھے آہستہ آہستہ جلتا ہوا
چیشا اٹھایا اور بہت پھرتی سے جھک کر انگوٹھا پکڑ لیا جلتا
ہوا چیشا کھال کے اندر اتر گیا۔ بے چین ہو گئے کہنے لگے کاٹ
کمبخت کاٹ اگر میں چھوڑنے کا نہیں۔ افیونی کی دنیا ہی
دوسری ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں عیش باغ کا میلا لگنے زمانہ میں
بہت مشہور چیز تھا یار دوست جمع ہوتے تھے جوتے پڑتے
تھے ہر طرح کے لوگوں کی ٹکڑیاں الگ الگ جمع تھیں بھیڑ
بہت سے بیکر لمبی رات گئے تک رنگ جما رہتا تھا ایک افیونی
نے دوسرے افیونی سے کہا انا للہ عیش باغ کے میلے چلتے
ہو؟ اس نے کہا یار چلیں گے مگر دو رات دیر میں پہنچیں گے اس نے
کہا بھلا وہاں ایک دوسرے کو ڈھونڈے کیسے لیں گے؟
اس نے کہا اماں ہم بتائیں مٹی کی قندیلیں بیچی جاتی ہیں
کہو ہاں تو بس ایک قندیل لے لینا وہ ڈھونڈ کر اسے جلا کر لینا
اور جلا کر گلے میں لٹکا لینا ہم جب آئیں گے تم کو دور ہی سے
جان لیں گے پہلے دوست نے یہی کیا مگر گلے میں قندیل لٹکائے
لٹکائے تھک گئے اس کو اتار کر ایک پیڑ کی ڈالی میں لٹکا
دیا اور خود تھوڑی دور پر دوسرے پیڑ کی ٹیک لگا کر دوست
کا راستہ دیکھنے لگے پینک آ گئی جب پینک سے چونکے اور
قندیل کو دور سے دیکھا سب باتیں یاد آ گئیں کہنے لگے۔
"اب بھی ہمارا دوست ہم کو نہ پہچانے تو غضب ہے وہ سامنے
ہم کھڑے ہیں! — اب تو مکتبوں کا رواج ہی اٹھ گیا
نہیں تو ہر جگہ مکتب تھے محلے میں دو دو تین تین مکتب ہوتے
تھے ان مکتبوں میں اگر لڑکوں کی خوش قسمتی سے افیونی
مولوی صاحب ہوئے تو لڑکوں کی چاندی تھی ایک مولوی
صاحب مکان کے قریب ہی پڑھاتے تھے ایک دن ان کے
شاگردوں نے آکر حال بیان کیا کہ مولوی صاحب ہاتھ میں
حقہ لئے ٹہل ٹہل کر پی رہے تھے کہ ایک شاگرد نے تختی
دکھائی دوسرے ہاتھ میں تختی لے لی اور دیکھنے لگے دیکھتے
دیکھتے پینک آ گئی ذرا دیر میں چونکے تو حقہ پھینک دیا اور کہنے

لگے بہت خوب کہی ہے پھر ٹھکرائی اور حقّہ کی نے کو منھ
میں لگا کر حقّہ کی طرح پینے لگے۔ افیون کا اثر دور جانے کیا
ہوتا ہے کہ آدمی پانی سے ڈرنے لگتا ہے۔ بہت لڑکپن
میں ایک افیونی تھے بہت زمانہ ہوا بیچارے مر گئے مگر
پھر بھی نہاتے نہیں تھے خود کہتے تھے کہ اپنے بس بھر
تو پانی نہیں چھوا ہے مرنے پر دوسرے نہلا دیں تو نہلا دیں
اگر آپ ان کو دیکھتے تو اُن کے دعوے میں شک نہ کرتے
تیس چالیس برس کا زمانہ ہوتا ہے ایک انگریزی داں
صاحب ہوتے تھے پہلا افیونی باتیں کر رہے تھے انھوں نے
چھیڑنے کے لیے کہا کہ سرکار افیون کی کاشت روکنے
والی ہے بس پھر کیا تھا جتنے افیونی اس جگہ تھے بھپر
پڑے۔ ان لوگوں کو غصہ سے کیا واسطہ مگر اس خبر کو
سنتے ہی بیتاب ہو گئے کہنے لگے سرکار اس دھوکے
میں نہ رہے اگر ایسا کیا تو بڑی گھمسان لڑائی ہوگی۔ اماں
جب افیم ہی نہ رہی تو جی کے کیا کریں گے۔ بی چنیا بیگم
نے بیچنے پر تین حرف! مجھے کیا ہو توپ کے منھ میں ڈال
دیں پر ارے کوئی پیچھے ہٹنے والے ہیں۔ ان صاحب نے
کہا سرکار نے اس کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا ہے آگ
بجھانے والے انجنوں میں برف کا پانی بھروا کر دور ہی سے
وہ فوّارے ماریں گے کہ آپ لوگ نوک دم نکل جائیں گے۔
سن کر سب کا جوش ٹھنڈا ہو گیا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
کہنے لگے تو یہ کہو موت ہی کا سامنا ہے! — ہاں تو چین
اور ایران اور دوسرے ملکوں میں بہت دنوں سے ہے
مگر لکھنؤ نے اس کے دھوئیں کو ٹھنڈا اور خوشبودار بنا
نے کی ترکیب دوسری نکال ہی لی۔ حقّہ کا دھواں گرم
ہوتا ہے لکھنؤ کی مدک ستی کے حقّہ پر پی جاتی ہے جس کا
دھواں پانی میں سے ٹھنڈا ہو کر منھ میں آتا ہے چنڈو بھی
افیون کی ہمراہ ہوتی ہے مدک میں افیون کو آگ پر گلا کر
بنگلے پان کے پتوں میں لت کرتے ہیں اور چلم کو زور سے چھیدا
کر لیتے ہیں اس پر پیتے ہیں اس کا سوندھا سوندھا دھواں اور ہی کیفیت
رکھتا ہے کوئی چلم کو اسے محبت کے مہر دکتے ہیں۔ افیونی
چاہے فرانس کا ہو یا انگلستان کا چین کا ہو یا ایران کا یا
جنت نشان ہندوستان کا سب کے سب ایک بات میں
ہم خیال ہیں یعنی یہ دنیا ہم کو پسند نہیں اگر بس چلتا تو اسکو بگاڑ
بگاڑ کر عمر خیام کی طرح ایک دوسری دنیا بناتے جس میں درد
نہ ہوتا تکلیف نہ ہوتی اور تخیل کے مزے ایسے ہوتے کہ
زمین پر ہی بیٹھے بیٹھے آسمان کی خبر لایا کرتے!

(بہ اجازت ڈاکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

ضروری اطلاع

۱- ہماری اپنے لکھنے والوں سے گذارش ہے کہ وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ تمام افسانے اور نظمیں ہمارے "افسانہ نمبر" کے لیے ۱۰ دسمبر تک دفتر میں پہونچ جائیں۔

۲- "افسانہ نمبر" ۱۰ جنوری [illegible] کو شائع ہوگا۔ ہم اپنے خریداروں سے اس دیری کی ابھی سے معافی چاہتے ہیں۔ "افسانہ نمبر" اگر پندرہ تاریخ تک نہ پہونچے تو ہمیں ایک خط لکھیئے اور ساتھ ہی اپنے ڈاکخانہ کو بھی اطلاع دیجئے۔

منیجر

کلامِ سائل

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم

ہمیں کو منتخب فرمائینگے دل دیکھنے والے
ہمیں ہیں جوہرِ شمشیرِ قاتل دیکھنے والے

ستمگر ہیں بہت کم رقصِ بسمل دیکھنے والے
جگر سے ہاتھ دھو لیں جو نہیں دل دیکھنے والے

یہی گر جلوہ ریزی ہے جو گنبد کی اہلِ عرفاں پر
کرینگے بات بھی تم سے بمشکل دیکھنے والے

تقاضائے دل و دیدہ ہے بے معقول ادا ہونا
ہیں دونوں جان انزارہ قاتل دیکھنے والے

نہ قیس ناقہ باقی ہے نہ دشتِ نجد میں مجنوں
اٹھائیں پردۂ بے چاک محمل دیکھنے والے

ہجو سے بے تعلق ہے ہماری بادیہ گردی
نہیں نقشِ کفِ پا اپنی منزل دیکھنے والے

لئے بیٹھے ہیں آئینہ بغل میں یہ تمنا ہے
کہ تجکو دیکھ لیں اُس کے مقابل دیکھنے والے

جوابِ لن ترانی پر نہ تیور دھیل کر لینا
مزا تو جب ہے جب ہو جائیں قائل دیکھنے والے

یہی دم خم دکھائے تیغِ ابرو نے اگر تیری
کہیں گے دیکھ لیجیو مجکو قاتل دیکھنے والے

بتوں کو مات کرتے ہیں ترے مشتاقِ نظارہ
خبر محفل کی لے تصویرِ محمل دیکھنے والے

تمھیں کیوں بن دکھائیں کیوں بھی ایسوں سے پہ صدقہ دو
بڑے ہیں مانگنے والے بڑے دل دیکھنے والے

جنھیں آنکھیں خدا نے دی ہیں اُن سے چھپ نہیں سکتے
تمھیں پہچان لینگے صاف سائل دیکھنے والے

کارل مارکس کی رومانی زندگی

ملک سلمان الارشد۔ فاروقی

سوشلزم موجودہ دور میں ایک خاص اہمیت حاصل کرچکا ہے۔ اور اس کے معتقدین کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ سوشلزم کو یہ مقبولیت جن ہستیوں کی بدولت حاصل ہوئی۔ ان میں سے کارل مارکس کا درجہ سب سے بلند و برتر ہے اور اسی وجہ سے کارل مارکس کو سوشلزم کا پیغمبر کہا جاتا ہے۔ محبت جو ایک فطری جذبہ ہے اس کا شکار کارل مارکس بھی ہوا۔ اور اس کی محبت بہت دلچسپ اور پُر کیف ہے۔

جس زمانہ میں کارل مارکس برلن یونیورسٹی میں فلسفہ اور قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اس وقت اُس کی شناسائی ایک فوجی انسپکٹر ویسٹ فیلسن سے ہوگئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے

ویسٹ فیلسن کی لڑکی گینی اپنے حسن و خوبصورتی کی بنا پر ایک خاص شہرت کی مالک تھی۔ اس کی نرگسی آنکھیں۔ پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ ستواں ناک۔ گہرے سرخ گلاب کے مانند رخسار۔ ہزار ہا نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنا چکے تھے

کارل مارکس اپنے دوست کے ہمراہ اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ اور اس طرح سے اس کا تعارف گینی سے ہوگیا اور اس کے حسن کا جادو کارل مارکس پر بھی چل گیا۔ اور وہ بہت بری طرح سے اُسکے تیر نظر کا گھائل ہوگیا۔ مگر گینی نے کوئی توجہ نہ کی۔ لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ کارل مارکس اس کی پرستش کرتا ہے تو وہ اسے تحقیر سے دیکھنے لگی۔ مارکس ابتدا ہی سے حساس واقع ہوا تھا۔ اس لئے وہ گینی کے اس طرز عمل سے بہت متاثر ہوا۔ اور اسی اثر کی بنا پر اس کی شاعری کا آغاز ہوا۔

عوام میں مشہور ہے کہ ویسٹ فیلسن نے کارل مارکس کو شاعر بنایا۔ حالانکہ اس کی شاعری کی بنیاد گینی کے تغافل کی بنا پر ہوئی۔ مارکس جب کوئی تازہ نظم کہتا تو وہ ویسٹ فیلسن کو ضرور سناتا۔ کیونکہ اس طرح سے گینی بھی اسے سن لیتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت وہ اپنی تازہ نظم لے کر گیا۔ اتفاق سے ویسٹ فیلسن وہاں موجود نہیں تھا۔ کارل مارکس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر گینی سے اظہار محبت کر دیا۔ گینی اس اظہار پر بہت افروختہ ہوئی۔ اور اسے سخت سست کہا اور اسی وقت گھر سے نکال دیا۔

بیچارا مارکس اس سانحہ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اسنے اُن تاثرات کو فوراً نظم میں منتقل کر دیا۔ دو تین روز بعد جب ویسٹ فیلسن اسے اپنے گھر لے گیا اور کوئی نئی چیز سنانے کی فرمایش کی تو مارکس نے وہ نظم جس کا عنوان اُسنے "مفلس کا اظہار محبت" رکھا تھا۔ ایک خاص پُرسوز لہجہ میں سُنانا شروع کیا۔

مفلس!
دنیا کا ٹھکرایا ہوا ہیرا ہے۔
جس کی آب و تاب سے لوگ ناواقف ہیں
اس کے پاس جذبات ہوتے ہیں، انمول پاکیزہ
آہیں ہوتی ہیں۔
اور کچھ ظلم کی داستانیں!
جن کے بوجھ سے اس کی روح دبی ہوتی ہے۔
لیکن اس روحی اذیت کے باوجود وہ نہایت خوش
اور بشاش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔
اگرچہ اس کا دل مرجھایا ہوتا ہے۔
مگر۔۔۔ کبھی ایک سلطیف کرن اس کے غمگین خانۂ
دل کو منور کر دیتی ہے
اس کرن کا نام
محبت ہے!
وہ مسرور رہتا ہے۔
اس نعمت کے مل جانے پر!
اس وقت وہ اپنے افلاس کو بھول جاتا ہے۔
اور ایک عام انسان کی طرح اپنی تمنا کا اظہار
کر دیتا ہے۔
مگر۔۔۔ مغرور حسن!
جو دولت و حشمت کا طالب ہوتا ہے۔
اُسے ٹھکرا دیتا ہے۔
اور اسی لیے مفلس کا محبوب اس کی تحقیر کرتا ہے۔
مضحکہ اڑاتا ہے۔
نفرت کرتا ہے

لیکن افسوس!
وہ انسانیت کی قدر نہیں کرتا۔
وہ روح کی پاکیزگی کو نہیں دیکھتا۔
وہ ان گہرائیوں تک نہیں پہنچتا جو انسان کو انسان
بناتی ہیں۔
شاید حسن مفلس کے لیے اندھا ہوتا ہے
کیا ایک مفلس کو۔
محبت کرنے کا حق حاصل نہیں!
محبت جو ایک ایسا دریا ہے جس کا پانی سب پی رہے ہیں
اُس پانی کے پینے کے لیے امیر اور غریب کی
تمیز کیسی؟
جو پیاسا ہو پانی پیے۔
کیونکہ پیاس لگنا ایک لازمی امر ہے
محبت قدرت کی طرف سے عطا کیا ہوا ایک انعام ہے
اور اس کا عطا کرنے والا
ایک بہت بڑا بادشاہ ہے۔
شہنشاہوں کا شہنشاہ!۔
بادشاہوں کا پیدا کرنے والا۔
دولت و حشمت بخشنے والا۔
اس لیے اے محبوب!
تو مفلس کی محبت کو نہ ٹھکرا!
کیونکہ اس طرح تو ایک گناہِ عظیم کا مرتکب ہوگا۔
دیکھ وقت ہے جاگ۔
دل کی آنکھ سے دیکھ!
جس وقت کارل مارکس یہ نظم پڑھ چکا۔ تو اُس۔

محسوس کیا کہ اس کے دل پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا
ہے۔ گینی اس نظم کو سن کر اس قدر روئی کہ اسکی ہچکیاں
بندھ گئیں۔ ویسٹ فیلیئن نے مارکس کو بہت داد دی۔

کارل مارکس کا یہ تحفہ بارگاہ حسن میں قبول کر لیا
گیا اور گینی اس کی طرف ملتفت ہوگئی۔ رفتہ رفتہ گینی
اور مارکس ایک دوسرے سے ملنے لگے گینی
پر مارکس کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ اس کے تمام خیالات
کارل مارکس جیسے ہوگئے ایک روز جب کارل مارکس اپنے
تصورات پیش کر رہا تھا گینی نے بے اختیار مارکس
سے کہا۔

"پیارے مارکس! آخر تم اپنے خیالات کی اشاعت
کیوں نہیں کرتے۔ وہ دنیا کے لیے انمول جواہر کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ کیا تم ڈرتے ہو کہ سرمایہ دار تم سے خفا ہو جائینگے
اور تم مصیبتوں میں گھر جاؤ گے؟ مگر مارکس! دلیری مرد کا
زیور ہے۔ اور جس کے پاس یہ زیور نہیں وہ مرد نہیں ہے۔
بلکہ عورت سے بھی بدتر ہے۔ اور بیٹی کے تہلکے سے بھی اسکی
وسعت کم ہے"

مارکس نے اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے آخری بار
قسمت آزمائی اور کہا ــ

"گینی! مصیبت سے میں نہیں گھبراتا بلکہ مجھے ایک شریک کار
کی ضرورت ہے۔ جو ایام مصیبت میں مجھے ہراساں نہ ہونے
دے۔ ورنہ میرے پائے استقلال میں لغزش آجائے گی۔ اور
میں اپنے خیالات کی اشاعت نہ کر سکوں گا۔ مگر میرے
شریک کار کے خیالات بھی میرے ہی ایسے ہوں اور اگر
ایسا شریک کار مجھے مل جائے تو گینی! میں کامیاب
ہو جاؤں گا۔ ضرور! ضرور!

گینی! تم اس معاملہ میں میری مدد کر سکتی ہو۔ دنیا میں شاید
تم ہی ایک ایسی ہستی ہو جو میری شریک کار بن سکتی ہے
گینی! معاف کرنا میں نے سچائی کا اظہار کر دیا"

گینی مارکس کی شخصیت سے مرعوب ہو چکی تھی۔ دوسرے
وہ اس کے خیالات کی خواہاں تھی۔ اس لئے وہ کارل مارکس
کی شریک کار بننے پر آمادہ ہو گئی ــــ

منگل کے روز ٹریلیس کے گرجا میں کارل مارکس اور
گینی ایک دوسرے کے ہو گئے ــــ !

"افسانہ نمبر"

ہم اپنے افسانہ نمبر کے لیے ہندستان کی چوٹی کے لکھنے والوں کے افسانوں اور نظموں کی امید کرتے ہیں چند لکھنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں
تنقیدی مضامین: حضرت فراق گورکھپوری جناب اقبال انصاری ایم اے وغیرہ افسانے: جناب علی عباس صاحب حسینی۔ جناب محمد علی صاحب
جناب طاہر انصاری صاحب۔ جناب حیات اللہ صاحب انصاری۔ جناب احتشام حسین صاحب رضوی۔ جناب تارا شنکر
صاحب [illegible] و جناب علی سردار صاحب جعفری جناب مسیح الحسن رضوی محترمہ شفیق بانو وغیرہ وغیرہ ڈرامے: جناب خان بہادر نواب جعفر علی خاں صاحب
اثر لکھنوی جناب [illegible] صاحب [illegible] نظمیں: حضرت جوش ملیح آبادی حضرت جگر مرادآبادی حضرت ساغر نظامی جناب خان بہادر نواب جعفر علی خاں صاحب اثر
لکھنوی عالیجناب مولانا [illegible] صاحب [illegible] حضرت اسرار الحق صاحب مجاز۔ حضرت [illegible] شاہجہانپوری جناب علی سردار صاحب جعفری وغیرہ وغیرہ

غزل

منظور حسن شور
ایم۔ اے، ایم۔ اے
ایل۔ ایل بی۔ ایم۔ اے

ہوئی نہ وجہ سکونِ چشمِ تر کی چارہ گری
رہی چھلک کے بھی مینائے دل بھری کی بھری

بتا تو اے دلِ وحشی یہ ماجرا کیا ہے
یہ اضطرابِ مسلسل! یہ سوختہ جگری

یہ میری آنکھ میں آخر کہاں کی آئی تری
چھلک چھلک کے بھی ہے چشمِ تر بھری کی بھری

یہ کس کے گریۂ شب کا اثر ہے وقتِ سحر
کہ ہے ستارہ بھی اشکِ چکیدۂ سحری

حریفِ برقِ تجلی نگاہِ شوق کہاں
حریمِ حسن میں کس کو مجالِ دیدہ دری

ہزار سجدۂ دیر و حرم سے بہتر ہے
اک آہِ نیم شبی، ایک گریۂ سحری

سکونِ دل بھی ہے اِک اضطراب کی صورت
جنونِ شوق نہیں آشنائے چارہ گری

جو تم ملے تو کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
فغانِ نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری

اک آہ کھینچ کے اے شورؔ اٹھ گئے وہ بھی
میں ختم کر نہ سکا شرحِ سوختہ جگری

سوزِ ناتمام

ماہرؔ القادری

وہی عقل کی پرستش، وہی حوصلے کی خامی
نہ وہ جراتِ کلیمی، نہ وہ ذوقِ ہمکلامی

مرے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو
کہ نہیں قبول مجھ کو مہ و مہر کی غلامی

مرے حالِ مضطرب پر ابھی ہنس رہی ہے دنیا
ابھی ڈھیل دے رہا ہے مرا سوزِ ناتمامی

میں زباں سے کیوں کہوں کچھ مری خامشی ہے سب کچھ
مری ہر نظر گذارش، مرا ہر نفس پیامی

مرے سوزِ دل کی قیمت فقط اک نگاہِ الفت
ترے دردِ دل کا سودا ابھی عشرتِ غلامی

نئے کارواں کی فطرت ہے تمام تر سیاست
نہ حُدی کی اب ضرورت نہ وہ ذوقِ خوشخرامی

مجھے زندگی کی خاطر نہیں ذلتیں گوارا
مجھے راحتیں مصیبت، مجھے موت ہے غلامی

مجھے کیا پیام دیگی تری زندگی کی دنیا
کہ فنا کی وادیوں میں مجھے دی گئی سلامی

مجھے ڈر ہے کاش کو نہ خراب جہل کر دے
یہ غرورِ عقل و دانش یہ جنونِ پختہ کامی

مرے دل نے آج آخر کوئی چیز ان سے مانگی
یہ نگاہِ مستِ خسروؔ یہ سرورِ قلب جامی

عورت

حکیم چودھری سراج احمد دریابادی

عورت کائنات کا ایک دلکش فریب ہے جس کی حیات رنگین کے ایک ایک ذرہ میں صدہا جاذب نظر اور مرکز توجہ رعنائیاں ہیں جو دنیا والوں کو دعوت نظارہ و ترغیب پیش دیتے رہتے ہیں حسن و شباب کے یہی وہ حجاب آسا لمحات ہیں جن پر مرد کی خودداری و استغناء کی ہمیشہ بھینٹ چڑھ چکی جاننے والے جانتے ہیں کہ رازِ نسواں کا محرم ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لیے کہ اس کے عناصر زندگی میں فطرت کے وہ رموز پنہاں ہیں جن سے اگر انسان باخبر ہو جائے ۔ تو کائنات کی ہزاروں حقیقتوں کا خود بخود انکشاف ہو جائیگا اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کا حل تمام تر مصالح قدرت کے خلاف ہے ورنہ پھر نہ یہ دنیا رہیگی نہ دنیا والے ۔ سچ تو یہ ہے کہ حقائق نسواں کی ہمہ گیر اور فاتح فطرت کا تحمل کوئی نہ ابھی نہ کر سکے نسوانیت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے جس نے آدم کو ارتکاب گناہ پر آمادہ کر دیا یہ شیطان کا نفسیاتی تجربہ تھا کہ عورت کو جس چیز سے مکرر روکا جائے اس کے دل میں اسی کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے شیطان نے اسی فطرت سے فائدہ اٹھا کر رغبت دلائی ہوگی اور شجر ممنوعہ کی طرف پہلا ہاتھ حوا نے بڑھایا ہوگا آدم نے محبت سے مجبور ہو کر الزام اپنے سر لے لیا اس طرح یہ انکا وہ اعتراف شکست تھا جس کی سنت لطیف پر آج بھی حوا کی بیٹیاں فاتحانہ اور آدم کے بیٹے مفتوح و مجبور بکمال خوش و مطمئن عمل کرتے چلے آتے ہیں حالانکہ اس شکست کی مصالح خداوندی خود متقاضی تھی اس کو ایک ایسی دنیا بنانی تھی جو نغموں سے بھرپور مسرتوں سے ہمکنار رنگینیوں سے معمور اور حسن و محبت سے مخمور ہو

عورت اس نتیجہ سے البتہ ایک مستقل غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی اور زلیخا نے مقابلہ شروع کر دیا ایک ایسے پیغمبر سے جس کے تحفظ کی قدرت خود ضامن تھی بالآخر نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا زلیخا کی زندگی میں عورت کے لیے مکمل درس موجود ہے دراصل اس کو مقابلہ کرنا چاہیے ایسے مرد کا جو پیغمبر نہ ہو مگر اسکو یاد کیا جائے کہ عورت کی حوصلہ مندیاں شخصیت کی قائل نہیں وہ اپنی پرستش ہر انسان کا فرض سمجھتی ہے اور اس سے گریز کرنے والے کو دائمی شکست دینا چاہتی ہے یہی وقت ہوتا ہے جب اس کی تمام پوشیدہ قوتیں مشتعل ہو جاتی ہیں اور دامن تقدس کو محفوظ رکھنے والا کبھی نہ کبھی گریز کی سزا ضرور پا جاتا ہے دنیا والے نسوانیت کو عریاں اسی حالت میں دیکھ سکتے ہیں درحقیقت مرد کی نیازمندی حقیقی عورت کو حجابات رنگین میں پوشیدہ کر دیتی ہے جس کے مختلف تلخ تعلق بیوفائی سے کج ادائی رکھکر انسان خود اپنی تشفی کر لیتا ہے ایسے حالات میں عورت کی فتوحات کا باعث اس کی وہ دلفریب کمزوریاں ہوتی ہیں جو انسان کو مفتوح ہو جانے کی ترغیب دلاتی ہیں لیکن اگر اس کا محبوب شکستوں سے اپنا دامن بچاتا

چاہتا ہے تو پھر وہ خود ایک دلکش مفتوح بن جاتی ہے اور محبوب کی حیات مشترکہ میں گم ہو جاتی ہے یہی وقت ہے کہ مرد اس کی چھینیوں کا پورا لطف اٹھا سکتا ہے اور اُسے عارضی شکست بھی دے سکتا ہے دائمی شکست تو خود ہی کو نصیب ہو کر رہتی ہے جس پر ہزاروں فتحمندیاں نثار۔

عورت محبت کی تکمیل اور محبوب کو مسخر کر لینے میں اس لیے اور بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہے کہ یہی اس کا پہلا اور آخری حاصل زندگی ہے وہ ایک مرتبہ سے زیادہ نہ محبت کر سکتی ہے اور نہ اس کے پاس کچھ رہ جاتا ہے جو دوسری محبت کے لیے اٹھا رکھے بعد میں آنیوالی تمام محبتیں تصنع اور فریب کاری میں مبتلا کرنیوالی ہوتی ہیں عورت کی زندگی کا یہ نہایت دلچسپ کرشمہ ہے کہ انتہائی عالم مدہوشی میں بھی اس کے تمام حرکات و سکنات مکر و فریب کے دامن سے ہوا پاتے رہتے ہیں وہ مرد کی طرح صرف ایک جھلک سے ہوش و حواس نہیں کھو بیٹھتی بلکہ انتہائی بیخودی میں بھی ہوشمند رہتی ہے وہ محبت کی پہلی پُرکیف چنگاری کو اس احتیاط سے پرورش کرتی رہتی ہے کہ دنیا والے بالکل بے خبر ہیں اسی لئے مرور ایام کے بعد بھی جب اس سے محبوب کا سامنا ہو جاتا ہے تو اسکا گذشتہ نقش محبت تازہ ہو کر سدا بہار ثابت ہوتا ہے اور یہی اسکا سرمایۂ حیات ہے

حقیقی عورت وہی ہے جو اپنے ظاہر و باطن دونوں کو متنۃ بنائے رکھے کسی چیز سے متاثر رہنے کے لیے عدم واقفیت ضروری ہے محبت کرنے والے کو اسی اصول کے ماتحت وہ مستقل دھوکے میں مبتلا رکھتی ہے جس سلوک کی خواہشمند ہوتی ہے خود وہی کرنے لگتی ہے خوش کرنے کے لئے خفا ہو جاتی ہے اور فرو گذاشتوں کا انتقام لینے کے لئے خوشامد کرنے لگتی ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیشانی کے ادنی آثار چڑھاؤ سے کام نکل جاتا ہے ورنہ مہاتما گاندھی کی ستیہ گرہ سے زیادہ مؤثر اس کا قیمتی آنسو ثابت ہوتا ہے جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

دنیا والوں نے عورت کو سمجھنے کے لیے نئی طرح سے کوششیں کیں مگر اس کی زندگی کے لیے مہلک صرف دو گروہ ثابت ہوئے ایک وہ جو اس کو زہد و اتقا کی دیوی بنا دینا چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو حجلۂ رنگیں سے نکال کر مردانہ خط و خال میں شمع محفل بنانے پر مصر ہے۔

پہلا گروہ ایک حد تک ناقابل اعتنا ہے اس لئے کہ اس کی خشک اور غیر دلچسپ فطرت لطافت نسواں سے مانوس ہو ہی نہیں سکتی اور یہ انسان کی عادت ہے کہ جو چیز اسکی عقل و سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے وہ اس کا دشمن ہو جاتا ہے بعینہٖ یہی اسباب یہاں بھی پیش آئے اس لئے جھنجھلا کر عورت کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ایک لایعنی ہستی بنا کر رکھ دیا وہ دنیا کے سامنے بے بس لڑکی فرمانبردار بیوی اور بے اختیار ماں بنا کر لائی گئی اس کی زندگی سے نسوانیت فنا ہو گئی اب وہ اس دنیا میں رہنے کے قابل ہو گئی جہاں جاذبیت و دلکشی سے محروم حوریں رہتی ہیں۔

ورنہ اس دنیا میں رہنے والی عورت کی عصمت و عفت کا صحیح مفہوم حسن و شباب کے رنگین مشاغل اور زندگی کے آخری لمحات تک انکا تحفظ ہے جن کا برقرار رکھنا ازلی فریضہ ہے ورنہ وہ خود اپنے مقصد وجود کی تکذیب کر دیگی کیونکہ قدرت

نے پیامِ حسن بنا کر اس کو دنیا میں بھیجا ہے۔ خوش مذاق بنا کر
کہ اپنا پیام پہونچانا اس کا فرض اولین ہے کامیاب ترین
عورت وہی ہے۔ جو خود محبت کرے اور دوسرے کو کرنے
دے مگر انتخاب صحیح اور مذاق سلیم کا اہتمام ضروری ہے
ایسا نہ ہو کہ پیامِ حسن ان بدصورت اور بدخواہ انسانوں تک
بھی پہونچ جائے جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں ایک
حسین سلیقہ شعار اور خوش مذاق عورت میں خودداری تمکنت
حوصلہ مندی اور وسعت نظر ہونا ضروری ہے اگر کوئی بدنصیب
ان صفات سے محروم ہے تو وہ عورت کہلانے کی ہرگز
مستحق نہیں بلکہ وہ ایک بدصورت عورت کے شباب سے
زیادہ قابل نفرت ہے جو دنیا کی مہلک ترین مصیبت اور
ایک انسان کے لیے سب سے بڑی سزا ہے۔ میں پیر
طریقت اور جوان صالح کے زہد و اتقا اور خلوص کا قائل
نہیں بہشت کو اگر حوروں سے مزین نہ کر دیا ہوتا تو وہ
ترک لذات اور لطف و دلچسپیوں کو اپنے ہاتھوں ملیامیٹ
کر دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا مگر نتائج کا اشارہ کچھ اور
ہے دنیا میں رنگینیت نسوانیت سے کنارہ کشی فطرت کو
غیر مانوس رکھکر دائمی محرومی کا باعث ہو کر رہیگی اور نسوانیت
مظلوم پر جبر و استبداد کا ادنی انتقام ہے اب دوسرا دور گو
ہے جس کو اپنی نتیجہ خیز وسعت نظری اور قدر شناسی پر ناز
ہے وہ چاہتا ہے کہ عورت اپنی ساری صنفی خصوصیات ترک
کر کے مرد بنجائے اس مقصد کی تبلیغ اس انہماک سے جاری
ہے کہ خود عورت اپنی حقیقی منزل بھول کر ناز مردانہ حالت
میں مطمئن ہوتی جاتی ہے دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والی
عقل شاہد ہے کہ آجکل کی ترقی یافتہ عورت نسوانیت
کا مکمل ترین مرقع نہیں کہی جا سکتی۔ کاش عورت صرف
عورت ہی رہتی تو اس کے سامنے کی ساری کائنات
مسخر و مطیع سر جھکائے کھڑی رہتی عورت اس لئے دنیا میں
نہیں آئی تھی کہ وہ مردوں کے لیے ایک خوبصورت کھلونا
بنجائے اور جب کھیلتے کھیلتے ان کا جی بھر جائے تو وہ چکنا چور
کر دیں۔ بلکہ وہ ایک مستقل ہستی بنکر اور ایک مستقل پیام لے کر
زمین پر اس وقت آئی تھی جبکہ دنیا میں چاروں طرف تاریکی
ہی تاریکی تھی جس کے پرتو سے عالم انسانیت منور ہو گیا تھا
مگر آج وہ خود غرض انسان کی ابلہ فریبیوں میں مبتلا ہو کر اپنے
پیام کو بھلا اور پیمبری سے دست بردار ہو گئی حقیقی نسوانیت
سے عورت کی بغاوت نے اس سے وہ تمام آلات حرب
چھین لئے جو اس کی فتوحات کا باعث تھے مرد ازلی مفتوح
ہو کر انتقام کی آگ سے جل رہا تھا اس زریں موقع کو ہاتھ
سے کیوں جانے دیتا! اس نے اپنے خوبصورت حریف کو
خالی ہاتھ دیکھکر بھرپور وار کر دیا۔ عورت کو حرم سرا سے
گھسیٹ کر کالج سینما کلب اور پارکوں کی زینت
بنا دیا گیا ہے۔ اب وہ ایک ایسی ہستی ہو کر رہ گئی ہے
جس کی زندگی دنیا والوں کے لئے سبق آموز اور
عبرت انگیز ہے

طلبگاریاں!

یکتا حقانی

محبت بنوعِ دگر چاہتا ہوں — میں اپنا انھیں منتظر چاہتا ہوں
اُدھر بھی تبسم اِدھر بھی تبسم — یہ ماحول میں عمر بھر چاہتا ہوں
مقابل میں اپنے دلِ بے خبر کے — فقط اک دلِ باخبر چاہتا ہوں
ہٹا دیجئے رُخ سے گیسوئے مشکیں — شبِ زندگی کی سحر چاہتا ہوں
نہیں ہے کوئی قیدِ حسن و محبت — ہر اک رہگزر سے گزر چاہتا ہوں
تمھیں دیکھنا منظرِ عام پر میں! — نہیں چاہتا ہوں۔ مگر چاہتا ہوں

میں دنیائے رنج و الم میں بھی یکتا
خودی چاہتا ہوں۔ اگر چاہتا ہوں

لطیف نظر

لطیف قریشی

حجاب آنکھ سے اور دل سے اضطراب اُٹھا — اُٹھا اُٹھا مرے ساقی ذرا نقاب اُٹھا
یہ بزمِ وعظ نہیں بزمِ مے ہے اے واعظ — کتاب ہاتھ سے رکھ ساغرِ شراب اُٹھا
سنا دے قسمتِ واژوں کے راز اے مطرب — میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو شراب اُٹھا
نگاہِ یاس سے لے کام بزمِ حیرت میں — نہ دے جواب مگر تہمتِ جواب اُٹھا
فلک سے برق گری زلزلے ہزار آئے — مگر نہ در سے ترے خانماں خراب اُٹھا

لطیف دیکھ کے حالِ خراب کو میرے
ہر ایک سمت سے اک شورِ انقلاب اُٹھا

تاریخ ہندوستان کا ایک گمشدہ ورق

چودھری عبدالرؤف اختاس لکھنوی

گوہے کہ بہ بازوے بیکس قطرہ پاریدہ
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

زمانہ نام ہے انقلاب کا۔ دنیا کی ہر چیز کائنات کا ذرہ ذرہ تغیر پذیر اور تغیر پسند ہے۔ یہ ہے وہ اصل جس پر دنیا نہایت بے دردی کے ساتھ عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ہندوستان کا وہ منحوس باب ہے جب سارے ملک میں نا قدری پھیل ہوئی تھی۔ مرکزی حکومت نااہلی، میر جعفر کی غداریوں اور عیاریوں کا شکار ہونا پڑا۔۔۔ میر جعفر کی ہوس سلطنت نے انگریزوں کے قدم بنگال میں جمائے جس کا انجام بھی برا ہوتا ہے اس کو بھی انگریزوں کی چالاکیوں کا شکار ہونا پڑا۔ اب میر قاسم کے سر مسند بنگال کی گئی۔ اس کو بھی انگریزوں کی چالاکیوں کا کافی تجربہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے اپنا دارالسلطنت مرشد آباد سے مونگیر تبدیل کر دیا۔ مونگیر میں اس نے ضروریات کے مطابق ایک قلعہ تعمیر کرایا لیکن غریب کو چین نہ نصیب ہو سکا تاجروں پر ٹیکس لگانے کی وجہ سے انگریزوں سے اختلاف رائے شروع ہو گئی۔ آخر دونوں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو گئے۔ کئی لڑائیوں میں شکست دیکر جنرل وینسٹارٹ نے مونگیر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ میر قاسم کا ستارہ گردش میں تھا اور اس کا اقبال ختم ہونے والا تھا۔ آخر کار شکست ہوئی۔

قلعہ کے اندر ہی اندر وہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ آیا زمین نگل گئی یا آسمان۔ یہ ابتک معمہ ہے جو نہ حل ہو سکتا ہے نہ ہو گا۔

میر قاسم کے دو بچے تھے ایک لڑکا جس کا نام خسرو پرویز تھا اور ایک لڑکی جس کا نام شیریں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر زندہ رہتے تھے۔ ان دونوں کو میر قاسم نے اپنے وفادار ملازم "سمرو" کی نگہبانی میں دیدیا تھا۔ نازو نعمت کے پلے دونوں نہایت حسین تھے۔ ان کے قتل تباہی کی ایک المناک داستان ہے لیکن اختلاف بیان ہے چنانچہ ایک مورخ اس واقعہ کو یوں تحریر کرتا ہے۔

میر قاسم کی فراری کے بعد اس کا نوکر سمرو اسکی تلاش میں نکلا۔ پہلے وہ خفیہ سرنگ میں داخل ہوا۔ اس سرے سے اس سرے تک تلاش کیا۔ لیکن بیسود و مایوس ہو کر وہ واپس لوٹا کہ شاید وہ ابھی قلعہ میں ہی ہوں۔ سرنگ قلعہ کے اندر شاہی قبرستان میں کھلتی تھی۔ وہ باہر نکلا اور بچوں کو ایک محفوظ مقام پر چھپا کر سرنگ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر تلاش میں مصروف ہو گیا بدقسمتی سے پہرے داروں کی نظر اس پر پڑی اور وہ گرفتار ہو گیا۔

لیکن وفاداری نے اس کی زبان بندی کر دی اس نے نہ تو نواب کے بچوں کا پتہ بتایا اور نہ سرنگ کا راستہ۔ بچے اپنے

تنہا ملکسار سمرو کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ بچوں کو کیا معلوم کہ وہ دشمنوں کے چنگل میں پھنس گیا ہے منتظر نگاہیں ہر آہٹ کو نجات دہندہ سمجھنے پر مجبور کر رہی تھیں آخرکار انتظار کی شدت سے گھبرا کر خسرو نے شیر کا لباس تبدیل کیا (جس کو سمرو اسی غرض سے پہلے ہی رکھ گیا تھا) اور ہاتھ میں ستار لیکر نوکر کی تلاش میں قبرستان کی طرف بڑھا۔ میر قاسم کے ڈوب مرنے کی خبر نے انگریزوں کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس وقت وہ خواب نوشیں کے مزے لے رہے تھے خسرو قبرستان میں آزادی کے ساتھ گھوم رہا تھا لیکن بدنصیب باپ اور نوکر جس کی تلاش میں وہ سرگرداں و پریشان تھا یہاں موجود نہ تھے۔ غم فراق نے اسے پاگل بنا دیا اور وہ اس حالت میں دردبھری آوازیں گانے لگا۔

مضطرب کر دینے والے نغموں نے فضائے سکوت میں ہیجان سا پیدا کر دیا۔ فوج کے سپاہی خواب سے بیدار ہونے لگے بندوقیں سنبھالے ہوئے وہ آواز کی طرف بڑھے۔

رات کا سماں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چاند طلوع ہو رہا تھا گیت ختم ہو گیا۔ سراسیمگی کے عالم میں وہ اپنی جائے پناہ کی جانب بڑھا۔ کلایو نے اس کے لباس سے شیر کا اندازہ کیا بندوق سیدھی کی اور فائر کر دیا۔ آواز کے ساتھ ہی ایک دلدوز آہ فضا میں گونج گئی اور ایک انسانی ڈھانچہ دھم سے زمین پر گر پڑا۔ سپاہی شکار کی طرف تیزی سے بڑھے۔

"آہ! یہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کلایو گلوگیر لہجے میں بولا۔ "یہ تو کوئی سادی مخلوق ہے آہ اس کا لباس اس کی موت کا باعث ہوا۔ مجھ سے ناقابل معافی گناہ سرزد ہوا ہے میرے خدا مجھے معاف کر ۔ ۔ ۔ ۔ اتنا حسین اور معصوم چہرہ" اس نے اپنی ٹپی سے مردہ چہرے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "کتنی حسرتناک موت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

گولی ٹھیک بائیں پہلو کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ نرم اور نازک ہاتھوں میں ابھی تک ستار تھا۔ بچپن ہی سے خسرو پرویز اور شیریں کو علم موسیقی کا شوق تھا۔ علاقہ بنگال میں جو اہمیت اس فن کو حاصل ہے ظاہر ہے چنانچہ نواب نے اساتذہ کے ذریعہ ان کو موسیقی کی پوری تعلیم دلوائی تھی اور وہی موسیقی آج شہزادہ کی موت کا باعث ہوئی۔

اہل شہر نے باوجود پہچاننے کی لاعلمی کا اظہار کیا جس کی وجہ سے کلائو اس شہزادہ کو غیر ارضی مخلوق سمجھنے پر مجبور ہو گیا

(۳)

ساری رات اور دن شیریں نے تنہائی میں گزار دی گو کہ اب ملاقات کی تمنا رکھنا محض فضول اور بیکار تھا کیونکہ شریں کا عزیز بھائی گوشۂ لحد میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ دوسرے دن، دن بھر کی جدائی کے بعد وہ سمجھ گئی کہ اس کا عزیز بھائی اور نوکر کسی نہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ چنانچہ رات ہوتے ہی وہ مصیبت آزمالوں کی تاب نہ لا کر خود ان کی تلاش میں چل دی۔ تاریک راستے میں وہ دلیری کے ساتھ چل رہی تھی نصف شب گزر چکی تھی اور ہر طرف ہُو کا عالم تھا چلتے چلتے وہ چور ہو گئی اور اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ کمزوری کی وجہ سے سر چکرا رہا تھا اور اس کو راستہ تک نہیں دکھلائی

دے رہا تھا جھاڑیوں اور کانٹوں نے اس کے بدن کو
چھلنی بنا دیا تھا مگر وہ برابر چلتی جا رہی تھی۔ آخر وہ قبرستان
کے ایک کھلے میدان تک پہونچی۔ یہاں بیتاب ہو کر اُسے
درد بھری آوازوں سے اپنے بھائی باپ اور نوکر کو
پکارنا شروع کیا لیکن جواب میں بازگشت کے علاوہ
اور کچھ سنائی نہ دیا۔

جو بکتے ہی فوج کے سپاہی بندوق اور مشعلیں لیے ہوئی
گئے ہوئے آواز کے تعاقب میں چلے۔ تھکاوٹ اور بھوک
کی شدت سے بیتاب ہو کر یہ سات آٹھ سال معصوم
بچی ایک درخت کے سہارے کھڑی ہو گئی کچھ فاصلہ
سے کسی کے چلنے کی آواز آئی قبرستان کے درختوں
کے سوکھے پتے کھڑکے اور خاموش فضا میں ارتعاش سا
پیدا ہو گیا۔ تھوڑا سا ... سینے میں لرزہ ... چمکتی ہوئی آنکھیں
تاریک رات میں اس کی اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر
آئیں شیر یا بھیڑیے کے خوفناک تصور نے اُسے
لرزہ براندام کر دیا۔ جان بچانے کے خیال سے وہ ایک
طرف بھاگی لیکن قبل اس کے کہ وہ درختوں کی آڑ میں چھپ
سکے ایک دھماکا ہوا بندوق سینے میں پیوست ہو گئی۔ اور
تمام سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ افراتفری کے عالم
میں سب مردہ لاش کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے
اس جگہ پہونچنے والا کلائو تھا۔

"میرے خدا ---- یہ کیا"، کلائو نے اپنی
پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ کیا سچ مچ وہ آسمانی
مخلوق تھی جسے کل ہی میرے بیرحم ہاتھوں نے
ملک عدم پہونچایا۔ آہ! .... آج وہ پھر
یہاں موجود ہے یہ کس کی بے چین روح ہے جو رات کے
سناٹے میں درد بھرے نغمے گاتی ہوئی قبرستان کا
طواف کرتی ہے .... اس کو کس کی
تلاش ہے۔

"اُف حسن اور معصومیت کی زندہ تصویر بالکل وہی۔
ہو بہو وہی جس کو کل ہم نے دفن کیا ہے" اس کے بعد کلائو سر
پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سرخ خون فوارہ کی طرح بہہ کر زمین پر جم رہا تھا
جسم پر شیر کی کھال پڑی ہوئی تھی۔

حقیقت میں دونوں بھائی بہن شکل و صورت میں
یکساں تھے اکثر محل میں نوکروں کو دھوکہ ہو جاتا تھا کہ شہزادہ
کون ہے اور شہزادی کون ہے؟

دوسری صبح نہایت احترام اور عزت کے ساتھ میر قاسم
کی آخری نشانی تمنا اور سرمایہ حیات کو اس کے بھائی کے پہلو
میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔

اس مضمون کا کتبہ لارڈ کلائو نے دونوں مقبروں پر
نصب کر دیا: "کلائو نے اپنی عمر میں دو بیگناہوں کا خون
کیا ہے جن معصومیت کی پرستش کے خیال سے وہ کانپ
اُٹھتا ہے۔ حقیقت میں وہ دونوں فرشتے تھے۔ اور
مخلوق سماوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے بیرحم ہاتھوں
نے انھیں ابدی نیند سلایا خدا اُن پر اور مجھ پر
رحم کرے"

اور اس طرح میر قاسم کی آخری یادگاروں کو ہمیشہ
کے لیے ختم کر کے ظالموں نے صفحۂ داستان کا ایک
گلدستہ بنا کر رکھ دیا۔

تجدید شوق

شوق کھنڈوی

حسن معصوم کی کیا شانِ خود آرائی ہے … عالمِ قدس کا ہر ذرہ تماشائی ہے
کس تکلف سے وہ مصروفِ خود آرائی ہے … آئینہ سکتہ میں ہے عکس تماشائی ہے
ہائے کمبخت طبیعت بھی کہاں آئی ہے … جو جفا جو ہے ستم کیش ہے ہرجائی ہے
میں جدھر جاتا ہوں سب کہتے ہیں سودائی ہے … میری تقدیر میں رسوائی سی رسوائی ہے
یوں تو سوسن نے بھی کہنے کو زباں پائی ہے … پر میسر اسے کب طاقتِ گویائی ہے
آج کچھ ان کی جفاؤں میں کمی پاتا ہوں … دلِ بیتاب کو احساسِ شکیبائی ہے
روئے روشن پہ زلفوں کا تسلسل توبہ! … سچ تو یہ ہے سحر و شام کی یکجائی ہے
جانتا ہوں نہ نبھے گی مری اُن سے لیکن … دل کو کیا کہئے کہ مجبورِ شناسائی ہے
وہ عیادت کو جو آئے تو یہ منھ سے نکلا … زندگی بن کے مرے گھر میں قضا آئی ہے
جستجو دہر میں رہ کر نہ سکوں کی تو کر … بیقراری تو یہاں رازِ مسیحائی ہے

شوق اک ہمدمِ دیرینہ کے پہلو میں رہیں
ایسی تقدیر بھلا ہم نے کہاں پائی ہے

اضطراب

یحییٰ حنفی۔ اعظم گڈھ

ستم ہے دردِ محبت نے بیقرار کیا … سکون و صبر کے دامن کو تار تار کیا
جسے وہ بھول چکے تھے وہ عہد تازہ کیا … دلِ فسردہ کو پھر مست اعتبار کیا

خریکِ غم میں ہے رودادِ خونچکانیٔ دل … زبانِ درد ہے مصروفِ ترجمانیٔ دل
ہزار صورتِ تسکیں تلاش کی لیکن … نہ کام آئی مرے سعی و جانفشانیٔ دل

شبِ خموش میں دیکھا بہت ستاروں کو … چھپا لیا آنکھ میں فطرت کے ماہ پاروں کو
کبھی جنونِ محبت کا یہ تقاضا تھا … لگاؤں آگ جمال آفریں ستاروں کو

کسی کے دل میں اثر ہو تو بات بن جائے … کسی کا لطف نظر ہو تو بات بن جائے
میں اضطراب سراپا ہوں جس کی نظروں میں … اسی کو میری خبر ہو تو بات بن جائے

توبہ

شفیق بانو

کسی کو غم ہوتا ہے تو غم کی باتیں یاد کر کے روتا ہے
چونکہ غم کو لوٹا ہے اپنی زندگی کو تاریک کر دیتا ہے تباہ ہو جاتا
ہے اس کی صورت دیکھ کر لوگوں پر غم کا اثر پڑتا ہے لیکن اس غم
کے فلسفہ میں بھی ہندوستان کے مردوں کی منطق نرالی ہے۔ وہ
تفریح کر کے غم کو بھلانا چاہتا ہے وہ ہنستی ہوئی ... مسکراتی جوانی
حسین چہروں میں اپنا جی بہلاتا ہے۔ شراب پیکر سرور حاصل کرتا ہے
گانا سن کر روح کو بیدار کرتا ہے اور عیش و نشاط کی محفلیں گرم
کر کے عہد گزشتہ کے نقش مٹاتا ہے اس کی بلا سے اب ختم
ہو جائے بیوی دم دیدے ۔ بچے ہنستے کھیلتے موت کی آغوش
میں جا سوئیں۔ آندھی آئے طوفان آئے۔ بجلی گر پڑے۔
دنیا میں مصیبت آفت میں دکھیا مبتلا چیخ پکار کر رہے ہوں
لیکن انھیں اپنے سکون سے مطلب خوشی چاہیے خواہ انھیں
ہزاروں کی جان کیوں نہ لینی پڑے۔ اسی قسم کے لوگوں میں عبدالرؤف جس نے اپنی زندگی کا بیش
قیمت حصہ ذکیہ جیسی حسین بیوی کی صحبت میں گذارا ایک دو سال
نہیں پورے دس سال۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر خدا نہ کرے اس
دنیا میں ذکیہ کا دم نہ ہو تو عبدالرؤف بھی جان سے گذر جائیگا
یا کم از کم اپنی دنیا کو تاراج کر ہی دیگا۔
لیکن ہوا کیا، ادھر ذکیہ بیمار ہوئی ادھر ادھر ان کی دلچسپی ختم
گویا ساری محبت کی کہانیاں فرضی تھیں اور حسن کی ناز برداریاں
محض نفس پرستی تھی انسانیت کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا
مرنے کے بعد اس روحانی خلش کو مٹانے کیلئے جو دل میں ہوئی
زندگی بھی عبدالرؤف نے اپنے دوست فرخ مرزا کیساتھ تفریح
میں جانا شروع کر دیا۔ کہاں؟ وہیں جہاں تہذیب اخلاق و
انسانیت ہمدردی چھین کر معاوضہ میں ذلت دی جاتی ہے
جہاں عشرت میں زہر کے گھونٹ پلائے جاتے ہیں۔ جہاں کی
دولت عزت لوٹ کر۔ بدنام کر کے کوڑیوں کو محتاج کر کے دھتکار
دیا جاتا ہے۔ فرخ مرزا خود ازل سے یہ عادتیں باپ دادا سے
وراثت میں لیکر پیدا ہوئے تھے لیکن رؤف کو بھی اپنے ہی
جیسا بنا ڈالا۔ شروع شروع تو رؤف کو اپنے ضمیر کی ملامت سنکر
رونا آتا لیکن رفتہ رفتہ رؤف کا ضمیر مردہ ہو گیا۔

وہ روز کسی نئی پری چہرہ [illegible] ایک دن وہ شہر
کی مشہور طوائف سعیدہ کے پاس گیا۔ یہ اوروں سے کچھ مختلف
تھی وجہ یہ کہ اس کی ماں اگرچہ طوائف تھی لیکن باپ ایک بہت
بڑا لکھ پتی اور شریف خاندان سے تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی
صورت پر شرافت اور معصومیت برستی تھی۔ میاں رؤف کچھ
ایسا الجھا کہ پھر اوروں کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔ تمام طوائفوں میں
کھلبلی مچ گئی اور وہ سعیدہ پر خار کھانے لگیں۔
رؤف تعلقدار کا لخت جگر تھا اس لیے کچھ آئندہ کے زمانہ
کا زیادہ خدشہ نہ تھا وہ اپنی اسی زندگی بہترین سمجھتا تھا۔ دن کا پورا
وقت اور رات کا بیشتر حصہ وہ صرف سعیدہ کی پوجا میں گذارتا

"اور ہر وقت شراب کا جام ہاتھ میں ہوتا ایک دن نشہ میں بولا" تم سعیدہ بلا شبہ میں تمہیں آکاش کا ستارہ بنا سکتا..... تم کسقدر حسین ہو... تمہاری ہاتھ سے شراب پینے میں کتنا لطف آتا ہے بس دنیا ہے اور تم ہو — یا تم ہو اور میری دنیا"

سعیدہ کے پاس خدا جانے ایسی محبت کا راگ الاپنے والے کتنے آئے اور گئے کتنوں نے اُسے حسین کہا اور ختم — کسی نے مخمور آنکھوں کی تعریف کی کسی نے اُس کی سڈول گردن کی کسی نے اُس کے بھولے پن کی کسی نے اُس کی میٹھی میٹھی باتوں کی — کچھ حضرات ایسے بھی آئے جو ناصح بنکر — لیکن سعیدہ اپنی جگہ پر سعیدہ ہی رہی — اس وقت بھی وہ رؤف کے محبت بھرے لفظوں سے متاثر نہ ہوئی صرف اپنی الجھوت آنکھیں اس کی طرف اٹھا دیں — رؤف یہ کہکر آگے بڑھا سعیدہ تمھاری آنکھوں میں شراب ہے شراب۔ میری شراب سے بڑھکر" رؤف کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سعیدہ کی آنکھوں کی کشش محدود نہیں بلکہ ایک ایسا چشمہ ہے جس سے سب اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ عین سرور کی حالت میں اس کی دکان پر اور بھی خریدار حسن آئے۔ سعیدہ نے ایک دکان دار کی حیثیت سے ہر ایک کی تواضع کی لطف یہ روح فرسا نظارہ کی تاب نہ لا سکا۔ اُس نے محفل ختم ہونے پر اپنے دل کا حال سنایا کہ اس طرز عمل سے مجھے کتنا دُکھ ہوتا ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ خوشامد بھی کی، گڑگڑایا بھی — رویا بھی — چلایا بھی غصہ بھی کیا۔ لیکن سعیدہ کے ایک جواب نے تمام قصہ کو ختم کر دیا "رؤف صاحب آپکو شاید غلط فہمی ہوئی۔ کیسی عصمت آپ گھر والی کا گھر نہیں بلکہ ایک طوائف کا بالاخانہ ہے جہاں آپ سے بھی زیادہ دل گردہ والے دولت والے حسن پرست آآکر سجدے کیا کرتے ہیں اگر میں آپ کا حکم سنوں تو دکان کو کیا نیلام کر دوں۔ چھوٹے طبقہ سے لیکر بڑے بڑے جبہ و قبا والے مولانا بھی تشریف لاتے ہیں۔ بہانہ تو یہ ہوتا ہے کہ حقانی غزلیں سننے آئے ہیں لیکن حقیقت اس سے مختلف ہوتی ہے۔

رؤف نے اس خوشنما پروں والی تیتری کو خوشامد کی کہ وہ تمام جائداد و مکان لے لے شرطیں لکھوالے اور اس سے نکاح کرے۔ اُس نے جھڑک دیا۔ ہونہہ! جب یوں آپ کا وار نہ چلا تو یہ دوسرا جال بچھا دیا۔ شمع جبتک کہ روشن ہے اُس پر پروانوں کا ڈھیر لگتا رہتا ہے اور کتنے ہی خاک ہو کر گرتے رہتے ہیں۔ کسی جاہل ناتجربہ کار کو یہ دھوکا دو تو دو میرے یہاں ان بے معنی سوالات کا کوئی محل نہیں"

رؤف کو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اُسے تیسری منزل سے نیچے گرا دیا۔ اُس کا دماغ چکرا گیا "یا اللہ دولت لٹا کر بیچ منجدھار میں نیا رہ گئی اور پھر کیسی بری عادتیں آگئیں — اب یہ جواب؟"

اس نے ایک دم اپنے دل کو سخت بنا لیا۔ اور بغیر سعیدہ پر نظر ڈالے اٹھکر چل دیا۔ گھر میں آیا۔ کمرے میں نڈھال ہو کر گر پڑا بہت دیر روتا رہا۔ اُسے اپنی مرحوم بیوی یاد آئی۔ کیسی معصوم اور محبت پرست تھی پھر اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ کتنا نیک تھا۔ اٹھا کسی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر قبر کی طرف چل دیا۔ کچھ پھول قبر پر بکھیرے اور فاتحہ پڑھکر دونوں ہاتھ قبر پر رکھ کر جھک گیا۔ اُسے اس وقت بڑا سکون محسوس ہوا۔ آنکھ لگ گئی کیا دیکھا کہ مرحومہ کھڑی ہے لیکن کچھ غصہ سا چہرہ پر ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہی ہے "کیا یہی محبت تھی؟ رؤف کیا تم بھول گئے

ٹھیک سیدھا خیال تھا۔ آؤ تم دیکھو تو سہی تم نے اپنی حالت کیا بنالی ہے۔ بال اُلجھے ہوئے ہیں، پریشان سے ہو آپ؟ میرے ہاتھ انھیں کیا۔ اسی لیے سلجھانے ہیں کہ تم ان کی عزت نہ کرو۔ اب بھی توبہ کرو اپنے سب اعمال ٹھیک کرو۔ یہ دنیا سرائے ہے۔۔۔ [illegible]" آنکھ کھلی تو سوائے قبرستان کے سناٹے کے وحشت کے کچھ نہ تھا۔ عہد کیا۔ اب ساری باتیں چھوڑ دوں گا اور اس کے بعد سب کو معلوم ہوگیا کہ رؤف تھک کر پھر نیکی کے مرکز پر واپس آگیا

خزاں کا موسم آیا اور گیا۔ موسم بہار نے کروٹ لی۔۔۔
رؤف کا دل گھبرا گیا۔ اس نے نوٹوں کی گڈی لی اور جلد سامان سفر ٹھیک کیا۔ اور سیاحت کرتے ہوئے بمبئی جا پہونچا۔ یہ دیکھ کر ہی عمل کا راستہ بھی کچھ ہوش نہ رہا!
شہر کی مشہور رقاصہ نیلا۔ فلم کی آفتاب بہری چہرہ مس وسیم سے متعارف ہوا تو وہ تین منٹ اخلاقیات کرتیں ورنہ کہہ دیتی "رؤف صاحب معاف کیجئے گا مجھے اس وقت جا رہا ہے یا ڈز میں جانا ہے"

یہ اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے۔ یہ تو کہنے کی ہمت ہو نہیں سکتی تھی کہ میں اس آسرے میں بہت دور سے آکر بیٹھا تھا کہ آپ سے گفتگو کر سکوں۔ چھ ماہ اس طرح مس وسیم کی کوٹھی کے چکر لگائے اور اس دوران میں مختلف بیش قیمت تحفے بھی پیش کئے بہترین قیمتی انگوٹھیاں، گھڑی، ٹیبل لیمپ، چاندی کا ٹی سٹ وغیرہ وغیرہ جن کو مس وسیم لیتے ہوئے تھینک یو کہتی اور مسکراتے ہوئے یہ فقرہ بھی کہہ دیتی رؤف صاحب آخر آپ کو اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔
یہ بیوقوف پھولے نہ سماتے اور خوب خوش ہوتے کہ بارگاہ حسن میں نذرانہ عقیدت منظور ہوگیا۔ آخر ایک دن اپنے دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر مس وسیم کو خط لکھا اور اپنے تمام دلی جذبات بیان کر دیے۔ اس نے خط پڑھا، ہنسی اور کہا "اس دنیا میں بھی کیسے کیسے بیوقوف رہتے ہیں۔۔۔ خوب۔۔۔ میں انھیں پسند بہت اچھی لگتی ہوں۔ دعوت دی ہے کیا؟ قید کرنے کی ظاہر کرنے کو جی چاہا ہوگا سو یہ ایک ترکیب سوجھی! بیوی بننے کی آرزو کی جا رہی ہے یہ نہیں جانتے کہ مجھ میں بیوی بننے کی صلاحیت کہاں ہے؟ محفل کی شمع بن چکی۔ اپنے فن میں کمال رکھتی ہوں جس وقت پردہ پر لوگ ہزاروں کی تعداد میں سنیما شروع ہونے کا انتظار کرتے ہیں اس وقت میرا ہر سانس۔ ہر لفظ ہر انداز انھیں مجروح کر دیتا ہے اور ہزاروں خط تعریفی آتے ہیں۔ روزانہ کی ڈاک میں دو سو سے زائد خطوط ہوتے ہیں۔۔۔ کلرک بھی لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوگا۔ میں تو شاید کسی خط کو کھول کر پڑھنا کیا سمجھتی بھی نہیں۔ یہ نئے کھلاڑی زندگی کا کھیل کھیلنے چلے اور پھر مجھ سے!"
قدِ آدم آئینہ کے سامنے ٹہرا۔ یہ بھی ایک حسن ایکٹنگ تھا
رؤف کو قطعی یقین تھا کہ مس وسیم ان کے خط کو نعمت غیر مترقبہ سمجھیں گی دوسرے روز گئے تو اس نے سیدھے منہ بات بھی نہ کی البتہ ذرا دیر گفتگو کی درخواست کی تو اکتاتے ہوئے بیٹھ گئی جب انھوں نے قصہ الف لیلی کی طرح رومانی لفظوں میں اپنی محبت کا فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیا تو وہ یہ کہکر "معاف کیجئے رؤف صاحب مجھے اس وقت "اسٹوڈیو" میں جانا ہے" جلدی اور یہ جا وہ جا غائب موٹر کا ہارن بجاتے ہوئے باتیں کرتی سڑک سے گذر گئی۔
یہ عشق بہت مہنگا نظر آیا العرض رؤف اٹھکر سیدھا ہوٹل پہنچا اسے رنج، غصہ، افسوس سب کھائے جا رہے تھے اور اس کا بس چلتا تھا ورنہ کچھ تو سزا دیتا۔ آج توبہ کے بعد رؤف کی توبہ پھر لوٹ چکی تھی۔ رنج و غم کو سرور کی کیفیت میں بدلنے کے لیے پھر جام چھلکنے لگے

پہنچ چکا تھا لہٰذا وہ بھول گیا کہ اُس نے توبہ کی تھی اُسے یاد نہ رہا کہ وہ زندگی کی طرف جا کر عہد کر چکا تھا آج عہد ماضی کا کوئی خیال نہ تھا صرف موجودہ تکلیف کا احساس تھا کہ کس طرح نفس کی تسکین کرے۔ ہوٹل کی ویٹرس کھانا کھلانے آئی۔ پھر مسکراتے ہوئے پھل پیش کئے۔ رؤف نے ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ ویٹرس کافی حسین تھی اور شکل سے بیس سال یا بائیس عمر ہوگی رؤف نے فوری سکون حاصل کرنے کو اس کی طرف دیکھا اور بطور انعام دس دس کے دو نوٹ اسے پیش کئے وہ خوشی سے اُچھل پڑی کہ ہوٹل میں صبح سے شام تک نہ جانے کتنے آتے رہتے تھے پر ایسا شیر دل ابتک کوئی نہ آیا تھا۔

سال گزر گیا۔ ویٹرس سے بھی دل بھر گیا اصلیت یہ تھی کہ وہ لاکھ چاہتا تھا۔ سوچتا تھا کہ دنیا میں کسی ایک کو اپنا بنالوں لیکن بنا نہ سکتا تھا۔ اُس کا دل اُسے ہر بار دھوکا دیتا تھا وہ اپنے ارادوں کو ہر نئے دور میں کمزور پاتا تھا۔

اب گرمی کا دور دورہ تھا لہٰذا رؤف جیسا لاپرواہ دولتمند کہاں سکون سے بیٹھ سکتا۔ ڈلہوزی پہاڑ پر پہنچ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی روح پرور ہواؤں نے اس کے جسم میں روح میں تازگی کی لہر دوڑا دی اب یہاں پھر وہی تھا اور شب تنہائی۔ کوٹھی کا چپہ چپہ جنت کی سی آرائش کئے خاموش تھا۔ رؤف سے یہ تنہائی برداشت نہ ہو سکی۔ وہ تفریح کو جا رہا تھا راستہ میں ایک پہاڑن لڑکی سے گھاس لئے کھڑی تھی۔ رؤف نے ہزاروں حسن کی خریداریاں کی تھیں لیکن ایسا الھڑ شباب اور ایسا معصوم حسن اُس نے کبھی نہ دیکھا بہت دیر تک مبہوت ہو کر دیکھتا رہا۔ ہمت کر کے آگے بڑھا۔ اور مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"ادھر کی ہم یہاں باہر سے آئے ہیں ہمیں ایک مالی کی ضرورت ہے اگر تمہیں معلوم ہو تو بتلا دو بہت مہربانی ہوگی"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اُس نے نظر جو اٹھائی تو رؤف ایک نواب کی مانند کھڑا تھا۔ فوراً وہ جا اپنے باپ کو بلا لائی اور چند منٹ میں مالی کی تنخواہ وغیرہ طے ہو گئی اور کوٹھی میں رہنے کی جگہ بھی۔ دوسرے دن مالی معہ لڑکی کے ڈیوٹی پر تھا۔ اور رؤف حسین پہاڑی لڑکی کے حسن جانسوز کے دیکھنے میں مشغول۔

رؤف کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا آج ہی اس نے اپنی زندگی شروع کی ہے حالانکہ اس سے بیشتر خدا جانے کتنی مرتبہ وہ اپنی زندگی کے ورق اُلٹ چکا تھا۔ اب اُس نے طے کر لیا کہ بس آج سے توبہ کر لوں اور باقی زندگی اس حسین مورت کو شریک حیات بنا کر گذار دوں گا۔

حسین پہاڑن کو قدرت نے اپنے فیاض ہاتھوں سے دل کھول کر حسن بخشا تھا۔ ملازمت کے بعد تو میلے کپڑوں کے بجائے سفید ساری اور ساٹن کا شلوکا پہنے تھی۔ وہ پھولوں کی روشوں کے پاس جب شام کو پھول توڑتی تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی آسمانی حور اتر آئی ہے۔

سیزن ختم ہوا۔ پورے چھ مہینہ گزر گئے۔ سو کلی شباب اوج پر تھا۔ عشق کا بھی سیزن ختم ہو چکا تھا حسین پہاڑن سے بہت سے جھوٹے سچے وعدے کر کے یہ حضرت رخصت ہو رہے تھے وہ بیچاری انہیں اسٹیشن پر پہونچانے گئی اور روتے روتے برا حال کیا۔

"کب آؤ گے تم!"

"کہہ تو رہا ہوں کہ جلد ہی سردی ختم ہوتے ہی پھر واپس آجاؤنگا اور پھر اپنے ساتھ ضرور لیجاؤنگا۔ اس وقت کچھ وہاں جائداد وغیرہ کا انتظام کرنا نہ ہوتا تو تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتا"

"تمہاری قسم ..... میری"

کیا تمہیں میرے وعدوں پر اعتبار نہیں؟ یقین کرو میں نے دنیا میں ... اپنی زندگی میں پہلی بار بس تم سے محبت کی ہے۔ تم سے جدا ہو کر میں شاید زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تم حقیقت سمجھو!

حسینہ پہاڑن کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ رؤف کیا گیا گویا اس کی دنیا میں کالا طوفان آ گیا۔ وہ سال سیزن آیا اور ختم ہوا۔ گرمی شروع ہوئی۔ پہاڑوں پر چڑھائی شروع ہو گئی۔ سب آئے لیکن رؤف نہ آیا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ اُسے اب برادری کا اور باپ کا بھی احساس باقی نہ تھا۔ وہ بالکل دیوانگی کے عالم میں روزانہ گھر سے نکل جاتی اور رؤف کا راستہ دیکھتی۔ ہر اُس پہاڑی پر جا بیٹھ جاتی جہاں رؤف اس کے ساتھ جا کر تفریح کرتا تھا۔ ہر پتھر کو وہ حسرت سے دیکھتی۔

گرمی کا سیزن ختم ہوا۔ موسم سرما نے کروٹ لی اور پہاڑی حسینہ اس انتظار میں رہی کہ رؤف کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا!!

ایک روز بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ جہاں رؤف نے عہد و پیمان کئے تھے۔ اُس میں اب ہمت باقی نہ رہی تھی۔ بخار سے جسم پھُنک رہا تھا۔ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ برف گرنے لگی۔ رات کی وحشت نے اُسے آگاہ کیا۔ لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ ایک نعرہ سا کہا اور گردن ڈھلک گئی۔ کیا رؤف تم کبھی نہ آؤ گے۔ یہ سب وعدے دھوکے ہی تھے!!"

رؤف کو یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ اُس نے کسی سے کچھ وعدہ کیا تھا۔ اُس کی نیکی کی توبہ پھر ٹوٹ گئی تھی وہ پھر اپنے نئے خیالوں میں اُلجھا ہوا پھر سے اپنی زندگی کے نئے ورق کو الٹ رہا تھا اور پرانے ورقوں کو بھلانے کی کوشش۔ اُس کا واحد مشغلہ صرف چھلکتے ہوئے جام تھے اور عیش و نشاط۔

شہری ہنگاموں سے گھبرا کر وہ کچھ دنوں کے لیے ایک گاؤں میں چلا گیا۔ وہاں دیہاتی زندگی کی سادگی کے لطف اٹھانے لگا۔ گاؤں کے سارے آدمی سلامی کے لیے آئے اور کیوں نہ آتے آخر کو تو رعیت تھی۔ سرکار کو نذرانہ بھی دیئے اور بہت سارے پھولوں کے ہار ڈالے۔

گاؤں کے کمہار آمی کی لڑکی مالتی بھی ہار لیکر آئی۔ اُس کا ہار سب سے زیادہ خوبصورت پھولوں کا تھا۔ باپ نے تاکید کی تھی کہ "سرکار کو بہت تمیز سے ہار پیش کرنا"

مالتی اس انداز سے آگے بڑھی گویا سامنے بہت بڑے دیوتا کھڑے ہیں۔ رؤف نے دیکھا کہ گاؤں کی جاہل سی کیچڑ میں ایک چاند بھی چھپ چھپ کر نکل رہا ہے۔ اُس نے اپنا سر آگے بڑھا دیا اور مالتی نے ہار گلے میں ڈال دیا۔

رؤف نے کہا: "ہار ڈالنے سے ہار ہوتی ہے"

مالتی سرکار کے اس اچھوتے مذاق پر مسکرا کر شرما گئی رؤف کا دل گاؤں میں ایسا لگا کہ جنگل کو منگل بنا دیا۔ سات مہینے اس طرح گزارے کہ گاؤں کے سب لوگ گرویدہ ہو گئے جلسے کرتا۔ گاؤں کے آدمیوں کو تمام دنیا کی باتیں بتاتا۔ کھیتی باڑی کرنے کی صفائی کی کھانے پینے کی ہدایت کرتا۔ گاؤں کے سادہ لوح آدمی اپنے سرکار کو بہت دعائیں دیتے اور روزانہ اس کے لیے سوغات لاتے۔

مالتی شروع شروع تو بہت ڈری لیکن رؤف نے نہ معلوم کتنے خوبصورت لفظوں میں اسے قول دیئے کہ رام کر ہی لیا۔

شہری محبت اور گاؤں کی محبت میں فرق ہوتا ہے۔ شہری محبت ہوا کا رخ دیکھتی ہے اور گاؤں کی محبت صرف خیالوں میں اپنا تخم دیدیتی ہے۔

بیچاری مالتی نے اپنا تن من دھن سب کچھ رؤف کے چرنوں پر نچھاور کر دیا۔ رؤف نے پھر اپنے دل میں نئی خوشی نئی اُمنگ۔ نئی روح۔ نئی دنیا۔ نئے جذبات محسوس کئے اور مالتی سے کہا۔ مالتی! میں سمجھتا ہوں کہ میں ابتک بڑی بھول میں تھا جو لطف سادہ زندگی میں ہے اور جو خلوص جاہل دلوں میں ہے وہ شہری فضا میں کہاں ۔۔۔ مجھے آج پہلی مرتبہ اپنے دل میں خوشی محسوس ہوئی اور سمجھتا ہوں کہ تم پہلی بیوی ہو جس نے میرے ہر روئے میں ہوک پیدا کر دی اب تمہارے بغیر زندگی کی نیّا پار نہیں اتر سکتی ۔۔۔ مالتی سنتی رہی اور خوش ہوتی رہی اُسے کیا معلوم تھا کہ رؤف کی محبت "موسمی محبت" ہے احساس کا وقتی تفریح ہے

گاؤں کی عورتیں بڑے زور شور سے ہر جگہ مالتی ۔ اور رؤف کے قصّے بیان کرنے لگیں۔ کھیا کا اُٹھنا بیٹھنا مصیبت ہو گیا۔ اُس نے بہتیرا حالات کو سدھارنا چاہا مالتی کو ڈانٹا کئی روز بند رکھا لیکن مالتی پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا وہ اس خیال سے خوش رہی کہ رؤف میاں کے ساتھ چلی جائیگی ۔

رؤف کا دل بھی ایسی باتیں سُن کر گھبرا گیا تھا اسے جانے کا سامان ٹھیک کر لیا۔ ٹھیک رات کے دو بجے کسی کی پرچھائیں دکھائی دی چونک پڑا "تم اس وقت کہاں؟" "میں اس لئے آئی ہوں کہ تمہارے ساتھ چلونگی؟" ۔۔۔ "میرے ساتھ؟"

"ہاں اور نہیں تو کیا" ۔۔۔ روتے ہوئے "یہاں اب میرا کون ہے تم ہی کو اپنا کہہ دیا اور سمجھ لیا"

"لیکن مالتی میں تمہیں پھر کسی دن کے ہاتھ بلوا بھیجونگا اس وقت تو گاؤں میں یونہی میرے متعلق چرچا ہو رہا ہے"

"لیکن میں تو اتنا انتظار اب نہیں کر سکونگی"

"کیوں مالتی"

مالتی نے اس کے جواب میں گردن جھکالی اور آہستہ آہستہ تمام واقعات بتائے کہ وہ حیثیت کس قدر مجنون رؤف کی وجہ سے بدنام ہے اور پھر رؤف کی محبت کی رسید یا امانت کی محافظ ہے ایسی نازک حالت میں وہ اکیلی کیا کریگی؟ آنے والی بدنامی کا کس طرح مقابلہ کریگی ۔ مالتی کا دل بھر آیا رونے لگی لیکن اسکے گرم گرم سانس اور آنسو رؤف کو متأثر نہ کر سکے ۔ سب کچھ سُنا اور جھوٹی تسلیاں دیکر اسے واپس کر دیا اور خود اطمینان سے اپنے گھر واپس آگیا۔

مالتی اس کے پاس سے اٹھی تو بہت دلگیر تھی اُسے دنیا سے نفرت ہو گئی اور تمام باتیں سوچ کے وہ آگے بڑھی اور بہتے ہوئے دریا میں گر کر ہمیشہ کے لیے بہہ گئی مٹ گئی۔ پانی نے ایک دفعہ اُسے اُچھالا پھینکا اور پھر آغوش میں لے لیا۔ پانی کی لہریں ترا گئیں۔ گاؤں میں چند روز طرح طرح کی باتیں ہو کر خاموشی چھاگئی باپ رنج کے مارے زہر کھا کر سو گیا۔ ایک ہی بچی تھی بیوی تو اسی دودھ پیتی چھوڑ کر مری تھی۔ غریب نے جوانی اس کی پرورش پر ختم کر دی۔ اس کا یہ حشر وہ نہ دیکھ سکا!!

رؤف میاں کو کبھی اس دیہاتی لڑکی کا خیال بھی کمبخت آیا اور آتا بھی کیسے جس وقت بھی انکا ضمیر انھیں ملامت کرتا یہ فوراً اسکا تدارک ساغر پر ساغر پی کر کرتے ۔۔۔ ازل سے دستور یہی بنا رکھا تھا ۔۔۔ ہر اچھی زندگی کو داغدار بنا کر خود پھر سے اپنی زندگی کا نیا صفحہ اُلٹ کر نیا حساب شروع کر دیتے۔

رؤف کسی شادی میں مہمان گئے وہاں انکو خاص طور سے آرام دہ کمرہ دیا گیا۔ یہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ شادی کا مکان تھا۔ کوئی بھولے سے کسی کام سے چلی آئی۔ یہ صاحب خانہ کی لخت جگر تھی۔ جسے یاد نہ رہا تھا کہ یہ کمرہ مہمان کو دیدیا گیا ہے۔ بہت بے تکلفی سے

پھیلا دامن اٹھانے چلی آتی۔ ایک دم نظر پڑتے ہی وہ سہم جاتی۔
رؤف کہتے ہی رہ گئے معاف کیجئے! اِدھر جا رہا ہوں آپ جو
چاہیں تو اٹھا سکتی ہیں۔ لیکن وہ پوش کر بھی نہ رک سکی۔ دیر
تک وہ یہی سوچتی رہی۔ اسے جانے اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے
— توبہ ہے میری بھول پر — سُنا ہے ان کا ذکر خاندان
میں لوگ اچھے لفظوں میں نہیں کرتے۔ — ہوگا — مجھے کیا
بات آئی گئی برابر ہو گئی۔ رؤف دیکھ چکے تھے کہ سر سے پاؤں
تک وہ لڑکی حسن کا مکمل نمونہ تھی۔ باتوں باتوں میں اس کے
چھوٹے بھائی سے اور کھیل کھیل میں نام اور لکھنے پڑھنے کی
باتیں پوچھ لیں تھیں — اب صرف یہ سوچ رہے تھے کہ کیونکر
حاصل کروں؟

گھر آتے ہی اس کے باپ کو ایک نظم خط لکھا۔ بیوی کے مرنے کے
بعد کے واقعات کہ کس طرح اسے تکلیف ملتی رہی اور گھر کے قیمتی سامان
برباد ہو گئے — روپیہ پیسہ کوئی دیکھنے والا نہیں باتیں بنانے والے تو
ہزار ہیں لیکن میری حالت سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ میں اس کے لیے
بھی تیار ہوں کہ معقول روپیہ جائداد مجھ سے لکھوا لی جائے" نہیں
نہیں کرتے ہوئے بھی لڑکی والوں نے دولت کی لالچ میں آکر شادی
کر ہی دی۔ — سب بھول گئے کہ یہ وہی رؤف صاحب ہیں جن کی عیاشی
کے افسانے دور دور تک زبان زد تھے!

آج رؤف نے پھر سے توبہ از سرِ نو کر لی تھی — اور دل میں
عہد کیا کہ اب آئندہ واقعی پاکبازی کی زندگی گذاریگا — اب
بیچارہ توبہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ عمر کا تقاضا تھا — پچاس کے لگ بھگ
پہونچ چکا تھا تاہم دیکھنے میں وہ اتنا حسین اور کم عمر معلوم ہوتا کہ
مشکل سے کوئی اُسے پینتیس کا بتاتا۔ نئی بیوی فردوس جس نے
خیر سے ابھی زندگی کی بیسویں بہار میں قدم ہی رکھا تھا۔ اگرچہ
رؤف اس کا ہر طرح خیال رکھتا اور سب کچھ حاضر کرتا لیکن وہ کچھ عجیب
سی ہو کر رہ گئی تھی۔ نوکر چاکر عیش و آرام۔ دولت شان و شوکت موٹر
وغیرہ ہر چیز تھی لیکن خوشی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی چیز کھو گئی
یا دنہ رہی! —

یہ نفسیاتی اصول ہے کہ اگر انسان فطرتی حساس ہو اور ضرورت سے زیادہ سمجھدار
تو اسے گذشتہ باتیں سکھ نہیں دے سکتیں۔ رؤف نے سمجھا کہ
شاید یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہے اس نے عہدِ گذشتہ کی رنگین
شامیں عیش و نشاط کی راتیں — دوسری حسین عورتوں کی محبت
بھری باتیں سب کچھ سنا کر موجودہ خیال نہایت پاک صاف ظاہر
کیا لیکن فردوس کے دل میں میل بیٹھ گیا۔ وہ اسے بہت ذلیل سمجھتی
اور بات بات میں کہہ اٹھتی خدا غارت کرے ان ماں باپ کو جنہوں
نے دولت دیکھی پر خصلت نہ دیکھی — عزت نہ دیکھی!

مہینوں کیا سال گذر جاتے لیکن فردوس سیدھے منہ بات
بھی نہ کرتی اس کی نظروں میں کوئی وقعت ہی نہ تھی

رؤف اب اس عالم میں پہونچ چکے تھے جہاں توبہ بھی توبہ
کرتی ہے گذشتہ زندگی کا افسوس — بیوی کی بے رخی —
دولت کی کمی صحت کا رخصت ہونا۔ یہ سب باتیں سوہانِ روح
بن گئی تھیں۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ رؤف کبھی بڈھا نہ ہوگا
اور اس کی صحت تھی بھی ایسی لیکن شراب کی زیادتی نے پھیپھڑوں
پر اثر کیا اور وہ چند روز کے بخار میں ریت کی دیوار کی مانند گر گیا

اب اس کی بیکسی کی نوبت یہاں تک پہونچ چکی تھی
بخار چڑھا ہوا — باہر دالان میں لیٹا اللہ اللہ کر رہا ہے
دوست احباب مزاج پرسی کو آ جا رہے ہیں۔ بیوی بھی بیوی
کی حیثیت میں خدمت کر دیتی ہے۔ لیکن رؤف کی تکلیف میں
کمی نہیں ہوتی جہاں ذرا سانس لیا اور آرام سے لیٹا۔ نیند یا

غنودگی میں ہوئی اور چونکا خواب میں اُسے گذشتہ صورتیں چین نہیں دیتیں۔ نیک بیوی کے مرنے کے بعد اُسے بھول جانا۔ پھر وہ مختلف حسین لڑکیوں سے شادی کے وعدہ کر کے بھول جانا۔ دولت کے چند کھوٹے سکوں سے غریب گاؤں کی لڑکیوں کو تباہ و تاراج کرنا۔ ہر توبہ کے بعد پھر وہی باتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رؤف کا رُواں رُواں کانپ رہا ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا لیکن موت اُس سے قریب ہوتی چلی آ رہی تھی!!

کبھی کبھی چیخیں مار کر رونے لگتا۔ ضمیر کی ملامت اُسے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تھی۔

فردوس کو بُلایا اور کہا "مجرم ہوں سچا پاپی ہوں توبہ شکن ہوں۔ دنیا میں بہت سی زندگیوں کی اپنی ناپاک زندگی پر کرنے کے عہد تھیں بھی اپنے پر قربان کیا۔ شباب کیا تھا ایک سیلاب تھا جس میں بہتا چلا گیا۔ . . . . . بہتا چلا گیا۔ ایسا ڈوبا بہا کر پھر نہ اُبھرا — توبہ پہ توبہ کی لیکن ہر بار ٹوٹ گئی۔ افسوس یہ ہے کہ تمھیں خوش نہ رکھ سکا — تمھارے جذبات کی قدر مجھ سے نہ ہو سکی — میں اپنی عمر ختم کر چکا — تم نے اب شروع کی ہے — احسان ہو گا بیگم! مرتے وقت معاف کر دو — بخش دو"

فردوس آخر کو تو ہندوستانی بیوی تھی لاکھ بیزار سہی لیکن رؤف کے لفظوں نے دل کو ہلا دیا۔ رو پڑی اور کہا "میں نے معاف کیا۔ میرا خدا معاف کرے رؤف — تم بھی میرا کہا سُنا معاف کرنا!!"

رؤف نے جھکتے ہوئے فردوس کا ہاتھ آنکھوں سے لگا لیا!!

"دفعتاً رؤف کا سانس بگڑا اور کچھ گھبرا کر بے ربط فقرے بولنے لگا "میں توبہ کرتا ہوں ہاں . . . . . ہاں آج سے بس توبہ — اب سامنے سے ہٹ جاؤ — دیکھو یہ خوفناک شکلیں کیسی ہیں . . . . مجھ کمزور سے انتقام نہ لو — بدلہ نہ لو — نہیں نہیں کون کہتا ہے — ہرگز نہیں — میں نے اُس کا خون کیا؟ . . . میں نہیں تھا — میں نے دھوکے دیئے؟ نہیں غلط ہے۔ میں نے فریب بھی . . . نہیں مجھے معاف ہی کر دو — یہ لاکھوں فریادی کہاں سے آ گئے! میں کہاں تک دیکھوں — دیکھو — بس — انسان ہوں — مجھے نہ ڈراؤ — سامنے سے ہٹ جاؤ — معاف — توبہ کرتا ہوں . . . . . توبہ!" یہ کہتے کہتے آنکھیں بند ہو گئیں!!

خاک کا پُتلا خاک میں مل گیا — جس نے بے شمار جام ہونٹوں کو لگائے تھے آج اُس کی توبہ مستقل ہو گئی — جس نے خدا جانے کتنے دھوکے دیئے تھے آج اُسے موت نے دھوکا دیا!!

جس نے دوسروں کو رُلایا تھا آج احساس نے اُسے رُلا رُلا موت کی آغوش میں سُلا دیا!!

کوٹھی وہی تھی۔ دولت وہی تھی — بیوی سامنے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے جو آخری پونجی یا بڑھاپے کی یادگار چھوڑے تھے — کمزور پودا بغیر مالی کے رہ گئی —

جسدِ خاکی خاموش تھا۔ دونوں ہاتھ سینہ پر اِس انداز سے رکھے رہ گئے گویا توبہ کے لیے آگے بڑھ رہے تھے

چہرے پر غرور ختم ہو کر انکسار باقی رہ گیا تھا۔ موت نے عہد شکنی۔ توبہ شکنی کا قصہ ختم کر دیا!!

افسانہ نمبر بطور نمونہ نہیں بھیجا جا سکتا۔ افسانہ نمبر کے لئے ۲۰؍ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

حسنِ اتفاق

خالد حسین قادری آگرہ

رات کا وقت تھا۔ سردیوں کی طویل راتیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شہر میں سنسان تھیں آخری تاریخوں کا چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ اس کی پیلی پیلی کرنیں تاریکی سے مسلسل جنگ کر رہی تھیں سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم بیٹھے تھے — مگر وہ اپنے مردہ لڑکے پر جھکی ہوئی رو رہی تھی — کیسا دردناک تھا وہ سین۔ اس کی پہلی اولاد، دل کا سرور، اکلوتا بچہ آہ مردہ پڑا تھا — ڈاکٹر اپنے دواخانہ میں دونوں ہاتھوں سے ماتھا تھامے میز پر کہنیاں ٹکائے جھکا ہوا بیٹھا تھا غم سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا —۔ اس کے چمنستانِ حیات کا پہلا پھول کھلا تھا لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے یوں توڑ لیا۔ جیسے بے رحم گلچیں ڈالی سے پھول۔ ڈاکٹر نے ایک لمبی سرد آہ بھر کر اپنی ہتھیلی گال پر رکھ لی۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ برابر کے کمرے سے مسلسل سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

آہ۔ اس کا گلشن حیات پامال ہو چکا تھا۔

یکایک ہال میں زور سے گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر ایک دم چونک پڑا۔ گھنٹی پھر بجی۔ ڈاکٹر آنسو خشک کرتا لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں آیا۔ ہال میں تاریکی تھی اور موت کا سکوت —

سفید گول منہ اور زرد چہرہ صرف اندھیرے میں وہ اتنا دیکھ سکا۔

"آداب عرض۔ ہے ڈاکٹر صاحب" اجنبی نے سلام کے بعد اندھیرے میں ہاتھ ملانے کے لیے بڑھایا "شاید آپ مجھے پہچانتے نہ ہوں" اجنبی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میں سخت ضرورت سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔

وہ سخت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھکے ہوئے کتے کی طرح وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

"کیا کام ہے" ڈاکٹر نے افسردہ لہجے میں دریافت کیا

"ڈاکٹر صاحب میری بیوی سخت بیمار ہے اُسے شدید دورہ ہوا ہے"۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا اس کا باپ بھی اسی دورہ میں مرا تھا"

ذرا چل کر دیکھ لیجیے آپ کی مہربانی ہوگی ..... وہ مر رہی ہے" اجنبی کی آواز میں سوز تھا اور لہجہ موثر تھا اس کا ایک ایک لفظ ڈاکٹر کے دل میں اتر رہا تھا۔

"آہ! ہم دونوں بدقسمت ہیں" ڈاکٹر نے سانس لیکر کہا "میرا پیارا اکلوتا بچہ ابھی مرا ہے" ڈاکٹر نے بیقرار سے گلتے ہوئے کہا۔ بھائی میری دلی ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ مگر افسوس..... میں مجبور ہوں۔ اپنے پیارے بچے کی لاش جس کو میں نے زندگی بھر اکیلا نہیں چھوڑا یوں کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں"

"ڈاکٹر یہ سب درست ہے مگر میری قلبی کیفیت کا اندازہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ ذرا تھوڑی دیر کے لیے چلئے آپ جلد ہی واپس آجائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب وہ مر رہی ہے۔ دیکھئے ایک مر چکا ہے اور دوسرا مر رہا ہے" اجنبی کے لہجے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔

"تم مجھے مجبور کر رہے ہو" ڈاکٹر یہ کہتا ہوا ہال سے کرہ میں آگیا۔

بچے کی لاش پر اُس کی ماں اسی طرح سسکیاں لے رہی تھی۔ آہ ۔۔ اس کی زندگی بھر کی کمائی یوں لٹ چکی تھی سرہانے موم بتی جل رہی تھی۔ دم بدم پروانے آرہے تھے اور جل جل کر ختم ہو رہے تھے موم بتی بھی اس کے فراق میں آنسو بہا رہی تھی ۔۔ آہ ہماری زندگی موم بتی کی طرح ہے جو برابر گھلتی جاتی ہے مگر پتہ نہیں چلتا۔

پچھلے تمام واقعات ایک ایک کرکے ڈاکٹر کے دماغ میں آرہے تھے ۔۔ وہ جوانی کی امنگیں، ولولے، شادی خدا نے انہیں جوانی ہی میں ایک بچہ دیا۔ اس کی معصوم شرارتیں آہ سب غایب ۔۔ اس کی عمر ۴۵ برس کی ہو چکی تھی اس کی بیوی ۳۵ سال کی ۔۔ اس کی پہلی اولاد ۔۔ اور شاید آخری اولاد ۔۔ اب بڑھاپے میں کیا امید تھی کہ اولاد ہو "میری پہلی اور آخری اولاد" یہ خیال آتے ہی ڈاکٹر پاگل سا ہو گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے وہ دیوار کا سہارا لیتا ہوا برابر کے کمرے میں آگیا۔ یہ اس کے بچے کا کمرہ تھا اس کی اسکول کی کتابیں "کتاب دان" کے سہارے کھڑی تھیں۔ سامنے کھونٹی پر اس کا نیا سوٹ لٹک رہا تھا اس نے کس قدر شوق سے اسے بنوایا تھا۔ ابھی وہ صرف ایک ہی بار پہن پایا تھا۔ کونے میں اس کی ہوائی بندوق رکھی تھی ہر اتوار کو وہ شکار کھیلنے جایا کرتا تھا ۔۔ آہ مگر آج وہ خود موت کا شکار ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نیم پاگل ہو رہا تھا۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے وہ ہال کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ کوئی ہال میں اس کا منتظر ہے۔

اجنبی نے مایوس ہو کر پھر گھنٹی بجائی ڈاکٹر ایک دم پلٹا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑے وہ پھر اجنبی کے پاس پہنچا۔

"بھائی میں تم سے کہہ چکا میں نہیں جا سکتا" ڈاکٹر نے کواڑے لگتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر میں سمجھتا تھا آپ کپڑے پہننے گئے ہیں۔ وہ مر رہی ہے۔ میں یہاں ہوں مگر اس کی چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اچھے ڈاکٹر جلدی چلو" اجنبی نے ڈاکٹر کے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرے پاس گھوڑا گاڑی ہے تم بہت جلد یہاں واپس آجاؤ گے۔ خدا کے لیے ڈاکٹر جلدی کرو"

"تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ میری بیوی اکیلی ہے ۔۔ بھائی میں ہرگز نہیں جا سکتا" ڈاکٹر نے کہا"

"ڈاکٹر مجھے مایوس نہ کرو۔ یہاں آس پاس کوئی اور ڈاکٹر بھی نہیں ہے ورنہ میں تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ جلدی کرو۔

ڈاکٹر اجنبی کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو گیا۔ اجنبی کی آواز میں ایسی کشش تھی کہ وہ یہ بھول گیا کہ اس کا بچہ مردہ اور اس کی بیوی اکیلی ہے۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ اور آلہ اٹھایا اور اجنبی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چلنے لگی مگر وہ اپنے خیالات میں ایسا مستغرق تھا کہ اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔ چاروں طرف رات

کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ستارے ہر ہر قدم پر امید کی طرح چمک کر چھپ جاتے تھے۔ گاڑی ایک پل پر سے گذر رہی تھی۔ پانی کا شور گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے مل کر دہشتناک آواز پیدا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اس آواز سے یکایک چونک پڑا جیسے معصوم بچے کسی بڑے خواب کو دیکھ کر چونک پڑتے ہیں۔

"گاڑی روکو میری بیوی اکیلی ہے" وہ ایک دم چلایا "ٹھہرو میں یہاں سے کسی کو اس کے پاس بھیج دوں"

گاڑی والے نے گاڑی کو اور تیز کر دیا۔ ڈاکٹر پھر گہری فکر میں کھو گیا۔

"کیسی تاریک رات ہے" اجنبی نے کہا"

ڈاکٹر نے آہ بھر کر کہا "ہمارے نصیب کی طرح"

وہ سوچنے لگا ۔۔۔ وہ بالکل اکیلی ہے جس کو میں نے عمر بھر پل بھر کے لیے آنکھوں سے جدا نہ کیا آج وہ بالکل اکیلی ہے۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے اکیلا رہیگا ۔۔۔ میں یہاں ہوں وہ نہ جانے کیسی ہوگی۔ میں کیوں چلا آیا۔ اس کو اکیلا چھوڑ کر چلا آنا نہ تھا ابھی سب کچھ باقی ہے۔ کسی کو بھیج دیتا یہاں سے وہ اکیلی ہوگی ۔۔۔ ڈر سے گی تو نہیں ۔۔۔ مجھے یہاں آنا ہی نہ چاہیے تھا۔ مگر نہیں ہمدردی شرافت انسانیت اور رحم دلی ڈاکٹر کے فرائض ہیں۔

اجنبی سوچ رہا تھا ۔۔۔ اف معبود! اب وہ کیسی ہوگی آہ یہ شدید درد سے جان لیوا۔ اور یہ بیماری ہمارے دس سالہ تعلقات کو منقطع کر دیگی ۔۔۔ اے معبود رحم رحم ہمارے چمنستان محبت کو پامال نہ کر ۔۔۔ اپنی رحمت سے اس گلستان کی آبیاری کر ۔۔۔ اگر وہ خدانخواستہ مر گئی ۔۔۔ تو ۔۔۔ تو ۔۔۔ میں کہیں کا نہ رہونگا۔ خلاق عالم اگر بلاتا تو دونوں کو ایک ساتھ بلاتا ۔۔۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ سامنے کی کھڑکیوں میں سے روشنی کی زرد زرد کرنیں باہر آ رہی تھیں۔ تمام میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور اجنبی کمرے میں پہنچے ۔۔۔ کمرہ میں دہشت برس رہی تھی۔ اور موت کا سا سناٹا۔ اجنبی نے اندر قدم رکھتے ہی زور دار چیخ ماری "آہ اب اسے ہمیشہ کے لیے سکون ہو گیا۔ اجنبی لڑکھڑا کر قریب صوفہ پر گر پڑا۔

ڈاکٹر نے جھک کر مریضہ کے چہرہ کو دیکھا۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ خد و خال کی دلکشی پر موت فریفتہ ہو چکی تھی۔ کمرہ میں ہر چیز پر موت اپنا پورا تسلط جما چکی تھی۔ ڈاکٹر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب" اجنبی نے مایوسانہ انداز سے پوچھا "اب ہماری اور تمہاری حالت بالکل یکساں ہو گئی وہ ۔۔۔ وہ تو ۔۔۔" ڈاکٹر کے حلق میں آواز پھنس کر رہ گئی۔

(۲)

ریل گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ سامنے کھڑکی سے دلچسپ مناظر نظر آ رہے تھے۔ سورج کی آتش بار شعاعیں پانی کی پرشور لہروں کو چمکا رہی تھیں ۔۔۔ دور سبزہ زاروں میں گائیں چر رہی تھیں آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی کرتی جاتی تھیں۔ چرواہا اپنی دھن میں مست بانسری پر ایک دلکش راگ الاپ رہا تھا۔ ڈاکٹر اپنے مخصوص درجہ میں بیٹھا ہوا یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ درجہ کا دروازہ یکایک کھلا اور ایک جوان جوڑا داخل ہوا۔

"معاف فرمائیے گا وقت ذرا سا تھا اور کہیں بھی جگہ نہ ملی

اگلے اسٹیشن پر میں دوسرے درجہ میں چلا جاؤں گا" نووارد نے رومال سے پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے کھڑکی سے منہ پھیرتے ہوئے کہا "کچھ مضائقہ نہیں آپ تشریف رکھئے"

نووارد ڈاکٹر کی صورت دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

"ارے تم کہاں" ڈاکٹر کے منھ سے یکبارگی نکلا۔

نووارد وہی اجنبی تھا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ اجنبی ڈاکٹر کے پاس بیٹھ گیا۔ عورت دوسری سیٹ پر جہاں ایک بچہ اور بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹھ گئی۔

تمھارے ساتھ یہ کون ہیں" ڈاکٹر نے پوچھا

"یہ ــــ یہ" اجنبی نے رُکتے ہوئے شرمیلے لہجہ میں کہا "آپ کی بھاوج"

"واقعی" ڈاکٹر نے حیرت و استعجاب سے پوچھا۔

"یہ بچہ کس کا ہے" اجنبی نے پوچھا

"تمھارا بھتیجہ" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اجنبی کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں

"میاں آؤ بیٹے" ڈاکٹر نے بچے کو پیار سے بلایا

"انھیں سلام کرو۔ دیکھو یہ تمھارے چچا ہیں"

یادِ ماضی

ستارے جب بساطِ چرخ سے روپوش ہوتے ہیں ۔ نسیم صبح سے غنچے جب ہم آغوش ہوتے ہیں

شرابی کی طرح سے جب حسیں مدہوش ہوتے ہیں ۔ دل پرغم کے نالے جب اذیت کوش ہوتے ہیں

تو اک پُرکیف سی شے آکے دل گُدگُداتی ہے

نکل پڑتے ہیں آنسو جب تمھاری یاد آتی ہے

پوری نظم افسانہ نمبر میں پڑھیئے

سوز شاہجہانپوری

اضطراب عالم

عشرت علی۔ صدیقی

یورپ کی لڑائی اب مغربی محاذ تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اس کے اثرات ساری دنیا پر چھا گئے ہیں۔ کوئی ملک اپنی مرضی سے اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے اس میں شریک ہے اور کوئی اپنے آقا کی مرضی سے ٹھونس دیا گیا ہے کچھ ملک ایسے بھی ہیں جو بظاہر یوں کہئے کہ جس حد تک ممکن ہے اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں مگر جنگ کے زہریلے چھینٹے کم و بیش ہر ایک کے دامن پر پڑ چکے ہیں گو روس غیر جانبدار رہے لیکن اپنی حفاظت کے لیے اس نے پولینڈ فن لینڈ، رومانیہ اور بالٹک اور بلقان کی ریاستوں پر ہاتھ صاف کیا۔ ترکی لڑائی سے الگ ہے لیکن درہ دانیال کے اردگرد کے علاقہ میں اس نے بھی مارشل لا نافذ کر دیا ہے۔ غرضکہ آج کی دنیا بڑی حد تک ایک ایسے انسان سے مشابہ ہے جس کے بدن میں زہریلا مادہ پیدا ہو گیا ہو اور علاج معالجہ کی طرف سے لاپرواہی برتنے کی وجہ سے اب یہ حالت ہو گئی ہو کہ کبھی ہاتھوں میں پھوڑا بن کر پھوٹ نکلے کبھی ٹانگوں میں زخم کر دے کبھی پیٹھ میں سرطان بن کر ابل پڑے اور کبھی آکلہ بن کر انسان کی موت کا باعث بنا ہے۔

اضطراب کی کسی پچھلی اشاعت میں میں نے جنگ کے بنیادی اسباب پر ایک اچٹتی نظر ڈالی تھی۔ یہاں اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں مقصود ہے بلکہ بتانا صرف یہ ہے کہ پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے عالمگیر امن کے نام نہاد علمبرداروں کی عادتیں اس درجہ خراب ہو گئیں اور وہ ایسی علتوں کا شکار ہو گئے کہ بین الاقوامی سیاست میں زہریلا مادہ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے معالجوں کی لیپیں نہ پھاہے بنا سکیں نہ مرہم پٹیاں اور یہ مادہ بڑھتے بڑھتے اس نوبت کو پہونچ گیا کہ دوسری عالمگیر جنگ کی شکل میں پھوٹ نکلا اور ابھی تک بہہ رہا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ہوا کو کوئی چھیچھڑا چپس کر اس کے تسلسل کو روک دیتا ہے۔ لیکن گھاؤ پھر کھل جاتا ہے اور اگر نہ کھلا تو مادہ دوسری جگہ توڑ کر اپنی راہ نکال لیتا ہے پولینڈ کی لڑائی۔ فن لینڈ اور روس کی ٹکر۔ ہالینڈ اور ناروے پر جرمنی کے حملے۔ فرانس کا مورچہ۔ انگلستان اور جرمنی میں بمباری کا مقابلہ۔ پھر افریقہ میں چھوٹے چھوٹے بہت سے مورچے بلقان کی کشمکش اور دفعتاً یونان پر اٹلی کا حملہ — ان سب واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ تشبیہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

سردی کا موسم آجانے سے یورپ کی لڑائی کسی قدر ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ افریقہ میں بھی برطانی سمالی لینڈ کے خاتمہ کے بعد سے کوئی خاص مورچہ نہیں ہوا تھا۔ ۲۸ر اکتوبر کو یونان پر اٹلی کے اچانک حملے نے یہ جمود توڑ دیا۔

اٹلی ایک عرصہ سے یونان پر دانت لگائے ہوئے تھا اس لئے کہ بحر روم پر اس کا قبضہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ یونان کا ساحل اس کے اثر میں نہ آجائے۔ اس کے علاوہ وہ سوئز پر بھی نظر جمائے تھا بلکہ ایک

عرصہ سے خشکی کے راستہ سے اس طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اس محاذ پر اٹلی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی اور جرمنی بھی کہر اور برفباری کی وجہ سے خاموش تھا۔ باہمی مشورہ سے طے پاگیا کہ بحروم روم کو لڑائی کا مرکز بنادیا جائے۔ چنانچہ اٹلی نے حکومت یونان کو الٹی میٹم دیدیا کہ وہ اپنی زمین پر اٹلی کو فوجی اڈے بنانے کا حق دیدے ورنہ تین گھنٹہ کے اندر اندر اطالوی فوجیں دھاوا کردیں گی یونانی حکومت نے کچھ تو اپنے قومی وقار کے پاس سے اور کچھ برطانیہ اور ٹرکی کی مدد کا بھروسہ کرکے اٹلی کا مطالبہ رد کردیا اور جنگ شروع ہوگئی۔ یونان کی جو اہمیت اٹلی کے لئے ہے وہی برطانیہ کے لئے ہے۔ اسی لئے برطانیہ نے کسی قدر توقف کے بعد یونان کو کمک بھیج دی۔

یونان اور اٹلی کی لڑائی کو ایک مہینہ ہوگیا ہے۔ اس عرصہ میں عجیب عجیب خبریں آتی رہی ہیں۔ جن میں سے تازہ ترین یہ ہے کہ اب یونان کی سرزمین پر کوئی اطالوی سپاہی نہیں رہ گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یونانیوں نے بڑھ کر البانیہ کے بعض مقامات پر قبضہ کرلیا ہے۔ یونانیوں کے طبعی حالات کو دیکھتے ہوئے یہ تو یقینی ہے کہ اٹلی کو یہاں کافی دقتیں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ آگے بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ پیر سنگی پہاڑیاں اور کیچڑ سے بھری وادیاں ہیں جنہیں اٹلی کے ٹینکوں اور بھاری توپوں کا گذر نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی بات ہے کہ یونان والے اپنے قومی وقار کی حفاظت کے لیے لڑ رہے ہیں اور لڑائی میں اپنی جانوں کی بازی لگائے ہیں لہذا اٹلی کی ہار کچھ عجیب بات نہیں یونان کے دشوار گذار راستے اس موسم میں بالکل ہی ناقابل گذر ہوگئے ہیں البتہ موسم بدلنے پر اٹلی ایک دفعہ پھر پورے زور سے حملہ کرے گا۔

پھر بھی یونان کی خبروں سے ہمیں پولینڈ اور فن لینڈ کی لڑائیوں کی خبریں یاد آتی ہیں جن میں ایک عرصہ تک برابر یہی ظاہر کیا جاتا رہا کہ پولینڈ میں جرمنی ہار رہا ہے اور فن لینڈ کی فوجوں نے آگے بڑھ کر روس کے علاقے چھین لئے ہیں پھر ایک دم سے معلوم ہوا کہ پولینڈ میں جرمنی جیت گیا۔ اور فن لینڈ نے روس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے

جنگ نے یونان تک پہنچ کر مشرق قریب کو بھی بے چین کردیا ہے۔ فلسطین اور شام کے ہوائی اور سمندری اڈے۔ عراق کا تیل اور ترکی کے ساحلی مقامات جنگی اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ جرمنی اور اٹلی ادھر متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ملک ابھی تک برطانیہ کے اثر میں ہیں اور جگہ جگہ برطانی فوجیں مقیم ہیں اس لیے اس طرف اگر لڑائی شروع ہوئی تو بہت سخت مقابلہ ہوگا۔ سردست یونان کی لڑائی کا سب سے زیادہ اثر ترکی پر پڑ رہا ہے اور ترکی کے ارباب حل وعقد کے عندیہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا جھکاؤ برطانیہ کی طرف ہے ظاہر ہے کہ جرمنی اسے برداشت نہیں کرسکتا لیکن روس نے اسے روک رکھا ہے ترکی اور روس کی دوستی سے ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ نہ برطانیہ ترکی کو دبا سکتا ہے اور نہ جرمنی اس کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کرسکتا ہے دونوں کو اندیشہ ہے کہ اگر ترکی پر حملہ ہوا تو روس بھی جنگ میں کود پڑے گا۔

روسی وزیر اعظم موسیو مولوٹاف کا اپنے قبیل اہلکاروں سمیت برلن جانا اور ہر ہٹلر اور ان کے مشیروں سے تبادلہ خیال

کرنا سیاسی اعتبار سے یورپ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس وقت جرمنی کے سامنے دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں برطانیہ کے کہنے میں آکر ترکی یونان میں مداخلت نہ کر بیٹھے اور دوسرے یہ کہ خود امریکہ میں روزولٹ کے تیسری بار صدر منتخب ہو جانے سے برطانیہ کو وہاں سے دن بدن زیادہ سے زیادہ مدد ملتی رہتی ہے جرمنی اس کے مقابلہ میں روس سے سامان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ۱۲ نومبر سے ۱۴ نومبر تک برلن میں جو ڈھونگ رچایا اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ روس کی مدد سے یہ دونوں مشکلیں آسان کرلے۔ ایک طرف تو ترکی پر روس سے دباؤ ڈلوا کر اسے برطانیہ سے منحرف کر دے اور دوسری طرف روس سے سامان جنگ اور کچھ مال حاصل کرکے اپنی اقتصادی حالت مضبوط کرلے۔ اگر روس پوری طرح جرمنی کے ساتھ آجائے تو جرمنی کو ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ پورے یورپ کو اپنے اثر میں لے آئیگا اور بغیر لڑائی کو آخر حد تک پہنچائے اپنا مقصد حاصل کرلے گا۔

مولوٹاف اپنے ساتھ ماہرین کا جو لاؤ لشکر لائے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جرمنی اور روس کی بات چیت کافی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن اس تاریخی ملاقات کے نتائج پر دونوں طرف جو خاموشی ہے اس سے تو شبہہ ہوتا ہے کہ جرمنی روس کو موہ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ غالباً اسی لیے اب ہٹلر نے اپنے وزیر خارجہ ربن تراپ کی مدد سے وانا میں ایک دوسرا جال بچھایا ہے اور یورپ کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو جرمنی اٹلی اور جاپان کے معاہدے میں شرکت کے فائدے اور مستقل امن کے سبز باغ دکھا دکھا کر محور کی طرفداری پر آمادہ کر رہا ہے۔ ہنگری رومانیہ اور سلواکیہ اس جال میں پھنس چکے ہیں اور خبر ہے کہ بلغاریہ کے بھی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ جرمنی جا رہے ہیں۔

یورپ کی اس پیچ در پیچ سیاست سے ہٹ کر نگاہ مشرق بعید پر پڑتی ہے یہاں جاپان ادھم مچائے ہوئے ہے چین میں تین برس کی مسلسل لڑائی کے بعد بھی اتنی سکت ہے کہ وہ جاپان کو نہ صرف روکے ہوئے ہے بلکہ اس سے مفتوحہ علاقے بھی ایک ایک کر کے چھینے رہا ہے جاپان نے غالباً چین کو ناقابل تسخیر سمجھ کر ہی اب جنوب کا رخ کیا ہے انڈو چین پر اس کا قبضہ ہو گیا لیکن سیام میں ابھی لڑائی ہو رہی ہے ہینان اور جنوبی انڈو چین میں جاپانی فوجوں کی نقل و حرکت جاری ہے اور ڈر ہے کہ کہیں اس کا نشانہ آئندہ کا دھاوا جزائر شرق الہند پر نہ ہو جائے اس جوار میں سنگاپور واقع ہے جہاں برطانیہ کا بہت زبردست سمندری اڈا ہے اور اسے جاپان کے مقابلہ میں امریکہ سے بھی مدد کی امید ہے اگرچہ جزائر فلپائن میں منیلا کے مقام پر امریکہ کا سمندری اڈا ہے لیکن وہ جاپان کو روکنے کے لیے ناکافی ہے البتہ سنگاپور مل امریکہ کیساتھ مل کر جاپان کے مقابلہ میں ایک اچھی خاصی طاقت کھڑی کر دیگا۔

نسیم سندیلوی بی اے آنرز ایڈیٹر اینڈ پبلشر نے شاہی پریس میں چھپوا کر جاپلنگ روڈ دفتر اضطراب لکھنؤ سے شائع کیا